وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

اور جو تم کو رسولؐ دیں لے لو اور جس چیز سے تم کو روک دیں رک جاؤ۔

مرآۃ الانوار

شرح اردو

مشکوۃ الآثار

جزء ثالث

مؤلف

سید الملت العلامۃ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی

شارح

حضرت مولانا نسیم احمد صاحب غازی مظاہری بجنوری دامت برکاتہم

ناشر

ناظم مکتبہ نسیمیہ سرائے پختہ مراد آباد (یوپی)

(کاتبہ محمد یوسف قاسمی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دو باتیں

اَلْحَمْدُ لِاَهْلِهٖ وَالصَّلٰوةُ لِاَهْلِهَا. اَمَّا بَعْدُ!

(۱) شروع میں یہ اندازہ نہ تھا کہ "مِرْاٰةُ الْاَنْوَار شرح اردو مِشْكٰوةُ الْاٰثَار" کو تین جلدوں میں تقسیم کرنا پڑیگا۔ لیکن چند نصوص کی شرح لکھنے کے بعد اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ہوا، ادھر اتنی ضخیم کتاب کی کتابت وطباعت کے مصارف قابو سے باہر تھے۔ اسلئے صرف (۱۱۲) نصوص کی شرح کو جزءِ اول قرار دیکر بیتھو پر شائع کرا دیا گیا۔ اور باقی حصہ کو غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا، مگر ہوتا ہے وہی جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اہلِ علم کے ہاتھوں میں یہ مطبوعہ حصہ پہونچا تو انہوں نے توقع سے زائد اسکی پذیرائی کی اور مراسلات کے ذریعہ نیز زبانی اس کی ضرورت کا اظہار اور تکمیل پر بار بار اصرار فرمایا۔ اس لئے درسی تفسیر پ۲۹ وپ۳۰ کے مراحل کتابت وطباعت سے فراغت کے بعد "مرآۃ الانوار" کو مکمل کرنے کا عزم کرکے پھر کام شروع کر دیا گیا۔ اولاً جزءِ اول پر نظرِ ثانی اور قدرے اختصار کرکے جزءِ ثانی کی طرف توجہ کی گئی۔ بحمد اللہ تعالیٰ (۳۵۵) نصوص کی شرح پر دونوں جزؤں کی تکمیل ہو چکی تو اب زیرِ نظر جزءِ ثالث کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذاتِ عالی سے پوری اُمید ہے کہ جس طرح انہوں نے اس بے بضاعت حقیر سراپا تقصیر کو اس عظیم الشان خدمت کی توفیق واستطاعت بخشی وہ اس کو قبولیتِ تامہ ومقبولیتِ خاصہ وعامہ سے بھی نوازیں گے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

(۲) ہم نے جزءِ اول کی بہ نسبت جزءِ ثانی میں کافی حد تک اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ اب اس جزءِ ثالث میں عنواناتِ لغات وترکیب میں خصوصاً مزید اختصار ہوگا۔ کیونکہ گذشتہ حلِ لغات وبیانِ ترکیبات کے بعد چنداں ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم ضرورت کے مواقع کو نظر انداز نہ کیا جائیگا۔ اور جس کو سابقہ بیانات سے روشنی نہ مل سکی اس کے لئے آئندہ بھی بصیرت وروشنی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسلئے ایسے لوگوں کی خاطر طوالت بے سُود ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل وکرم سے ہماری مساعی کو قبول فرماکر دارین میں مثمرِ ثمرات وباعثِ برکات بنائیں۔ اور اُمتِ مسلمہ کے علماء، طلبہ اور عوام وخواص کو اس کتاب کے ذریعہ زائد سے زائد مستفید ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ۔

العبد

نسیم احمد غازی مظاہری۔ سرائے ترین۔ مراد آباد (یوپی)

۹ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ م ۱۱ اگست ۱۹۸۹ء۔ روز جمعہ۔

فہرست مضامین آخرمیں ملاحظہ فرمائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

الاثم ما ھو؟

گناہ کیا ہے؟

اِثم گناہ ذَنْب بھی گناہ کے معنیٰ میں آتا ہے۔ ان دونوں لفظوں کا اطلاق عموماً اُن گناہوں پر آتا ہے جو قصداً ہوں، اسی طرح یہ دونوں لفظ بیشتر کبیرہ گناہوں کے لئے بولے جاتے ہیں، گو صغائر پر بھی انکا اطلاق ہوتا ہے۔ سُوء اور سَیِّئۃ بیشتر صغائر کے لئے بولے جاتے ہیں۔ اور خطاء وخطیئۃ ہر اُس غلطی کو کہتے ہیں جو بالقصد ہو یا بالقصد ہو۔ اسی طرح یہ الفاظ صغیرہ وکبیرہ دونوں کے لئے بولے جاتے ہیں، البتہ صغیرہ کے لئے ان کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ عصیان ومعصیت کا استعمال مخالفتِ امر کے لئے ہوتا ہے وہ عمداً ہو یا نسیاناً۔

گناہ کی قسمیں

گناہ کی تقسیم صغیرہ اور کبیرہ کی طرف ہوتی ہے یا نہیں؟ (۱) بعض علماء نے کہا ہے کہ ہر گناہ کبیرہ ہے۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ کی جلالت وعظمت کے لحاظ سے ادنیٰ گستاخی بھی بڑی ہے۔ بڑوں کے امر کی معمولی مخالفت بھی بڑا جرم شمار ہوتا ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں لَا صَغِیْرَۃَ مَعَ الْاِصْرَارِ وَلَا کَبِیْرَۃَ مَعَ الْاِسْتِغْفَارِ یعنی گناہ کی دو قسمیں صغیرہ اور کبیرہ تو ہیں لیکن اگر صغیرہ گناہ کو بار بار کیا گیا تو وہ بھی کبیرہ بنجائیگا۔ اور اگر کبیرہ سے توبہ کرلیگا تو وہ معاف ہوجائیگا۔ (۳) بعض کہتے ہیں کہ تقسیم تو صحیح ہے کہ بعض گناہ صغائر ہوتے ہیں اور بعض کبائر لیکن دونوں قسم کے گناہوں کو الگ الگ بیان نہ کیا جائے مبہم رکھا جائے تاکہ دلوں سے خوف نہ اٹھ جائے۔ اور عوام کبائر کے علاوہ گناہوں کو ہلکا سمجھ کر جری نہ ہوجائیں۔

(۴) لیکن اکثر علمائے اُمت تقسیم کے قائل ہیں، اور وہ ان کی وضاحت کو بھی جائز بلکہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآنی آیات اور حدیثی روایات میں کبائر کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا، اور گناہ کی دونوں قسموں کو صاف صاف بتایا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ:

(۱) اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْھَوْنَ عَنْہُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (النساء آیت ۳۱)

(اگر تم اُن بڑے گناہوں سے بچتے رہوگے جن سے تمکو منع کردیا گیا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ (کبائر سے بچنے کے اہتمام کی وجہ سے) معاف کردیں گے۔

(۲) اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ

(جو لوگ بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں

اِلَّا اللَّمَمَ۔ (النجم آیت ۳۲) مگر چھوٹے گناہوں سے)

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ کبیرہ (بڑے) گناہ ہیں اور کچھ صغیرہ (چھوٹے) گناہ ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے بڑے گناہوں سے بچ جاتے تو اس کے چھوٹے گناہ بڑے گناہوں سے بچنے کے اہتمام و برکت سے معاف فرما دیئے جائیں گے۔ کبیرہ گناہوں سے بچنے میں فرائض وواجبات وحقوق کی ادائیگی بھی داخل ہے۔ کیونکہ ان کا ترک بھی کبیرہ ہے۔ صغیرہ گناہ جس طرح کبائر سے بچنے سے معاف ہوتے ہیں نیک کاموں سے بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ جیساکہ قرآنی آیات اور حدیثی روایات میں وارد ہوا ہے۔

دوسری آیت میں محسنین یعنی نیک لوگوں کی تعریف کی گئی ہے۔ کہ وہ بڑے گناہوں سے عموماً اور بے حیائی کے گناہوں (زنا، لواطت وغیرہ) سے خصوصاً دور رہتے ہیں۔ مگر صغیرہ اُن سے سرزد ہوتے ہیں۔ جن کو اُن کی نیکیوں کی بدولت معاف کر دیا جاتا ہے۔ اور اُن کے درجات ومقامات میں ان صغائر سے کوئی فرق نہیں آتا۔ جو کبیرہ گناہ اتفاقاً سرزد ہو جائے اور اس سے سچی پکی توبہ کرلی جائے وہ بھی لمم میں داخل ہے۔ کہ وہ صلاح وتقویٰ اور صفتِ احسان کے لئے مضر نہ ہو گا۔ اس دوسری آیت سے بھی گناہ کی دو قسمیں سمجھ میں آتی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صغیرہ دوسری کبیرہ۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ گناہوں کی تقسیم صغائر وکبائر کی طرف کرنے سے ناواقف ہیں۔ اور وہ دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے وہ مدارجِ اشیاء کے تفاوت اور فرق مراتب سے جاہل ہیں۔ ہر معصیت اگرچہ اللہ کی جلال وجبروت والی بارگاہ کے پیش نظر بڑی اور سخت ترین سہی تاہم آپس میں معاصی کے درمیان بھی تو فرق ہے، اور اس فرق ہی کا نام تقسیم الی الصغائر والکبائر ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ کی تعریفات

مذکورہ دونوں آیات میں لفظ کبائر اور اس کے مقابلہ میں ... سیّئات اور لمم کے الفاظ آئے ہیں جن سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ اب یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ گناہ کبیرہ وگناہ صغیرہ کسے کہتے ہیں۔ اُن کی تعریفات کیا ہیں؟ ان کی تعریفات سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ مطلق گناہ ہر ایسے کام کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے خلاف ہو۔ اسی سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصطلاحاً جس گناہ کو صغیرہ کہا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت صغیرہ اور معمولی نہیں۔ امرِ خداوندی کی مخالفت اور اس کی مرضی کی خلاف ورزی نہایت شدید اور سخت جرم ہے۔ اسی لئے امام الحرمین اور بہت سے علمائے اُمّت نے فرمایا کہ اللہ کی ہر نافرمانی کبیرہ ہی ہے۔ کبیرہ وصغیرہ کا فرق گناہوں کے باہمی مقابلہ و موازنہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا قول ہے کُلُّ مَا نُهِيَ عَنْهُ فَهُوَ كَبِيرَةٌ (جس کام کو

شریعت اسلامیہ میں منع کیا گیا ہے وہ کبیرہ ہے) اور یہ تو سب کو مسلّم ہے کہ صغیرہ گناہ کو بے باکی و بے پروائی سے کیا جائے یا بار بار کیا جائے تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے اَلْاِصْرَارُ عَلَی الصَّغِیْرَۃِ کَبِیْرَۃٌ۔۔۔
بعض اکابر نے فرمایا کہ چھوٹے اور بڑے گناہ کی مثال عالم محسوسات میں چھوٹے اور بڑے بچھو یا آگ کے چھوٹے اور بڑے انگارے کی سی ہے۔ کہ انسان ان دونوں میں سے کسی کی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کرسکتا اور نہ چھوٹے بچھو یا چنگاری کو ناقابل اعتنا سمجھ سکتا ہے۔
محمد بن کعب قرظیؒ نے فرمایا کہ اللہ کی سب سے بڑی عبادت ترک معاصی ہے۔ جو لوگ عبادات کیساتھ گناہ بھی کرتے ہیں اُن کی عبادات مقبول نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ (حرام کاموں سے بچتے رہو سب سے بڑے عبادت گذار بن جاؤ گے)
حضرت فضیل بن عیاضؒ کا ارشاد ہے کہ تم جسقدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے وہ اللہ کے نزدیک اتنا ہی بڑا جرم ہوگا۔ سلف صالحینؒ نے فرمایا ہر گناہ کفر کا قاصد ہے جو انسان کو کافرانہ اخلاق و اعمال کی دعوت دیتا ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو ایک خط میں لکھا کہ بندہ جب اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے مداح بھی اس کی مذمت کرنے لگتے ہیں۔ اور دوست بھی دشمن ہوجاتے ہیں۔ گناہوں سے بے پروائی انسان کے لئے دائمی تباہی کا سبب ہے، البتہ گناہوں کے مفاسد، نتائج بد اور مضر اثرات کے اعتبار سے ان میں فرق ضروری ہے۔ اسی فرق کی بنا پر کسی گناہ کو صغیرہ اور کسی کو کبیرہ کہتے ہیں۔ اسکے بعد سمجھئے کہ جو لوگ تقسیم کے قائل ہیں، صغیرہ و کبیرہ کی تعریف میں ان علماء کی عبارات اور تعبیرات مختلف ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) جن گناہوں پر خاص طور سے شارعؑ نے لعنت، وعید اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہو وہ کبیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ صغیرہ ہیں۔

(۲) جن گناہوں پر وعید اور دھمکی کے ساتھ ساتھ دوزخ کی خبر دیگئی ہے ایسے گناہ کبیرہ اور باقی صغیرہ ہیں

(۳) جن گناہوں پر صراحۃً نہی وارد ہوئی ہے وہ کبیرہ ہیں باقی صغیرہ ہیں۔

(۴) جن گناہوں پر شریعت میں حد مقرر ہے وہ کبیرہ ہیں ان کے علاوہ صغیرہ ہیں۔

(۵) جن گناہوں کے ساتھ اقتران ہو غضب یا نار یا حد یا لعنت کا وہ کبیرہ ہیں ان کے سوا سب صغیرہ ہیں۔

(۶) گناہوں میں اضافی نسبت ہے کہ بعض گناہ دوسرے بعض کی نسبت سے صغیرہ ہیں اور بعض بہ نسبت بعض کبیرہ ہیں۔ مثلاً مضاجعت مع الاجنبیہ بہ نسبت نظر بالشہوۃ کبیرہ ہے۔ اور بہ نسبت زنا صغیرہ ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

(۷) اشخاص کے اعتبار سے گناہ پر صغیرہ اور کبیرہ ہونے کا حکم ہوگا کما قیل حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ

سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ بڑوں کے چھوٹے گناہ بھی بڑے اور چھوٹوں کے بعض بڑے گناہ بھی چھوٹے شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ بڑوں کی اتباع کی جاتی ہے۔ ان کا ہر عمل متعدی ہوتا ہے۔ اسلئے ان کی معمولی غلطی کے مفاسد چھوٹوں کے بڑے گناہ کے مفاسد سے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک بازاری آدمی کوئی بُرا کام کرتا ہے وہ متعدی نہیں ہوتا۔ کوئی عالم کرتا ہے تو وہ دور تک پھیل جاتا ہے۔

(۸) احوال کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ مثلاً اتفاقاً ارتکاب معصیت صغیرہ اور اسکی عادت واصرار اس کو کبیرہ بنا دیتی ہے۔

(۹) مفعول کے اعتبار سے کبیرہ وصغیرہ ہونے کا حکم ہوتا ہے۔ مثلاً کسی بازاری، جاہل یا فاسق کی اہانت صغیرہ ہوگی۔ اور صالحین وسادات اور علمائے حق کی اہانت کبیرہ ہوگی۔

(۱۰) اگر وہ گناہ مقصود بالذات ہو تو کبیرہ ورنہ صغیرہ، مثلاً زنا، چوری، قتل ناحق وغیرہ کبائر ہیں۔ اور ان کے مقدمات صغائر۔

(۱۱) شیخ عزّ الدین بن عبد السلام نے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ جن گناہوں کا کبیرہ ہونا منصوص ہے وہ کبیرہ ہیں، اور جو گناہ مفسدہ میں اُن کی برابر یا ان سے قریب ہیں وہ بھی کبیرہ ہیں۔ باقی سب صغیرہ ہیں مثلاً میدانِ جنگ سے بھاگنا گناہِ کبیرہ منصوص ہے (الفرار یوم الزحف) ایک مسلمان میدانِ جنگ سے تو نہیں بھاگتا البتہ مسلمانوں کے چھپے ہوئے مال، بچوں اور عورتوں پر کفار کو مطلع کر دیتا ہے تو اس کا حکم گو منصوص نہیں مگر مفسدہ میں فرار یوم الزحف (جنگ سے بھاگنے) سے کم نہیں۔ کیونکہ جس طرح فرار سے مجاہدین کے قدم اکھڑ جاتے ہیں اسی طرح مال ومتاع اور اہل وعیال کے غیر محفوظ ہونے اور اُن پر کفار کے حملہ آور ہونے سے بھی اُن کے پیر اکھڑ جائیں گے، بلکہ یہاں عورتوں کی ناموس وعزت کا مسئلہ بھی ہے (اسلئے یہ مفسدہ میں فرار سے زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ بھی کبیرہ ہوگا۔ اسی طرح زنا کرنا کبیرہ ہے، نص سے ثابت ہے، اگر کوئی شخص خود زنا نہیں کرتا بلکہ کسی عورت کو پکڑ کر اس سے زبردستی کسی اور کو زنا کرا دیتا ہے، اگرچہ یہ منصوص نہیں، مگر مفسدہ میں زنا کرنے سے کم نہیں۔ اسلئے یہ بھی کبیرہ ہوگا۔

ہمارے خیال میں جس میں شدت یا مفسدہ زیادہ ہو وہ کبیرہ ہے۔ اب وہ شدت نہی صریح، وعیدِ عقوبت اور تعیینِ حد وغیرہ ہو، یا ان کے کبیرہ ہونے کی صراحت ہو (اور مفسدہ نقلاً معلوم ہوگا یا عقلاً) ایسے گناہ سب کبیرہ کہلائیں گے۔ اور ان کے علاوہ باقی گناہوں کو صغیرہ کہیں گے۔ واللہ اعلم۔

کبائر کی تعداد

ظاہر ہے کہ تعریفات کے اختلاف اور اپنی اپنی تلاش وجستجو کے اعتبار سے تعداد میں بھی اختلاف ہوگا۔ نیز جن علماء نے بڑے بڑے ابواب معصیت شمار کرنے پر اکتفاء کیا ہے اُن کے نزدیک تعداد کم ہے۔ اور جنہوں نے انواع واقسام

اور ان کے افراد کا احصار وشمار کیا ہے، اُن کے نزدیک تعداد زیادہ ہے۔ اسلئے جس طرح تعبیرات مختلف ہونے کے باوجود اگر بغور دیکھا جائے تو وہ قریب المعنی ہیں۔ اسی طرح تعداد میں بھی کوئی ایسا تعارض نہیں کہ کم تعداد بتانے والے حضرات نے باقی کا انکار کردیا ہو۔ بہرحال اپنے اپنے انداز اور اندازہ کے مطابق حضراتِ علماء نے کبائر کی تعداد بتائی اور لکھی ہے۔ چنانچہ حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ نے کبائر کی تعداد نَو بتائی ہے۔ لیکن جب حضرتِ عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے کسی نے کبائر کی تعداد نَو بیان کی تو فرمایا نَو نہیں نَو سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ مُلّا علی قاریؒ نے ابن عباسؓ کا ایک قول یہ نقل کیا ہے ھِیَ اَقْرَبُ مِنَ السَّبْعِیْنَ (یعنی کبائر تقریباً ستر ہیں)

شیخ ابوطالب مکیؒ صاحب قوت القلوب نے (یہ قوت القلوب امام غزالیؒ کی معرکۃ الآراء کتاب احیاء العلوم کی اصل ہے) فرمایا کہ میں نے گناہِ کبیرہ کے بارے میں وارد ہونے والی تمام احادیث کو جمع کیا تو میں نے کبائر سترہ پائے۔ ان میں سے چار کا تعلق قلب سے ہے۔

(۱) شرک (۲) نافرمانی پر اصرار کی نیت (۳) اللہ کی رحمت سے ناامیدی (۴) اور اللہ کے عذاب سے بےخوفی۔ اور چار کا تعلق زبان سے ہے۔ (۱) جھوٹی شہادت (۲) پاک دامن پر تہمت (۳) جھوٹی قسم۔ (۴) جادو۔ اور تین کا تعلق پیٹ سے ہے (۱) شراب پینا (۲) یتیم کا مال ناحق کھانا۔ (۳) سود خواری اور دو کا تعلق شرمگاہ سے ہے۔ (۱) زنا (۲) لواطت۔ اور دو کا تعلق ہاتھ سے ہے (۱) قتل ناحق (۲) چوری۔ اور ایک کا تعلق پیروں سے ہے۔ اور وہ ہے جنگ کے دن کفار کے مقابلہ سے بھاگنا۔ اور ایک پورے بدن کو شامل ہے۔ اور وہ ہے والدین کی نافرمانی۔

امام ابن حجر مکیؒ نے کتاب الزواجر عن الکبائر، ایک نفیس کتاب تحریر فرمائی ہے۔ جس میں کبائر کی فہرست اور ہر کبیرہ کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے۔ اس کتاب میں کبائر کی تعداد چار سو سرسٹھ (۴۶۷) تک پہونچی ہے۔

گناہوں کی چار قسمیں

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ذنب (گناہ) نام ہے اس چیز کا کہ جس کا کرنے والا شرعاً قابلِ مذمت ہو۔ اور ذنب (گناہ) کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) جو بغیر توبہ معاف نہ کیا جائے اور وہ کفر ہے (۲) جس کے متعلق امید کی جاسکتی ہے کہ استغفار اور نیکیوں سے معاف کردیا جائے، اور وہ صغیرہ گناہ ہیں (۳) جس کی توبہ کے ذریعہ مغفرت ہوجائے اور بغیر توبہ وہ تحت المشیت ہو یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہیں معاف فرمادیں اور چاہیں تو سزا دیدیں۔ اور وہ حقوق اللہ والے کبائر ہیں۔ (۴) جس میں حق تلفی کی ادائیگی، مکافات اور معافی و تلافی، اور توبہ کی ضرورت ہو۔ اور وہ مسلمانوں کی حق تلفی کا گناہ ہے۔ یاد رکھیئے کہ بندوں کی حق تلفی کی مکافات و ادائیگی کی دنیا میں تین صورتیں ہیں۔ (۱) معاف کرالینا (۲) بعینہٖ صاحبِ حق کی چیز

واپس کر دینا۔ (۲) اس کا بدل واپس کر دینا۔ اور آخرت میں بھی تین صورتیں ہیں۔ (۱) ظالم کا ثواب مظلوم کو دیا جاتے۔ (۲) مظلوم کے گناہ ظالم کو دیکر ان گناہوں کی سزا میں ظالم کو گرفتار کیا جائے۔ (۳) حق تعالیٰ اپنی طرف سے اپنے فضل و کرم سے مظلوم کو بدلہ دیکر اُس کو ظالم سے راضی فرما دیں۔

(۲۵۷) عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سِمْعَانِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ
حضرت نواس بن سمعان انصاریؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ
نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا نیکی اچھے اخلاق ہیں۔
وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ۔
اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں تردد پیدا کر دے اور لوگوں کا اس پر مطلع ہونا تجھ کو پسند نہ ہو۔
(مسلم ص ۳۱۴ ج ۲، ترمذی ص ۶۲ ج ۲، مشکوٰۃ ص ۴۳۱)

تشریح حضرت نواس بن سمعانؓ نے طاعت و معصیت کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ بر در اصل جملہ اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کو کہتے ہیں۔ یہاں بر کے مقابلہ میں اثم مذکور ہے، اسلئے بر سے صرف طاعت اور اثم سے اس کی ضد یعنی معصیت مراد ہے۔ آپنے فرمایا حسن الخلق بر ہے۔ یعنی بر میں سب سے عظیم الشان چیز یا اجمالی طور پر تمام بر اللہ کے حکم کے مطابق مخلوق سے برتاؤ کرنا، یا خلقِ خدا کی مدارات اور حق کی رعایت بر ہے۔ احادیث میں بر کی تفسیر مختلف معانی کے ساتھ وارد ہے۔ کہیں بر کی تفسیر میں فرمایا کہ بر وہ ہے جس سے نفس کو اطمینان حاصل ہو۔ کہیں فرمایا کہ بر وہ ہے جس سے قلب کو اطمینان ہو جائے۔ یعنی تردد کی کیفیت باقی نہ رہے۔ اور کہیں بر کی ایمان کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ تو کسی حدیث میں یہ فرمایا گیا کہ بر وہ ہے جو تجھے اللہ کے قریب کر دے۔ اور اس حدیث میں حسنِ خلق سے تفسیر کی ہے۔ اور حسنِ خلق احادیث میں چار چیزوں کے مجموعہ کو بتایا گیا ہے۔ (۱) لوگوں کی اذیتوں کو برداشت کرنا (۲) غصہ نہ کرنا (۳) ہنس مکھ رہنا۔ (۴) نرم و عمدہ گفتگو کرنا۔ لیکن بر ایک ہمہ گیر حقیقت کا نام ہے۔ جو تمام طاعات کو شامل ہے — احادیث میں جو معانی بیان کیے گئے ہیں وہ متقارب ہیں۔ نیز حسب موقع ہر جگہ حسن خلق کے کسی اعلیٰ فرد کا ذکر فرما دیا گیا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس جگہ بر سے صلہ رحمی، صدقہ اور طاعت مراد ہے۔ جن کا مجموعہ حسن خلق ہے۔ اور بعض محققین نے فرمایا ہے کہ لفظ بر جملہ انواعِ طاعات اور اعمالِ صالحہ کو جامع ہے۔ جن میں بر الوالدین بھی داخل ہے۔ جس کا حاصل بقدر امکان والدین کو راضی

رکھتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ بر کامل تو انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے لیکن امتی بھی صفتِ بر کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کو حسنِ خلق حاصل ہو جائے۔ اور حسنِ خلق یہ ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ احسان و سلوک کا برتاؤ کرے، اور خالق کی عبادت فرائض و نوافل میں مشغول ہو کر اس کی مکمل اطاعت کرے۔ اور اپنے اندر مکمل تواضع پیدا کر کے خود کو انواعِ فضائل سے مزین کرے۔ پھر ما سوا اللہ سے کنارہ کش ہو کر متخلق باخلاق اللہ ہو جائے۔ اور دوام ذکر و فکر کے ذریعہ مقامِ وصل کو حاصل کر لے۔

والاثم ما حاک یعنی گناہ وہ ہے کہ جس کے لئے قلب میں انشراح و اطمینان نہ ہو۔ تردد باقی رہے۔ لیکن شرح صدر عوام کا معتبر نہیں۔ بلکہ ان مؤمنین کاملین کا معتبر ہے جن کا قلب انوار ایمان سے مجلّیٰ اور رذائل سے پاک ہو کر فضائل سے مزین و محلّیٰ ہو چکا ہو۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ گناہ وہ ہے جس سے دل میں تردد پیدا ہو جائے، اور دوسروں کے سامنے اس کا اظہار اس کے قبیح ہونے کی بنا پر نہ کر سکے۔ اس کی وضاحت جزء اول کے شروع میں (۱۶) کے تحت اور جزء ثانی میں (۱۵۲ اور ۱۵۳) کے تحت آچکی ہے۔

حضرت نواس بن سمعانؓ

حضرت نواس بن سمعان کلابی انصاریؓ شام میں رہے۔ اور شامیین ہی میں آپکا شمار ہے۔ (نواس بتشدید الواو وسمعان بکسر السین المھملۃ وقیل بفتحھا وسکون المیم وبالعین المھملۃ) ان سے جبیر بن نفیرؒ و ابو ادریس خولانیؒ وغیرہ نے حدیث روایت کی (ولم اطلع علیٰ ترجمتہ تفصیلاً بالکتب التی عندی۔ (الاکمال)

اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ

اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔

ثُمَّ اِنَّ الْاِثْمَ لَهٗ مَرَاتِبُ وَاَنْوَاعٌ فَاَعْظَمُ الْاٰثَامِ الَّذِیْ لَا یُغْفَرُ ثُمَّ

پھر گناہ کے بہت سے مرتبے اور قسمیں ہیں۔ اور گناہوں میں سب سے بڑا جسکی مغفرت نہ کیجائے گی پھر

لَا یُغْفَرُ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ هُوَ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ۔

مغفرت نہوگی جبتک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں نہ داخل ہو جائے وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے۔

(۳۵۷) قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝

لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا کہ اے میرے پیارے بیٹے اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا بیشک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔ (لقمان آیت ۱۳)

(۳۵۸) وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ اِس جرم کو معاف نہ فرمائیں گے کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے اور اِس سے
ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ (نساء آیت ۱۱۶)
کم درجہ کے گناہ جسکے اللہ تعالیٰ چاہیں گے معاف فرمادیں گے اور جو اللہ کیساتھ شریک ٹھہراتے تو وہ دُور دراز کی گمراہی میں پڑگیا۔

(۳۵۹) وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا' اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا پھر
الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (الحج آیت ۳۱)
پرندوں نے اسکی بوٹیاں نوچ لیں یا اس کو کسی دور ودراز مقام پر لیجاکر پٹک دیا۔

(۳۶۰) قَالَ رَبُّنَا الْمُتَعَالُ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا
ہمارے پروردگارِ عالیشان نے فرمایا' بیشک وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا اور اُن سے تکبر کیا تو
لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ
اُن کے لئے آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ جنّت میں نہیں جاسکتے جبتک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ
فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ
میں نہ گھس جائے۔ اور اسی طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیں گے۔ ان کے لئے دوزخ (کی آگ) کا
مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ط وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (اعراف آیت ۴۰ و ۴۱)
بچھونا ہوگا۔ اور اُن کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔ اور اسی طرح ہم ظالموں کو بدلہ دیں گے۔

فَهُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ الَّذِيْ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ
تو وہ اللہ جو اکیلا، ہمیشہ زندہ رہنے والا سنبھالنے والا ہے۔ ایسا ہے کہ اسکو نہ اونگھ آتی اور نہ نیند آتی ہے۔ اسی کی
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ
ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ ایسا یکتا، بے نیاز ہے کہ جس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ وہ خود
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ الَّذِيْ لَا شَرِيْكَ لَهٗ فِيْ ذَاتِهٖ وَلَا فِيْ صِفَاتِهٖ
جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں نہ اسکی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔
وَلَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ. بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اور اس کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہی خوب سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کو بے مثال
اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ
پیدا کرنیوالا ہے۔ اسکے کوئی اولاد کیسے ہوسکتی ہے حالانکہ اسکی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔
اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ
وہی اللہ تو تمہارا پالنہار ہے جسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا پیدا کرنیوالا ہے تم اسی کی عبادت کیا کرو۔ اور وہ ہر
شَيْءٍ وَّكِيْلٌ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ
چیز کا نگراں ہے۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، اور وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے۔ اور وہ باریک بیں،
الْخَبِيْرُ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ
خوب خبردار ہے۔ اس نے اس بات کا حکم دیا کہ تم اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور نہ اللہ کیساتھ کوئی دوسرا معبود تجویز
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
کرو۔ اسکے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی ہیں آسمانوں اور زمینوں کی کنجیاں، اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں کوئی
وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا هُوَ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ
بھی اسکے سوا تمام غیبوں کا علم نہیں رکھتا۔ وہ اللہ ہی پیدا کرنیوالا ہے ٹھیک ٹھیک بنانیوالا ہے صورت بنانیوالا ہے
الْحُسْنٰى۔ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ
اسی کے اچھے اچھے نام ہیں، اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ زبردست
ہے حکمت والا ہے۔

تشریح مؤلفؒ نے سب سے اول سب سے بڑے گناہ، شرک کو بیان کیا، فرماتے ہیں کہ گناہ کے بہت سے درجے اور بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن گناہوں میں سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ جس کی ہرگز ہرگز مغفرت نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی مغفرت ایسی ہی ناممکن ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے سوراخ میں داخل ہو جانا ناممکن ہے۔ اسی لئے قرآنِ مقدس میں شرک کی مذمت میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں نمونہ کے طور پر چند آیات پیش فرماتے ہیں۔

(۳۵۷) وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ الآیۃ سورۂ لقمان میں حکیم لقمان کی جو چند اہم ترین حکمتیں اور وصیتیں ۔۔۔ ذکر فرمائی ہیں اُن میں سب سے پہلی وصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو بڑے پیار اور دلسوزی کے ساتھ یہ نصیحت کی کہ اے میرے عزیز بیٹے تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دینا۔ کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ ظلم کی حقیقت وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهٖ (کسی چیز کو بے محل استعمال کرنا) ہے۔ اور یہ بات سب سے زیادہ واضح ہے کہ اللہ جل شانہٗ خالق، مالک اور منعم ہیں۔ جبکہ خلق و ملک والنعام میں ان کا کوئی شریک نہیں تو عبادت میں شرکت کا بھی کسی کو حق نہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی کسی کو حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وصفات، عبادت و پرستش میں اور حکم و اطاعت میں شریک کرتا ہے تو یقیناً اس کی یہ حرکت ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔

(۳۵۸) اور کیونکہ یہ خالقِ کائنات کی زبردست اہانت ہے، اسلئے یہ ایسا ظلم عظیم اور ناقابلِ معافی جرم ہے کہ جس کی سزا ابدی ہے۔ چنانچہ اس آیت گرامی (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ الآیۃ) میں ارشاد فرمایا گیا کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس جرم عظیم (شرک) کو معاف نہ فرمائیں گے۔ اور اس سے کم درجہ کے جتنے گناہ صغیرہ وکبیرہ ہوں گے ان کو منظور ہوگا تو ان کو معاف فرما دیں گے، اور وہ چاہیں گے تو سزا دیں گے۔ اور مشرک کے لئے کبھی معافی ومغفرت نہ ہونا اور دائمی سزا کا تجویز ہونا اسلئے ہے کہ شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کا مرتکب ہدایت سے بہت دُور جا کر گمراہی میں ڈوب گیا جہاں اس کے بچنے یا اس کو بچانے جانے کی امید ہی نہیں۔ بخلاف اور کسی جرم کے مرتکب گنہگار کے کہ وہ ہدایت کی روشنی سے اتنی دور نہیں ہے کہ وہ راستہ کو دیکھ ہی نہیں پاتا۔ اسی لئے اس کو ناقابلِ معافی جرم قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس کو مشیت کے تحت رکھا گیا۔ اور مشرک وفاسق میں فرق یہ ہے کہ مشرک تو توحید وایمان سے بیگانہ اور احکم الحاکمین کا باغی ہے۔ اور فاسق باغی نہیں، بلکہ وفادار ہے۔ ہاں عہد وفاداری کے نباہنے میں وہ کوتاہی کرتا ہے۔ اور کفر بھی شرک جیسا ہی ظلم عظیم وجرم کبیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی صانع حقیقی کی کسی صفت کا یا اس حاکمِ مطلق کے کسی حکم کا انکار اور باری تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کی توہین ہوتی ہے۔ ذات وصفت کے انکار میں توہین اور انکارِ توحید ہے۔ اور انکارِ حکم میں دوسروں کی کم از کم اپنے نفس کے حکم کی تعظیم ہے۔ جو سراسر شرک ہے۔ اور ہر صورت میں شیطان کی عبادت واطاعت پائی جاتی ہے۔ اور یہی شرک ہے۔ اسلئے کفر وشرک برابر کے جرم اور کافر ومشرک دونوں یکساں مجرم ہوتے، اسلئے دونوں ناقابلِ معافی اور سزائے ابدی کے مستحق ہیں۔

ایک شبہ عموماً معاند اور ناسمجھ لوگ یہاں یہ شبہ کرتے ہیں کہ سزا بقدرِ جرم ہونی چاہیئے۔ جرم سے زیادہ سزا ظلم وناانصافی ہے۔ اور کافر ومشرک کا جُرم محدود ہے جو اُسنے اپنی چند روزہ زندگی میں کیا ہے۔ اور اسکی سزا ابدی ودائمی اور لامحدود ہے۔ اس اعتراض کا جواب اوپر کی عبارت میں غور کرنے سے مل جائیگا۔ تاہم اس کے چند جوابات صراحۃً ذیل میں درج ہیں۔

(۱) یہ اللہ کا قانون ہے۔ وہ اگر بلا جُرم بھی سزا دیدیں تو عینِ انصاف ہے۔ وہ خالق ومالک، صانع ومُدبّر اور بااختیار ہیں۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ اور لَا یُسۡئَلُ عَمَّا یَفۡعَلُ ان کی شان ہے۔

(۲) کافر ومشرک باغی ہیں۔ اور بغاوت کی سزا دنیوی قانون میں بھی اس کو زندگی سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دینا ہے۔ حق تعالیٰ نے اگر اس کو دائمی سزا دیکر ہمیشہ کی زندگی سے محروم کر دیا تو اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

(۳) قتل ایک منٹ میں ہو جاتا ہے مگر دنیا کا قانون اس کو بیس سال کی یا پھانسی کی سزا دیتا ہے۔ اس پر یہ شبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ معلوم ہوا کہ دنیوی قانون کے اعتبار سے بھی یہ کہنا غلط ہے کہ جتنے وقت میں

جُرم ہوا اتنے ہی وقت اس کو سزا دی جائے۔

(۳) یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مومن کو ایمان کی وجہ سے داخلہ جنت، اعمال کی بنا پر درجات اور نیت دوام علی الایمان پر جنت میں خلود و دوام حاصل ہوگا۔ اسی طرح کافر و مشرک کو کفر و شرک کی بنیاد پر جہنم میں داخل کیا جائیگا۔ اور اس کی کفریات (اعمال کفریہ) پر جہنم کے درکات ملیں گے۔ اور دوام علی الکفر کی نیت کی وجہ سے اس کو جہنم میں ہمیشہ رہنا پڑیگا۔

حاصل یہ ہے کہ کافر و مشرک کا ارادہ اپنے کفر و شرک پر ہمیشہ رہنے کا تھا اسلئے اس کو ہمیشہ سزا دیجائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا کی زندگی ناپائیدار اور محدود ہے، اور آخرت کی پائیدار اور لامحدود۔

شرک اور اسکی قسمیں

شرک کی حقیقت مخلوق میں سے کسی کو عبادت، محبت اور تعظیم وغیرہ میں اللہ کے برابر سمجھنا ہے۔ مشرکین جہنم میں کہیں گے کہ:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ بخدا ہم کھلی گمراہی میں تھے جبکہ ہم تم کو پروردگار عالم کے برابر کرتے تھے۔ (الشعراء آیت ۹۷ و ۹۸)

ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ مشرکین کا کسی دور میں نہیں رہا کہ وہ اپنے بتوں کو خالق و مالک مانتے ہوں بلکہ انہوں نے دوسری غلط فہمیوں کی بنا پر ان کی پرستش کی، اور ان کو عبادت و محبت اور تعظیم و حکم میں مالک حقیقی کی برابر کر دیا۔ چنانچہ مشرکین عرب کہتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (ہم بتوں کی پوجا صرف اسلئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے قریب کر دیں گے۔ یعنی ہم ان کو معبود نہیں مانتے۔ بلکہ وسیلۂ قرب معبود خیال کرتے ہیں)

زمانۂ جاہلیت میں مشرکین حج کرتے اور تلبیہ بھی پڑھتے تھے تو اپنے تلبیہ میں وہ لا شریك لك الا شريك هولك تملكه وما ملك (اے اللہ آپکا کوئی شریک نہیں مگر جو شریک ہے وہی ہے یعنی ہمارے بت اور آپ اس کے مالک ہیں اور وہ شریک کسی ایک ذرہ کا مالک نہیں) کہتے تھے جسمیں وہ اپنے معبودوں کی حیثیت ظاہر کرتے تھے یہی وہ شرک تھا جس نے ان کو ابدالآباد کے لئے جہنم رسید کر دیا۔ کیونکہ وہ اصنام کو عبادت میں اللہ کے برابر کرتے تھے۔ پھر شرک کی چند قسمیں ہیں۔

شرک فی الذات

(۱) اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنا جیسے یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے۔ اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اور یہود و نصاریٰ اپنے آپ کو بھی خدا کا بیٹا تصور کرتے تھے اور کہتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

(۲) اللہ کے لئے بیوی ماننا۔ جیسے عیسائیوں کے بعض فرقے حضرت مریم کو خدا کی بیوی کہتے۔ اور پٹنہ کے علاقہ میں بعض فقیر خود کو خدا کی بیوی کہتے ہیں اسی لئے وہ اپنے نام زنانے تجویز کرتے اور زنانہ

بناؤ سنگھار کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل ہم نے حیات اسعد، میں بیان کر دی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا کسی کو جزء اور حصہ ماننا۔ جیسے نصاریٰ کہتے تھے اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ (بیشک اللہ تین میں کا تیسرا ہے) یعنی وہ لوگ آقانیم ثلاثہ کے مجموعہ کو خدا مانتے ہیں۔ اسی طرح بعض اہل بدعت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ذات خداوندی کے نور کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہیں۔

(۴) یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کر گیا ہے۔ یا کسی کی صورت میں دنیا میں آگیا ہے۔ جیساکہ ہنود کا عقیدہ ہے۔ اور نصاریٰ کا عیسیٰؑ کے متعلق یہی خیال ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ (یعنی اللہ ہی مسیح بن مریم ہیں) بعض بدعتی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے ہیں ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر ٭ اُتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

(۵) اسی طرح اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دینا اور اسکے لئے جسم و اعضاء ثابت کرنا جیساکہ فرقہ مُجسِّمہ کے لوگ اس کا اعتقاد رکھتے تھے۔

(۶) اسی طرح یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح ہے۔ جس کو وزیروں، پیشکاروں، فوجوں اور کارندوں کی ضرورت ہے۔ اور جس طرح یہ لوگ ملک میں دخیل و بااختیار ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء و اولیاء اللہ کے ملک میں دخیل ہیں۔ اور بااختیار ہیں۔ جیسے چاہیں کریں، جو چاہیں کریں، جسکو چاہیں دیں، جسے چاہیں نہ دیں۔ جسکو چاہیں عزت دیں، جسے چاہیں ذلیل کر دیں۔ جیساکہ اہل بدعت کا عقیدہ ہے وہ کہتے ہیں ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے ٭ لے لیں گے ہمیں جو لینا ہے محمد سے

(۷) اللہ کا کسی نبی، ولی، غوث، قطب کو ایسا محبوب و معشوق ماننا جیسا انسانوں کا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے سامنے مجبور و ذلیل اور بے چین و مضطرب ہوتا ہے۔ جیساکہ اہل بدعت سید الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور غوث اعظم وغیرہ کے متعلق ایسے عقائد رکھتے ہیں۔

اس قسم کے تمام عقیدے شرک فی الذات میں داخل ہیں۔ ایسے عقیدے رکھنے والے بلاشبہ مشرک ہیں۔

(۲) شرک فی الصفات

حق تعالیٰ کی مخصوص صفات (ارادہ، قدرت، اختیار، علم محیط وغیرہ) میں سے کسی صفت کو مخلوق کے لئے ثابت کرنا یا اس میں کسی کو اسکے مثل ماننا، مثلاً کسی نبی، ولی یا بزرگ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہر جگہ پر حاضر و ناظر ہیں۔ اور ان کو ہمارے تمام احوال کی ہر وقت خبر ہے، یا ان کو کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا علم محیط ہے۔ جس طرح باری تعالیٰ کو ہے جیساکہ فرقہ رضائیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور بعض اہل بدعت پیروں تک کے متعلق اس قسم کے عقائد رکھتے ہیں۔ ان عقائد سے قرآنی آیات اور بیشمار احادیث کا انکار و کفر لازم آتا ہے۔ نیز یہ عقائد شرکیہ ہیں۔

اسی طرح کائنات کا اختیار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی غوث و قطب کے لئے ماننا بھی شرک ہے

جیساکہ مذکورہ فرقہ رضائیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے۔

(۳) شرک فی العبادۃ

تفسیر بیضاوی میں ہے وَالْعِبَادَةُ اَقْصٰی غَایَةِ الْخُضُوْعِ وَالتَّذَلُّلِ۔ (عبادت کے معنیٰ انتہائی خشوع وخضوع اور آخری درجہ کی ذلّت ظاہر کرنا ہیں) اسلئے عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے۔ کیونکہ انتہائی خشوع وخضوع کی وہی ذاتِ واحد مستحق ہے۔ جس کی بلندیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ شرعًا وعقلًا اسکے سوا کسی کے سامنے ایسا تذلل جائز نہیں۔ وہی اپنی ذات وصفات، افعال وانعامات میں یکتا ہے۔ ان میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں تو عبادت میں بھی کسی کو شرکت کا حق نہیں۔

علماء نے عبادت کے مفہوم کو مختلف الفاظ میں سمجھایا ہے (۱) شرعًا عبادت اُس فعل کو کہتے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے بندہ کے اظہارِ عبدیت کے لئے علامت بنایا ہو۔ خواہ اس کا تعلق ظاہر سے ہو جیسے اسلام کے ارکانِ خمسہ (اقرارِ کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) یا اس کا تعلق باطن سے ہو جیسے اعتقادیات و نیات۔ (۲) عبادت وہ فعلِ اختیاری ہے جو خلافِ نفس ہو، اور صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہو۔ لیکن زیادہ صاف بات یہ ہے کہ عبادت اِنتہائی عظمت ومحبت کے ساتھ آخری درجہ کی عاجزی، انکساری اور تذلّل کے اظہار کا نام ہے۔ اور مخلوق میں سے کسی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہی شرک ہے۔

(۴) شرک فی الحکم

کسی کی عظمت ومحبّت کیوجہ سے اسکے حکم کو وہ درجہ دینا جو اللہ کے حکم کا ہے اور کسی کے حکم کی اطاعت کو اسی طرح ضروری سمجھنا جیساکہ اللہ کے حکم کی اِطاعت ضروری ہے۔ یہود ونصاریٰ کے شرک کو بیان کرتے ہوئے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥ (توبہ آیت ۳۱)

(انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو یہ حکم کیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں جسکے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

یہود ونصاریٰ نے کتاب اللہ اور احکامِ خدا ورسول کو چھوڑ کر خود غرض پیشہ ور علماء اور جاہل عبادت گزار درویشوں کے قول وعمل ہی کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ اسی کی مذمّت میں یہ آیت اُتری تھی جس میں ان یہود ونصاریٰ کو اس جرم کی بناء پر مشرک قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ (جو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے) اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنے علماء ومشائخ کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ پھر قرآن نے

ان کو معبود بنا لینے کا الزام ہم پر کیوں لگایا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: کیا ایسا نہیں تھا کہ تمہارے علماء ومشائخ بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دیتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا۔ اور تم اپنے علماء ومشائخ کے کہنے پر ان چیزوں کو اللہ کے حکم کے خلاف حرام ہی سمجھتے تھے۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کو حرام کیا تھا اور تمہارے علماء ومشائخ ان کو حلال قرار دیتے۔ اور تم ان کے کہنے پر ان چیزوں کو حکم خداوندی کے خلاف حلال سمجھتے تھے۔ حضرت عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا "بیشک ایسا تو ضرور تھا" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بس یہی تو علماء ومشائخ کی عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جو شخص اس میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حلال وحرام معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کا حکم واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس شخص کو اپنا معبود قرار دے رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے اسی جرم (شخصیت پرستی) کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی بہت سے لوگ صرف عوام نہیں، بلکہ بہت سے نام نہاد علماء بھی اس جرم "شخصیت پرستی" میں مبتلا اور اس مشرکانہ رویہ پر بڑی مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ بہت سے متدین قسم کے لوگ بھی اس مشرکانہ جرم میں ایسی بری طرح گرفتار ہیں کہ وہ اس پر متنبہ کرنیوالوں کو ہی مجرم سمجھتے اور سوء خاتمہ وغیرہ کی جاہلانہ خود ساختہ وعیدیں سنا دیتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

علاماتِ شرک کو اپنانا بھی شرک ہے

اسی طرح ایسے اعمال وافعال کا ارتکاب جو شرک کی علامات اور مشرکین کے خاص نشانات سمجھے جاتے ہیں شرک ہی کے حکم میں داخل ہیں۔

"حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ میں جب مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی (جو نصاریٰ کی ایک خاص علامت ہے) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس بت کو اپنے گلے سے نکال دو" حالانکہ حضرت عدی بن حاتمؓ کا عقیدہ اسوقت صلیب کے متعلق وہ نہ تھا جو نصرانیوں کا ہوتا ہے۔ مگر ظاہری طور پر بھی شرک کی نشانی سے پرہیز کو ضروری قرار دیتے ہوئے یہ ہدایت فرمائی گئی تھی۔

افسوس ہے کہ آجکل ہزاروں مسلمان "ریڈ کراس" کا نشان لگائے پھرتے ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ بلا وجہ مشرکانہ جرم کے مرتکب ہیں۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ زنّار (جنیو) باندھنا، غیار (کفار ومشرکین کا خاص لباس) پہننا بھی کفر ہے۔ اسی طرح کفار ومشرکین کی مخصوص مذہبی رسوم میں شرکت کرنا بھی کفر ہے۔ مثلاً ہولی کا رنگ کھیلنا، سمادھی پر پھول چڑھانا، تلک لگانا، بندیا لگانا وغیرہ مسلمانوں کو اس قسم کی تمام چیزوں سے محتاط

رہنا انتہائی ضروری ہے۔ دورِ حاضر کے سیاسی لوگ اس قسم کے جرائم کرکے سیاست کے بُت پر اپنے ایمان کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ افسوس صد افسوس۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے دل میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی عظمت و محبت ہوگی وہ اسلامی اصولوں اور پیغمبرِ اسلام کے طریقوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ قیمتی سمجھکر ان کی مکمل حفاظت کریگا۔ اور اغیار کے طریقوں سے پورے طور پر متنفر و محتاط رہیگا۔ اور پیغمبرِ اسلام کی محبت ان کی ہر چیز کو محبوب، کفر و شرک کو قابلِ نفرت اور کفار و مشرکین کے ہر طریقہ کو مبغوض و ناپسندیدہ بنا دے گی۔

(۲۵۹) یعنی توحید اور اللہ کی عبادت کمالِ رفعت ہے۔ اس سے اعلیٰ اور بلند تر کوئی چیز نہیں۔ جیسے کوئی شخص آسمان پر چڑھا ہوا ہو۔ اور سب سے اونچا دکھائی دیتا ہو، لیکن جب وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے تو وہ اُس کمالِ رفعت و بلندی سے اِس طرح نیچے گر پڑتا ہے جیسے آسمان پر چڑھا ہوا آدمی پستی کے غار میں گر پڑے۔ اور اس سے زیادہ پستی کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی ہی جیسی مخلوق کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ ایسا آدمی تو انتہائی ذلیل و پست ہے۔ صاحب تفسیر مظہریؒ فرماتے ہیں کہ:

"پرندوں کے اُچک لینے سے مراد بطورِ استعارہ بالکنایہ نفسانی خواہشات ہیں، جو انسان کی یکسوئی و اطمینانِ خاطر کو چھین لیتی ہیں اور اسکے خیالات کو پریشان کر دیتی ہیں۔

اور تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ سے بطورِ استعارہ بالکنایہ شیطان مراد ہے۔ کہ شیطان ہی انسان کو گمراہی کے پست ترین اور دُور و دراز مقام پر پھینکتا ہے۔ مَكَانٍ سے مراد گمراہی کا مقام ہے۔ اور سَحِيقٍ کے معنی دُور کے ہیں یعنی حق سے دور۔ مطلب یہ ہوا کہ مشرک پر نفس و شیطان مسلّط ہو جاتے ہیں۔ اور شیطان انسان کو ایمان کی بلندی سے گمراہی کی پستی میں پھینک دیتا ہے۔

اس آیت میں لفظ اَوْ منع خلو کے لئے ہے۔ منع جمع کے لئے نہیں ہے۔ (یعنی یہ ممکن ہے کہ پرندے بھی اس کو اُچک لیں، اور ہوائی طوفان بھی دور لیجا کر پھینکدے، لیکن یہ ناممکن ہے دونوں میں سے کچھ بھی نہو"

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ اس جگہ اَوْ تقسیم کے لئے ہے۔ کیونکہ مشرکین کی دو قسمیں ہیں (۱) جو کبھی بھی شرک سے تائب نہوں، وہ گویا ایسے ہیں کہ جنکو پرندے اُچک لیں۔ اور چیر پھاڑ کر برابر کر دیں۔ (۲) جو مشرک کبھی توبہ کر سکتے ہیں اور شرک سے ان کی رہائی ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ ایسے ہیں کہ گویا ان کو کسی ہوائی طوفان نے دُور پھینکدیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ موت سے بچ جائیں اور صحیح سالم گھر لوٹ آئیں۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ تشبیہ مرکب بہ مرکب ہے۔ مشبہ بہ تو وہ شخص ہے جو آسمان سے گرے اور پرندے اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں، اور ہوائیں اس کو دور و دراز لیجا کر پھینکدیں۔ اور کسی تدبیر سے

وہ خود کو نہ بچا سکے، اسکی ہلاکت یقینی ہے، خواہ پرندے نوچ لیں یا پستی میں گر پڑے۔ اسی طرح مشرک بھی جب رفعت توحید سے گر پڑا تو اب اسکی ہلاکت یقینی ہے، خواہ مجاہدین اس کی بوٹیاں اڑادیں یا ملائکۃ اللہ اس کو جہنم میں پھینکدیں۔ شرک کے ساتھ نجات کی کوئی تدبیر سود مند نہوگی۔ اور اسکی ہلاکت میں بھی کوئی شک نہیں۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ کافروں کے اعمال کو آسمان سے گرنے والے کیساتھ تشبیہ دیگئی ہے۔ کفار کے اعمال بھی برباد ہوجائیں گے۔ اور کوئی تدبیر سود مند نہوگی جس طرح آسمان سے گرنے والے کے بچاؤ کی ہر تدبیر اکارت ہوجاتی ہے۔ اور ہلاکت سے اس کو کسی طرح نہیں بچا سکتی۔

حضرت براؓ بن عازبؓ کی طویل حدیث میں ہے کہ موت کے بعد فرشتے کافر کی روح کو آسمانِ دنیا تک لیجاتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں تو کافر کی روح کے لئے دروازہ نہیں کھولا جاتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الآیۃ تلاوت فرمائی، اور فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اس کی کتاب سجین میں لکھدو۔ پھر حکم خداوندی کے موافق اس کی روح کو آسمان سے پھینکدیا جاتا ہے۔ اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ الخ تلاوت فرمائی۔

(٣٦٠) یعنی جن لوگوں نے ہماری آیات وہدایات کو جھٹلادیا۔ اور ان کے مقابلہ میں تکبر سے پیش آئے، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔ تفسیر بحرِ محیط میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کی ایک تفسیر یہ نقل کی گئی ہے کہ نہ ان لوگوں کے اعمال کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے نہ ان کی دعاؤں کے لئے یعنی ان کی دعائیں قبول نہ ہوں گی۔ اور ان کے اعمال اس مقام پر جانے سے روکدیئے جائیں گے۔ جہاں مؤمنین کے اعمال محفوظ رکھے جاتے ہیں جس کو قرآن پاک نے علیین کہا ہے اور قرآن پاک کی ایک دوسری آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہے کہ:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ۔ ‖ (اچھے کلمات اللہ کے پاس پہونچتے ہیں اور نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے)

یعنی انسان کے اعمالِ صالحہ اس کا سبب بنتے ہیں کہ کلماتِ طیبات کو رفعت حاصل ہو اور حاصل بارگاہِ ایزدی تک قبولیت کے لئے اُن کی رسائی ہو۔

ایک اور روایت میں حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابۂ کرامؓ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ کفار و مشرکین کی روحوں کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، اور وہ روحیں وہیں سے نیچے پٹک دیجائیں گی۔ جیساکہ حضرت براء بن عازبؓ کی طویل روایت کا ٹکڑا اوپر (٣٥٩) میں آچکا ہے۔

وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ط اس لفظ يَلِجُ کا مصدر وُلُوج

ہے۔ جسکے معنی تنگ جگہ میں گھسنے کے ہیں۔ اور سَمّ سوئی کے سُوراخ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کفار و مکذبین جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جبتک کہ اونٹ جیسا عظیم الجُثّہ جانور سوئی کے سوراخ میں نہ گھس جائے۔ یہ تعلیق بالمحال ہے۔ یعنی جس طرح سوئی کے سُوراخ میں اونٹ کا گھس جانا عادۃً محال ہے۔ اسی طرح مکذبین و منکرین کا جنت میں جانا محال ہے۔ اس تعلیق بالمحال سے کفار کے عذاب جہنم کا دوام بیان کرنا مقصود ہے۔ آگے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ الخ سے ان لوگوں کے عذابِ جہنم کی مزید شدت کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ ہر طرف سے اُن کو عذاب محیط ہوگا جس طرح اوڑھنا بچھونا آدمی کو محیط ہوتا ہے۔ مِہاد کے معنی فرش اور بچھونا۔ اور غواشٍ غاشیۃ کی جمع ہے۔ جس کے معنی ڈھانپ لینے والی چیز کے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں کفار کی جنت سے محرومی کا بیان تھا جس کو وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ پر ختم کیا گیا۔ اور دوسری آیت میں ان کے عذابِ جہنم کا ذکر ہے جس کا خاتمہ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ہے۔ یہ اول کی بہ نسبت اشدیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جنت سے محرومی بھی مصیبت ہے۔ مگر عذاب جہنم میں گرفتاری اس سے بڑی مصیبت ہے۔

ان آیات کے بعد حضرتِ مؤلف رحؒ نے متفرق آیات سے اقتباس کرکے ایک ایسی عبارت پیش کی ہے جسمیں توحید خالص کا بیان اور شرک کی انواع واقسام کا رد موجود ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے قرآن مقدس کی آیات میں سے سب سے زیادہ عظیم الشان آیت "آیت الکرسی" کی طرف اشارہ فرمایا جس کی احادیث میں بڑی فضیلتیں اور برکتیں وارد ہوئی ہیں۔

اس آیت مقدسہ میں اللہ جل شانہٗ کی توحید وصفات کا بیان ایک عجیب وغریب انداز میں کیا گیا ہے اس میں اللہ جل شانہٗ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع وبصیر ہونا، متکلم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم وباقی ہونا، کائنات کا موجد وخالق ہونا، تغیرات و تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ومختار ہونا، ایسا صاحب عظمت وجلال ہونا کہ جس کے آگے کوئی بغیر اجازت لب نہ ہلا سکے۔ ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے عالم کو پیدا کرنے، باقی رکھنے، حفاظت کرنے اور اسکے محکم نظام کو قائم رکھنے میں اس کو کوئی دِقت، سُستی اور تھکان پیش نہیں آسکتی، ایسے علم محیط والا ہونا کہ جسکے آگے کھلی یا چھپی کوئی شئی، کائنات کا کوئی ذرّہ اور قطرہ پوشیدہ نہ رہے۔ اس آیت پاک کا یہ اجمالی مفہوم ہے۔ اب قدرے تفصیل سے اس کے الفاظ کا مفہوم بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

آیۃ الکرسی کا تفصیلی مفہوم

اس آیت میں دس جملے ہیں۔ پہلا جملہ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے۔ اس میں لفظ اللہ اسم ذات ہے۔ جس کا مفہوم ہے "وہ ذات جو تمام صفات کمالیہ کو جامع اور جملہ نقائص سے

پاک ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں اس کا بیان ہے کہ عبادت کا مستحق اللہ ہی ہے۔ اسکے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں۔

دوسرا[2] جملہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ہے۔ اس میں لفظ حَیّ (زندہ) لاکر یہ بتا دیا کہ وہ ہمیشہ زندہ و باقی اور موت، سے بالاتر ہے۔ لفظ قَیّوم (تھامنے والا) قیام سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں۔ اسم فاعل قائم بمعنی کھڑا ہونے والا۔ اسی سے قَیَّام و قَیُّوْم مبالغے کے صیغے ہیں۔ ان کے معنی ہیں "وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے۔" قیوم حق تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔ تمام کائنات اپنے وجود اور اپنی بقار میں خود محتاج ہے۔ اور جو چیز خود دوسرے کی محتاج ہو وہ دوسرے کو کیا سنبھال سکتی اور قائم رکھ سکتی ہے؟ اس لئے اللہ کے سوا کسی کو قیوم کہنا جائز نہیں۔ اسی لئے جو لوگ عبدالقیوم نام کو بگاڑ کر قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔ بہت سے حضرات کے نزدیک اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کا مجموعہ اسم اعظم ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے غزوۂ بدر کے موقع پر ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں، آپ کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں آپکے پاس پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں ہیں اور بار بار یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ، یَاحَیُّ قَیَّامُ فرما رہے ہیں۔

تیسرا[3] جملہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ہے۔ لفظ سِنَةٌ بکسر السین اونگھ کو کہتے ہیں۔ جو نوم کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں۔ اور نوم مکمل نیند کو کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ اونگھ اور نیند (اور ہر نوع کی غفلت) سے بری و پاک ہیں۔ پچھلے جملہ میں لفظ قیوم سے معلوم ہو گیا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ، آسمانوں، زمینوں اور تمام کائنات کو سنبھالنے والے ہیں۔ اور تمام عالم انہیں کے سہارے پر قائم ہے۔ تو ایک انسان کا خیال اپنی فطرت کے مطابق اس طرف جا سکتا تھا کہ جو ذات اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونی چاہیئے۔ اور کچھ وقت نیند اور آرام کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اس مذکورہ جملہ میں محدود علم و بصیرت اور ناقص قدرت و قوت رکھنے والے انسان کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوق کے اوپر قیاس نہ کرے۔ اسکو مخلوق کی طرح نہ سمجھے۔ وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ تمام کام نہ کچھ مشکل ہیں اور نہ اس کے لئے تھکان کا سبب ہیں۔ اس کی ذاتِ عالی اونگھ، نیند، تعب اور تھکان سے بالاتر ہے۔ آیت میں سِنَةٌ کو نَوْمٌ سے پہلے اس لئے ذکر فرمایا کہ وجودِ خارجی کے اعتبار سے اونگھ نیند سے پہلے ہوتی ہے۔ جو دماغی اعصاب کی وہ سستی ہوتی ہے جو نیند کا پیش خیمہ اور مقدمہ بنتی ہے۔ اور نوم اس اِسترخائی کیفیت کو کہتے ہیں جو مرطوب بخارات کے چڑھنے سے دماغی اعصاب میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پٹھوں کے اسی ڈھیلے پن کیوجہ سے حواسِ ظاہری معطل ہو جاتے ہیں۔ اس جملۂ مذکورہ میں حق تعالیٰ کی صفتِ سلبیہ کا اظہار ہے

جس سے مخلوق سے اُس کی مشابہت کی نفی ہو رہی ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تائید و تاکید ہے۔ بلکہ ہر جملہ لاحقہ جملہ سابقہ کی دلیل ہے۔ الحیّ القیوم، لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کی، اور لَا تَاْخُذُہٗ الحیّ القیوم کی دلیل ہے۔ اور مؤکد و تاکید اور دلیل و مدلول میں کمالِ اتصال ہوتا ہے۔ اسی لئے حرفِ عطف درمیان میں نہیں لایا گیا۔ جو مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اگلے جملوں میں بھی ترکِ حرفِ عطف کی یہی وجہ ہے فتأمّل — چوتھا جملہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ہے۔ اس میں لَہٗ کا لام تملیک کے لئے اور مبتدا پر اسکی تقدیم حصر کیلئے ہے۔ معنیٰ یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں بلا شرکتِ غیرے اس کی ملک میں ہیں۔ وہی ان کا مالک و متصرف مختار ہے۔ یہ جملہ توحید و قیومیت کی دلیل ہے۔

پانچواں جملہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ہے۔ اس میں عظمتِ خداوندی کا بیان ہے۔ کہ کوئی اس کے برابر و ہمسر نہیں۔ اس لیے اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے کون کسی کی سفارش کر سکتا ہے؟ جبکہ وہی مالکِ کائنات ہے۔ کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حاکم نہیں۔ تو اس سے کوئی باز پرس بھی نہیں کر سکتا۔ وہ حکم جاری فرمائے تو کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا۔ ہاں جن کو اجازت ہوگی وہ شفاعت کرنے کی جرأت کر سکیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کرونگا۔ اسی کا نام مقامِ محمود ہے۔ جو آپ کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو مخلوق کے تمام اگلے پچھلے حالات کا علم ہے۔ اگلے پچھلے حالات کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے سامنے جو حالات کھلے ہوئے ہیں اور جو ان سے پوشیدہ ہیں حق تعالیٰ کو سب کا علم ہے۔ یعنی انسان کا علم تو بعض چیزوں ہی سے متعلق ہے۔ اور حق تعالیٰ کا علم تمام اشیاء کو محیط ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ سے مراد وہ کام ہیں جو کیے گئے۔ اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد وہ امور ہیں جو نہیں کیے گئے۔ اور آیت وسیع المعنی ہے۔ تینوں مفہوم اس میں بیکوقت داخل ہیں۔ اس جملہ میں ضمیر هُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کی جانب راجع ہے۔ جو عقلاء و غیر عقلاء دونوں کو شامل ہے۔ لیکن عقلاء کو غیر عقلاء پر غلبہ دیکر ضمیر (ھم) ذکر کر دی۔ جو عقلاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور غیر عقلاء ان کے ضمن میں آگئے۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ ضمیر ھم لفظ ذَا کی طرف راجع ہو جو مَنْ ذَا الَّذِيْ میں ہے اور ذَا سے مراد اہلِ شفاعت یعنی انبیاء و ملائکہ علیہم السلام ہوں۔

ساتواں جملہ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ہے۔ یعنی انسان اور تمام مخلوقات علمِ الٰہی کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ہاں جتنا حصہ وہ کسی کو عطا فرمانا چاہیں مخلوق میں سے

کسی کو صرف اتنا ہی علم ہو سکتا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔ انسان یا کوئی اور مخلوق اس میں شریک نہیں۔ (اور جو اللہ کے نبی یا ولی کے لئے علم محیط مانے وہ بلا شبہ مشرک اور اس آیت کے علاوہ بیشمار آیات و احادیث کا منکر اور کافر ہے)

وَلَا يُحِيْطُوْنَ میں واوٗ حالیہ اور يَعْلَمُ کی ضمیر فاعلی ذو الحال ہے۔ یا واوٗ عاطفہ ہے۔ دونوں جملوں کا مجموعہ بتا رہا ہے کہ علم محیط و ہمہ گیر علم ذاتی اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و یکتائی اور معبودیت کی دلیل ہے۔

آٹھواں جملہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ہے۔ یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے کہ اس کی وسعت میں ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ یہ محض تمثیل ہے جس سے اللہ جل شانہٗ کی عظمت کی تصویر کشی مقصود ہے۔ ورنہ واقع میں نہ اللہ کی کرسی ہے۔ اور نہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس قسم کی آیاتِ متشابہات ہیں، جن کی حقیقی مراد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ان کی حقیقت و کیفیت کا ادراک عقلِ انسانی سے بالاتر ہے۔

کرسی کیا ہے؟

البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش و کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں۔ جو تمام آسمانوں اور زمینوں سے بدرجہا بڑے ہیں۔ محدثین کا مشہور قول یہی ہے۔ کہ کرسی ایک جسم ہے۔ (جس میں طول و عرض و عمق ہے) بغویؒ کہتے ہیں کہ کرسی کے مصداق میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسنؒ کا قول ہے کہ عرش و کرسی دونوں ایک ہی شئی کے دو نام ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ کرسی عرش کے سامنے قائم ہے۔ اور آیت وَسِعَ كُرْسِيُّهُ الخ کا مطلب یہ ہے کہ کرسی کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کی برابر ہے۔ ابن کثیرؒ نے ابوذر غفاریؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرسی کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی چھلا پڑا ہو۔ اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے مقابلہ میں کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے کسی بیابان میں انگشتری کا حلقہ۔ یعنی کرسی کو زمین و آسمان کے مقابلہ میں جتنی عظمت حاصل ہے اتنی ہی عرش کو کرسی کے مقابلہ میں عظمت اور بڑائی حاصل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ کرسی کے اندر ساتوں آسمان ایسے ہیں جیسے ڈھال میں سات درہم ڈال دیئے جائیں۔ حضرت علیؓ و مقاتلؒ کہتے ہیں کہ کرسی کے ہر پایہ کا طول ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے برابر ہے اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہر فرشتے کے چار منہ ہیں۔ ان فرشتوں کے قدم ساتویں نچلی زمین کے نیچے پتھر پر ہیں۔ یہ مسافت پانچسو برس کی

راہ کے برابر ہے۔ ایک فرشتہ صورتِ آدمؑ پر ہے۔ جو سال بھر آدمیوں کے لئے روزی کی دُعا کرتا رہتا ہے۔ دوسرا بیل کی صورت پر ہے۔ جو چوپاؤں کے لئے روزی کی دُعا کرتا رہتا ہے لیکن جب سے گوسالہ کی پرستش ہوئی اس کے چہرہ پر خراشیں ہوگئی ہیں۔ تیسرا فرشتہ شیر کی صورت پر ہے جو سال بھر درندوں کے رزق کی دُعا کرتا ہے۔ چوتھا فرشتہ گِدھ کی صورت پر ہے۔ جو پرندوں کے رزق کے لئے سال بھر دُعا کرتا رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (مظہری)

بعض احادیث میں ہے کہ حاملینِ عرش اور حاملینِ کرسی کے درمیان سَتّر حجاب تاریکی کے اور ستّر حجاب نور کے ہیں۔ اور ہر حجاب کی موٹائی پانچسو برس کی راہ کی برابر ہے۔ اگر یہ حجابات نہوں تو کرسی کے اٹھانے والے عرش کو اٹھانیوالوں کے نور سے سوختہ ہو جائیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ دراصل کرسی صرف اتنی جگہ کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ نشستگاہ سے فاضل جگہ کو کرسی نہیں کہا جاتا۔ گویا لفظ کرسی کرس سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کے اجزاء کو باہم جوڑ دینے کے ہیں۔ کرسی، عرش اور بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں خصوصی جلوۂ الٰہی کے لئے مخصوص ہیں۔

سعید بن جبیرؒ کی روایت ہے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ کرسی سے مراد علم ہے۔ مجاہدؒ کا بھی یہی قول ہے۔ صحیفۂ علمی کو کرّاسہ اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ کرسی سے مراد اقتدار و حکومت ہے۔ موروثی حکومت کو اہلِ عرب کرس کہتے ہیں لیکن اگر یہ بات صحیح مان لی جائے کہ کرسی سے مراد علم و اقتدار ہے تو لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ اِلٰی وَمَا خَلْفَهُمْ کے بعد اس جملہ (وَسِعَ كُرْسِيُّهُ) کا ذکر بے سود ہوگا۔ کیونکہ یہ تو سابق کے دونوں جملوں (لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ الخ اور يَعْلَمُ الخ) سے معلوم ہو چکا تھا

علمائے ہیئت کی تحقیق

حضرت ابوذرؓ کی روایتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ کرسی آسمانوں کو اور عرش کرسی کو محیط ہے۔ اسی طرح ہر اوپر والا آسمان نیچے والے کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس کا تقاضا ہے کہ ہر آسمان کُروی ہو۔ اسی لئے بعض لوگوں نے آٹھواں آسمان کرسی کو اور نواں عرش کو قرار دیا ہے لیکن قرآن پاک نے آسمانوں کی تعداد سات بتائی ہے۔ اور عرش و کرسی کا شمار آسمانوں میں نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انکی ماہیت آسمانوں سے جدا ہے۔ اور خاص تجلیات کے لحاظ سے ان دونوں کو آسمانوں کے مقابلہ میں امتیاز حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔

قدیم علمِ ہیئت کے یونانی و مصری علماء کہتے تھے (جیسا کہ سبع شداد و شرح چغمینی وغیرہ کتب میں مذکور ہے) کہ مجموعۂ عالم کی شکل کُروی ہے۔ گویا یہ کائنات ایک پیاز کی گانٹھ ہے۔ جس کے

تیرہ پرت ہیں۔ اور ہر چھلکا اپنے اندرونی چھلکوں کو محیط ہے۔ جو سب کو محیط ہے وہ فلکُ الافلاک یا فلکِ اطلس ہے۔ اسکے نیچے فلکِ ثوابت، اسکے نیچے فلکِ زحل پھر فلکِ مشتری پھر فلکِ مریخ پھر فلکِ شمس پھر فلکِ زہرہ پھر فلکِ عطارد پھر فلکِ قمر یعنی فلکِ دنیا ہے۔ یہ نو فلک ہوئے۔ پھر فلکِ قمر کے نیچے کرۂ نار ہے۔ اسکے نیچے کرۂ ہوا، اور ہوا کے نیچے پانی اور پانی کے نیچے زمین ہے۔ اور یہی زمین مرکزِ عالم ہے۔ قدیم علمائے ہیئت نے افلاک کو تہ برتہ مانا ہے۔ قرآنِ مجید و احادیثِ مقدسہ میں عرش و کرسی اور سبع سموات کے الفاظ آئے ہیں۔ اور سبع سموات کے ساتھ طباقًا کا لفظ بھی مذکور ہے۔ کچھ علمائے اسلام نے یونانی ہیئت و فلسفہ کو ماننے میں اتنا غلو کیا ہے کہ عبارتِ قرآن کو بھی اسکے مطابق بنانے کی مکروہ کوشش کی، اور کچھ احادیث کے اشارات یا صراحتوں کو اپنے مطلب کی تائید میں لاکر ضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا کا مصداق بن گئے۔ اور طباقًا کا ترجمہ تہ برتہ کر کے کرسی کو آٹھواں اور عرش کو نواں آسمان قرار دیدیا۔ جیساکہ پندنامۂ عطار میں ہے ؎

آنکہ آمد نہ فلک معراجِ او = انبیاؑ و اولیاء محتاجِ او

لیکن فلسفۂ قدیم تو آسمانوں کو ازلی، ابدی، قدیم بالغیر اور عمر میں خدا کی برابر قرار دیتا ہے۔ انکا پھٹنا اور جوڑا جانا محال سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ تو عناصر کو بھی لازوال اور عالم کو بھی قدیم مانتا ہے۔ تو فلسفہ کا وہ کونسا فکریہ اور عقیدہ ہے جو قرآن و حدیث سے موافقت کر سکتا ہے۔ پھر سلسلۂ عالم کی ترتیب میں قرآن و حدیث کی عبارتوں کو فلسفہ سے ملانے کی کوشش کرنا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں فلسفہ وہیئت کو قرآن کے مطابق بناتے تو یہ کاوش قابلِ برداشت تھی، مگر قرآن کی آیات کو توڑ مروڑ کر بیجا تاویلات اور تفسیر بالرائے کے ذریعہ اس فلسفہ اور ہیئت کے تابع بنا دینا جن کے اصول نہایت لچر، بودے اور ناقابلِ تسلیم ہیں، ظلمِ عظیم نہیں تو کیا ہے۔؟ فلاسفہ خود ایک دوسرے کی تردید اور جدید فلاسفہ قدیم حکماء کی تکذیب و تحمیق کرتے ہیں۔

موجودہ سائنس نہ افلاک کو محیط مانتی ہے۔ نہ سات آسمان تسلیم کرتی ہے۔ وہ تو دس کروڑ آسمان اور تیس کروڑ زمینیں قرار دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فطری ضابطۂ جذب کے زیرِ اثر چالیس کروڑ گیندیں خلاء میں معلق ہیں۔ کوئی اونچی نظر آتی ہے تو کوئی نیچی۔ حالانکہ واقع میں نہ کوئی اونچی ہے نہ نیچی۔ کیونکہ جب کوئی منتہیٰ نہیں تو فوق و تحت کا تصور ہی ممکن نہیں۔ ہر کرہ کا فاصلہ دوسرے کرہ سے لاکھوں کروڑوں میل کا ہے۔ بلکہ بعض کا فاصلہ تو ناقابلِ احاطہ ہے۔ اسکا حساب کرنے سے علمِ حساب عاجز ہے۔ کوئی کرہ اتنا چھوٹا ہے کہ ایک رات دن میں اس کی دوری حرکت پوری ہو جاتی ہے۔ اور کوئی اتنا بڑا کہ پچیس یا پچاس ہزار میں پوری ہوتی ہے۔ یہ ساری فضا مادۂ سیال یا چمکدار برقیات سے پُر ہے۔ ہر کرہ اپنے محور پر گھوم رہا ہے۔ زمین گردش میں ہے۔

بڑے بڑے سات ستارے چاند، سورج، مریخ، زحل، مشتری، عطارد اور زہرہ ہیں۔ وغیرہ۔
پھر چالیس کروڑ کروں میں بھی کائنات کا حصر نہیں۔ جتنا معلوم ہے وہ نامعلوم سے بہت کم ہے۔
اور ان معلومات کا بھی ظن وتخمین پر مدار ہے۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ
شَیْئًا۔ لیکن قرآنی حقائق اپنی جگہ پر ثابت و ناقابلِ تغیر ہیں۔
قرآن پاک میں سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کلمہ حصر نہیں۔ طِبَاقًا اور طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کا ترجمہ تہ برتہ نہیں بلکہ درجہ
بدرجہ ہے۔ حدیثِ معراج میں ہر دو آسمانوں کے درمیان کا فاصلہ پانچسو برس کی راہ کے برابر بتایا گیا
ہے۔ کرسی کا سبع سمٰوٰت کو محیط ہونا جسًّا بھی ہو سکتا ہے۔ اور اقتدار وحکم اور عظمت وبزرگی کے
اعتبار سے بھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ماخوذ از حواشی مظہر حق اردو)
نواں جملہ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُهُمَا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر آسمان وزمین جیسی دو عظیم مخلوقات
کی حفاظت کچھ گراں نہیں ہوتی۔ یا ھُمَا سے مراد کرسی اور وہ چیزیں (آسمان زمین) ہیں، جو کرسی میں
سمائی ہوئی ہیں۔ اِس جملہ میں حق تعالیٰ کی وسعتِ قدرت کا بیان ہے جیسا کہ اس سے پہلے اس کے
عظمت وجلال اور وسعتِ علمی کا بیان تھا۔
دسواں جملہ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ یعنی وہ عالیشان وعظیم الشان ہے۔ ہر مثل ونظیر سے برتر وبالا
ہے۔ اس کی ذات وصفات وغیرہ کسی چیز میں بھی کوئی اُس جیسا نہیں۔ وہ ایسی عظمت والا ہے کہ اسکے
مقابلہ میں ہر چیز بے مقدار اور ہیچ در ہیچ ہے۔ پچھلے نو جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے
کمالات بیان ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد عقل والا ہر انسان یہی کہنے پر مجبور
ہوگا کہ ہر عزت وعظمت اور بلندی وبرتری کا مالک وہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔
(۲) اَلْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ الخ یہ سورۂ اخلاص کا اقتباس وخلاصہ ہے۔ سورۂ اِخلاص کے نزول
کا سبب یہ ہوا کہ مشرکین مکہ نے اللہ تعالیٰ کا نسب پوچھا تھا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ سوال یہودِ مدینہ نے کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس سورۃ کے مکیہ اور مدنیہ ہونے میں اختلاف ہے۔ عبد اللہ
ابن مسعود حسن بصری، عطاء، عکرمہ اور جابر وغیرہم رضی اللہ عنہم نے اس کو مکیہ کہا ہے۔ اور قتادہ
ضحاک وغیرہ نے مدنیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دونوں قول منقول ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ
مشرکین کے سوال میں یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ سونے چاندی کا یا کسی اور
چیز کا۔ اس پر یہ سورۃ اخلاص نازل ہوئی۔ جس میں حق تعالیٰ کا مکمل تعارف ہے۔ احادیث
میں اس سورت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں۔
قُلْ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اللہ کی
جانب سے خطاب اور امر ہے کہ آپ لوگوں کو یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (وہ اللہ یکتا ہے)

لفظ اللّٰہ یہ ذاتِ واجب الوجود جامع کمالات کا نام ہے۔ اَحَدٌ لفظ واحد واحد کا ترجمہ ایک ہی کیا جاتا ہے۔ مگر اَحد کے معنی میں یہ بھی ہے کہ وہ ترکیب و تجزیہ اور تعدّد سے نیز کسی چیز کی مُشابہت و مُشاکلت سے پاک ہے۔ اسلئے اَحَد کا ترجمہ "یکتا" کرنا چاہیئے۔ یہ ان لوگوں کا جواب ہوگیا جو یہ پوچھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کس مادّہ سے بنا ہے، سونے سے یا چاندی وغیرہ سے۔ بلکہ غور کیا جائے تو ہر قسم کے شرک کی اس سے تردید ہوجاتی ہے۔ گویا اس مختصر جملہ میں ذات وصفات کی تمام مباحث موجود ہیں۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ لفظ صمد کے بہت سے معنیٰ ہیں۔ اسی لئے اس میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ امام طبرانیؒ نے کتاب السُّنّۃ میں ان سب اقوال کو ذکر کر کے فرمایا ہے کہ یہ تمام اقوال صحیح ہیں۔ اور ہمارے رب میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ لیکن صَمد کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجات وضروریات میں رجوع کریں۔ اور جو عظمت اور بڑائی میں ایسا ہو کہ اس جیسا یا اس سے بڑا کوئی نہ ہو۔ یعنی سب اسکے محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہو۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ۔ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نسب کے بارے میں سوال کیا تھا کہ اس کو مخلوق پر قیاس نہ کرو۔ اس کو نہ ماں باپ کی احتیاج ہے نہ اولاد اور بیوی کی۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ یہ ان لوگوں کا رد ہے۔ جو مخلوق سے حق تعالیٰ کی مُشاکلت ومُشابہت کے وہم میں گرفتار ہیں۔ کفو کے معنی مِثل ومُماثِل کے آتے ہیں۔

دراصل دنیا میں مشرکین ومنکرینِ توحید کی مختلف اقسام ہیں۔ سورۃ اخلاص نے ہر نوع کے مشرکانہ خیالات ومعتقدات کی مکمل تردید کر کے توحیدِ کامل کا درس دیا ہے۔ منکرینِ توحید کا ایک گروہ تو وجودِ باری ہی کا منکر ہے۔ بعض وجود کے قائل تو ہیں مگر وجوبِ وجود کے قائل نہیں۔ بعض دونوں کے قائل ہو کر کمالاتِ صفات کے منکر ہیں۔ بعض یہ سب کچھ مانتے ہوئے غیر اللہ کو عبادت میں حق تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اِن سب فاسد خیالات کا رد اَللّٰہُ اَحَدٌ میں ہوگیا۔ بعض لوگ عبادتِ خداوندی میں غیر اللہ کو شریک نہیں مانتے۔ مگر غیر اللہ کو کارساز وحاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں۔ لفظ صمد سے ان کی بھرپور تردید کردی گئی۔ بعض لوگ اللہ کی اولاد کے قائل ہیں، تو لَمْ یَلِدْ الخ سے ان کا رد ہوگیا۔ اور آخری جملہ سے مضمونِ سابق کی تاکید کردی گئی۔ یہ سورۂ اخلاص کی اِجمالی تفسیر ہے۔ تمام امورِ مذکورہ کی تفصیلات درسی تفسیر پارہ نمبر ۳۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (شوریٰ آیت ۱۱) یعنی کوئی چیز اسکے مثل نہیں، اور وہی ہر بات کو سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔ بخلاف دوسروں کے کہ اُن کا سننا اور دیکھنا محدود ہے۔

اور اللہ کے مقابلہ میں اُن کے سمع و بصر کالعدم ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہٗ کی تین صفاتِ کمالیہ کو بیان فرمایا گیا۔ وہ عظمتؔ وقدرت وغیرہ میں مخلوقات سے وراء الوراء ہے، اسکے مشابہ و مماثل کوئی نہیں۔ اور اسکا سننا اور دیکھنا دائم و محیط ہے۔

(۴) بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ اِلٰی قولہٖ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿ (سورۃ الانعام آیت ۱۰۱ و ۱۰۲ و ۱۰۳) یعنی وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے۔ بدیع بمعنی مُبتَدِع ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں بغیر نمونہ و مثال کے عدم سے وجود میں لانے والا۔ اِس سے شریک کی نفی ہوگئی۔ کیونکہ وہ مُوجد اکیلا ہے۔ تو معبود بھی وہی ہوگا۔ دوسرے کو معبود بننے کا کوئی حق نہیں۔

اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهٗ الۡوَلَدُ۔ یعنی اللہ کے اولاد کہاں سے اور کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اسکی بیوی ہی نہیں۔ اور صمد کی شایانِ شان بھی نہیں کہ اس کو بیوی یا اولاد کی احتیاج ہو۔ اس سے ان یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی تردید ہوگئی جو حق تعالیٰ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرتے تھے۔

وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ الخ یعنی جس طرح اُس نے آسمان و زمین کو اور انسانوں کو پیدا کیا اسی طرح اس نے ہر چیز کو اپنی قدرت سے صحیح اندازہ پر پیدا فرمایا ہے۔ پھر جس طرح وہ اپنی خالقیت کی صفت میں یکتا ہے۔ اسی طرح وسعتِ علم میں بھی بے مثال ہے کہ وہ ہر چیز کو ہمہ وقت خوب جانتا ہے۔ ازلاً بھی ابداً بھی۔ اس وصف میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور تخلیق بغیر علم ہو نہیں سکتی۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ اس کے سوا اور کوئی خالق نہیں۔ اور اسکے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں

آیت سے چند طریقوں پر وَلَدِیَّتؔ کی نفی ہو رہی ہے۔

(۱) آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کی بے نظیر مخلوقات ہیں۔ اگرچہ دوسری مخلوق جنسیت میں آسمان و زمین سے شرکت رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں طویل البقاء ہیں۔ اور مدّتِ طویلہ سے ایک ہی حالت پر قائم ہیں، اور زمانۂ طویل تک اسی طرح قائم رہیں گے اسلئے وہ اولاد سے بے نیاز ہیں۔ اولاد کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جس کی مدّتِ حیات محدود و مختصر ہوتی ہے۔ اور زمین و آسمان کی ہستی گو لازوال اور دوامی نہیں، صرف ان کی مدّتِ بقا طویل ہے۔ اسلئے ان کو اولاد کی احتیاج نہیں اور اللہ جلّ شانہٗ کی ہستی تو واجبُ الوجود، لازوال و غیر فانی ہے۔ اس کا اولاد سے بے نیاز ہونا تو بہت ہی ظاہر اور بالکل ہی ضروری ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ چھوٹے بڑے تمام اجسام کا خالق ہے تو خود وہ جسم نہیں ہوسکتا ہے۔ اور وَلَدِیَّتؔ وَالِدِیَّت جسم کی خصوصیت ہے۔ وہ جسم سے پاک ہے تو وَالِدِیَّت وَوَلَدِیَّت سے بھی مبرّا ہے۔

(۳) اولاد دو ہم جنسوں کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے (ہم جنس) نر و مادہ کی ضرورت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا نہ کوئی قدیم و واجب ہے اور نہ غیر مخلوق۔

(۴) بچہ باپ کا کفو اور مثل ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کے سوا ہر چیز مخلوق ہے۔ اسلئے اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں۔

(۵) اللہ ہر چیز کا عالِم ہے۔ اور اسکے سوا کوئی بھی محیط و ہمہ گیر علم نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ ولد۔ ورنہ وہ بھی ایسا ہی وسیع العلم ہوتا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (یہ ہے اللہ تمہارا رب، اسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے) یہ سب ذٰلِكُمْ مبتدا کی خبریں ہیں۔ یا بعض خبریں اور بعض بدل یا صفت اور الگ الگ جملے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔

جس ذاتِ گرامی میں مذکورہ صفات سلبیہ و ثبوتیہ ہیں وہی معبود برحق و خالقِ خلق ہے۔

فَاعْبُدُوْهُ (لہٰذا اسی کی عبادت کرو۔ اس میں فاء سببیہ ہے۔ اور کلامِ سابق علتِ عبادت ہے۔ یعنی اوصافِ مذکورہ کے ساتھ صرف باری تعالیٰ کی ذات متصف ہے لہٰذا وہی عبادت کا مستحق ہے۔ کسی اور کو استحقاقِ عبادت نہیں۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (وہی ہر چیز کا کارساز یعنی ہر چیز کا نگراں اور نظم کا ذمہ دار ہے) مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے سب کاموں کو بنانے والا اور نگران و ذمہ دار ہے۔ لہٰذا تم اپنے سب کام اسی کے سپرد کرو، اسی پر بھروسہ کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ عبادت سے نقصان ہوگا یا دنیا بگڑ جائیگی، یا اس کے سوا اور کسی کی خوشامد و عبادت کی ضرورت ہوگی۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (اس کو نگاہیں محیط نہیں ہوسکتیں اور وہ تمام نگاہوں کو محیط ہے اور وہی باریک بین و باخبر ہے) اس مختصر آیت میں حق تعالیٰ کی مخصوص دو صفتوں کا بیان ہے۔

اوّل صفت یہ ہے کہ ساری کائنات میں سے کسی کی نگاہیں بلکہ سب کی نگاہیں اس کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔ حضرتِ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دنیا کے تمام انس و جن اور ملائکہ و شیاطین جب سے وہ پیدا ہوئے اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے سب ملکر ایک صف میں کھڑے ہوجائیں (اور اپنی نگاہوں سے حق تعالیٰ کی ذات کا احاطہ کرنا چاہیں) تو اس کی ذات کا احاطہ اپنی نگاہوں سے نہیں کرسکتے۔ (مظہری)

اور یہ خاص صفت حق تعالیٰ ہی کی ہوسکتی ہے۔ ورنہ تو نگاہ کو باری تعالیٰ نے وہ طاقت بخشی ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی چھوٹی سے چھوٹی آنکھ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز کو دیکھ سکتی ہے اور احاطہ کرسکتی ہے۔ مثلاً آفتاب و مہتاب کتنے بڑے بڑے کرے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ساری دنیا کی کوئی حیثیت نہیں، مگر ہر انسان بلکہ حقیر سے حقیر جانور کی نگاہ آفتاب و مہتاب جیسے کروں کا

احاطہ کرلیتی ہے۔ درحقیقت نگاہ تو حواس میں سے ایک حاسّہ ہے جس سے محسوس چیزوں کا علم ہوجاتا ہے اور ذاتِ خداوندی تو عقل و وہم کے احاطہ سے بھی وراء الورا ہے۔ حاسہ بصر کی یہاں تاب کہاں ؎

تو دل میں آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا = بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

حق تعالیٰ کی ذات و صفات غیر محدود ہیں، اور انسانی حواس و عقل و خیال سب محدود ہیں۔ ظاہر ہے کہ غیر محدود کسی محدود میں نہیں سما سکتا۔ اسی لئے دنیا کے عقلاء اور حکماء جنہوں نے عقلی دلائل سے خالق کائنات کا پتہ لگانے اور اس کی ذات و صفات کے اِدراک کے لئے اپنی عمریں بحث و تحقیق میں صرف کیں — اور صوفیائے کرام جنہوں نے کشف و شہود کے راستہ سے اِس میدان کی سیاحت کی سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی ذات و صفات کی حقیقت کو نہ کسی نے پایا نہ پاسکتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

دور بینانِ بارگاہِ اَلَست = غیر ازیں پے نہ بُردہ اند کہ ہست

حضرت شیخ سعدیؒ نے فرمایا ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گُم = کہ حیرت گرفت آستینم کہ قُم

رؤیتِ باری کا مسئلہ

انسان کو حق تعالیٰ کی زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں تمام علمائے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ عالمِ دُنیا میں تو ذاتِ خداوندی کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب درخواست کی، رَبِّ اَرِنِیْ (اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرادیجئے) تو جواب میں ارشاد فرمایا لَنْ تَرَانِیْ (آپ ہرگز مجھے دیکھ نہیں سکتے) ظاہر ہے کہ جب اللہ کے کلیم کو یہ جواب ملا تو دُنیا میں زیارت ممکن نہیں۔ البتہ آخرت میں اہلِ ایمان کو کھلی آنکھوں حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ اس پر صحیح و قوی احادیثِ متواترہ کے علاوہ آیاتِ قرآنیہ بھی شاہد ہیں۔ مثلاً

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (قیامت کے دن بہت سے چہرے ترو تازہ، ہشّاش بشّاش اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) البتہ کفار و مُنکرین آخرت میں بھی بطورِ سزا دیدارِ خداوندی سے محروم ہوں گے۔ ارشاد ہے کہ:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (یعنی کفار اس دن اپنے رب کی زیارت سے محروم ہوں گے)

اور آخرت میں دیدارِ خداوندی مختلف مقامات پر ہوگا، محشر میں بھی اور جنت میں پہونچنے پر بھی جو اہلِ جنت کے لئے جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھکر ہوگا۔ پھر مقربین کو ہمہ وقت اور عام مؤمنوں کو ہفتہ میں ایک بار اور کم و بیش درجات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا کریگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے کہ تمکو جو نعمتیں مل چکی ہیں

ان کے علاوہ اور کچھ چاہیئے؟ جنتی عرض کریں گے یا اللہ آپنے ہمکو دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا (اور نعمتوں سے مالامال فرمایا) اس سے زائد ہم اور کیا چاہیں؟ اسوقت حجاب درمیان سے اٹھادیا جائیگا اور سب کو حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھکر یہ نعمت ہوگی (مسلم)

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے اور صحابۂ کرامؓ کا مجمع تھا آپنے چاند کی طرف نظر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ (آخرت میں) تم اپنے رب کو اسی طرح صاف صاف دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ ترمذی و مسند احمد میں عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو خاص درجاتِ جنت عطا فرمائیں گے ان کو صبح و شام (یعنی علی الدوام) حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا میں تو دیدارِ خداوندی محالِ شرعی ہے۔ اور جنت و آخرت میں اہلِ ایمان کو دیدارِ خداوندی ضرور حاصل ہوگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شبِ معراج میں عالمِ بالا میں باری تعالیٰ کی زیارت ہوئی وہ بھی درحقیقت عالمِ آخرت ہے۔ شیخ محی الدین بن العربیؒ نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہان کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے۔ آسمانوں کے اوپر آخرت کا مقام ہے۔ وہاں پہنچکر جو حضور علیہ السلام کو زیارت ہوئی اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جا سکتا۔

اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جب آیت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ سے معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہو ہی نہیں سکتی۔ تو پھر قیامت میں کس طرح ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے دیدارِ خداوندی کا ناممکن ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نگاہ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسکی ذات غیر محدود اور انسانی نظر محدود ہے۔ قیامت میں بھی جو زیارت ہوگی وہ محیطِ ذات نہ ہوگی۔ اور دنیا میں انسان اور اس کی نظر میں اتنی قوت نہیں کہ اس طرح کی رؤیت کو بھی وہ برداشت کر سکے۔ آخرت میں اس کو ایسی طاقتور نظر ملیگی جس سے وہ دیدار کر سکیگا مگر ذاتِ حق کا احاطہ اسوقت بھی نہ ہوگا۔

فرقہ معتزلہ دیدارِ خداوندی کا منکر ہے۔ اور اسی آیت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ سے استدلال کرتا ہے۔ ان کے استدلال کا جواب ہم دے چکے ہیں کہ اس میں اِدراک کی نفی ہے۔ رؤیت کی نفی نہیں۔ رؤیت بالاحاطہ کے (جو ادراک کے معنی ہیں) ہم بھی قائل نہیں ہیں۔ معتزلہ اس مغالطہ پر تمام نصوص کا انکار کر دیتے ہیں۔ دراصل وہ اپنی ناقص عقل کی پیروی کرتے ہیں۔ اور دیدارِ خداوندی کو محال سمجھتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس آیت سے معتزلہ کا استدلال چند وجوہ سے غلط ہے۔

(۱) لَا تُدْرِكُ مضارع کا صیغہ ہے۔ اور مضارع کی حقیقی وضع ایک قول پر حال کے لئے ہے۔ اور مستقبل کے لئے اس کا استعمال مجازی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مضارع حال و مستقبل میں وضعاً مشترک ہے۔

اوّل قول پر معنیٰ آیت کے یہ ہیں کہ حال میں یعنی دنیا میں نگاہیں اس کی زیارت نہیں کر سکتیں۔ (اگر ادراک کے معنیٰ رؤیت ہی کے لئے جائیں جیساکہ معتزلہ کا خیال ہے) استقبل کے عدم امکان پر آیت دلالت نہیں کرتی۔ اور دوسرے قول پر مضارع مشترک المعنیٰ ہے۔ اور عموم مشترک جائز نہیں۔ یعنی دونوں معنیٰ بیک وقت مراد نہیں ہوں گے۔ اور آیت سے فی الحال نفی رؤیت بالاجماع مراد ہے۔ یعنی دنیا میں رؤیت باری نہیں ہوگی۔ اس کے جواز کا کوئی قائل نہیں۔ اور جب بالاتفاق مشترک کے ایک معنیٰ مراد ہوگئے تو دوسرے معنیٰ یعنی مستقبل (آخرت) میں نفی رؤیت مُراد لینا قاعدۂ مشترک کی رو سے غلط ہے۔ لہٰذا آخرت کی رؤیت سے آیت کو کوئی تعلق نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اگر اس آیت سے علی الاطلاق (دنیا و آخرت میں) رؤیت کی نفی مراد لی جائے تو اول قول پر حقیقت و مجاز دونوں کا اجتماع اور دوسرے قول پر عموم مشترک کا ارتکاب لازم آتا ہے جو ناجائز ہے۔

(۲) اَلْاَبْصَار صیغۂ جمع ہے اسلئے اس سے جنس بصر مُراد نہیں لے سکتے بلکہ مجموعۂ افراد بصر مُراد ہوگا۔ اب اگر الف لام کو عہدی قرار دیا جائے تو اس سے مُراد دنیوی اَبصار ہیں۔ اور معنیٰ آیت کے یہ ہوں گے کہ دنیا میں تمام بینائیاں اللہ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ تو اس سے یہ کہاں نکلا کہ آخرت و جنت میں بھی مؤمنوں کی آنکھیں دیدار نہ کر پائیں گی۔ اور اگر الابصار پر الف لام اِستغراقی ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس میں استغراق کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی سب آنکھیں دیدارِ خداوندی نہیں کر سکتیں۔ اس سے اس کی نفی کہاں ہوئی کہ اہلِ ایمان کی نگاہیں بھی آخرت میں اس کا دیدار نہیں کر سکتیں۔ اس سے تو صرف یہ ہی معلوم ہوا کہ سب آنکھیں اسکو نہیں دیکھ سکتیں۔ یعنی آیت میں نفی استغراقِ رؤیت ہے، استغراقِ نفی رؤیت نہیں۔

(۳) آیت میں نفیِ ادراک کی صراحت ہے۔ نفیِ رؤیت کا اس میں ذکر نہیں۔ ادراک و رؤیت میں فرق ہے۔ وہ یہ کہ رؤیت کے معنیٰ دیکھنے کے ہیں، اِحاطہ اس کے مفہوم میں داخل نہیں۔ اور اِدراک کے معنیٰ کسی چیز کی حقیقت کو پالینے اور اس کا احاطہ کرلینے کے ہیں۔ دونوں میں تلازم نہیں۔ آخرت میں رؤیت بغیر احاطہ ہوگی۔ قرآنِ پاک میں ہے فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ قَالَ كَلَّا (جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا اے موسیٰ ہم تو پکڑے گئے موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں) اس آیت میں رؤیت کا ثبوت اور اِدراک کی پُرزور نفی ہے۔ اسی طرح یہ آیت دیدارِ خداوندی کی نصوص کے مخالف نہیں۔

(۴) اچھا اگر ہم رؤیت و اِدراک کو مُترادف اور ہم معنیٰ بھی تسلیم کرلیں (جیساکہ معتزلہ کا خیال ہے) تب بھی اس سے استدلال درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں نفیِ رؤیت کی صراحت ہے۔ (یعنی کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھتی) رؤیت کے محال ہونے کا اس میں ذکر نہیں (یعنی کوئی آنکھ اس کو دیکھ ہی نہیں سکتی) تو نفیِ رؤیت سے استحالۂ رؤیت پر استدلال نادانی ہے۔

دوسری صفت

اس آیت میں حق تعالیٰ کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کی نظر ساری کائنات کو محیط ہے، عالم کا کوئی ذرّہ اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں
یہ علمِ مطلق اور احاطۂ علمی بھی حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔ اسکے سوا کسی مخلوق کو تمام اشیائے کائنات
اور عالم کے ذرّہ ذرّہ کا علم نہ کبھی حاصل ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ رب العزت کی مخصوص صفت ہے۔
جو لوگ اس قسم کا عقیدہ کسی مخلوق کے لئے رکھتے ہیں وہ بلاشبہ مشرک ہیں۔

وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ لطیف لغۃً دو معنی کے لئے مستعمل ہے۔ (۱) مہربان (۲) کثیف کے مقابل یعنی وہ چیز
جو حواس کے ذریعہ محسوس و معلوم نہ ہو سکے۔ (صحاح) صاحب قاموس نے لطیف کے ایک تیسرے معنی "پوشیدہ
امور کا عالم" بھی لکھے ہیں۔ صاحب صحاح کی تصریح پر اسکے معنی (بطور لف ونشر مرتب) یہ ہوں گے کہ اسکو
نگاہیں نہیں پاتیں کیونکہ وہ غیر محسوس ہے اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے کیونکہ وہ باخبر ہے۔ کائنات کا کوئی
ذرّہ اس کے علم وخبر سے باہر نہیں۔

اور اگر لطیف کے معنی مہربان کے ہوں (کما قالہ ابن عباسؓ) تو اشارہ اس طرف ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ
ہمارے افعال واقوال اور ارادہ وخیال سے بھی باخبر ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سے مؤاخذہ ہو مگر چونکہ
وہ لطیف ومہربان ہے اسلئے ہر گناہ پر مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔

(۵) اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ۔ یہ سورۂ یوسف کی چالیسویں آیت کا ایک ٹکڑا اور یوسف علیہ السلام
کے مضمونِ دعوت کا ایک جزء ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی بالکل واضح ہوگئی
تو عزیز مصر اور اسکی بیوی کی بدنامی ختم کرنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ بھیجدیا گیا۔
ان کے ساتھ دو مجرم قیدی اور بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی دوسرا
باورچی تھا۔ ان پر بادشاہ کو زہر دینے کا الزام تھا۔ ایک دن ان دونوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر
حضرت یوسف علیہ السلام سے دریافت کی۔ یہ خواب واقعی تھے جیساکہ ابن عباسؓ سے منقول ہے۔
یا بناوٹی اور فرضی تھے اور محض حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش مقصود تھی جیساکہ ابن مسعودؓ سے
مروی ہے۔ لیکن چونکہ اصل کارِ نبوت دعوت وتبلیغ ہے اسلئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اوّلاً
ان کو دعوتِ ایمان دی۔ اور اصولِ دعوت کے تحت حکمت ودانشمندی سے کام لیا۔ کہ سب سے پہلے
ان لوگوں کے دلوں میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے معجزہ کا ذکر کیا کہ تمہارے لئے جو کھانا آتا ہے
میں اسکے آنے سے پہلے ہی تمہیں تفصیل سے بتا دیتا ہوں کہ وہ کس قسم کا کھانا ہے۔ کہاں سے آتا ہے
وہ کیسا ہے کتنا ہے اور کس وقت آئیگا وغیرہ۔ اور وہ سب باتیں ٹھیک نکلتی ہیں۔ اور میں یہ سب
وحی ربانی سے بتاتا ہوں یہ رمل جفر کے فن کا نتیجہ یا کہانت وغیرہ کا شعبدہ نہیں۔ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ۔
اسکے بعد اول کفر کی مذمت اور ملت کفر سے بیزاری بیان کرکے بتایا کہ میں خاندانِ نبوّت کا ایک فرد

اور انبیاء کی ملتِ حقّہ کا پابند ہوں۔ میرے آباء و اجداد ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ ہیں (خاندانی شرافت بھی عادۃً اعتماد کا ذریعہ بنتی ہے) اسکے بعد فرمایا کہ ہمارے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ دینِ حق کی توفیق ہمیں اور سب لوگوں پر اللہ کا فضل ہے۔ اسنے فہم کی سلامتی عطا فرما کر قبولِ حق کو ہمارے لئے آسان فرمادیا۔ مگر بہت سے لوگ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر و شکر گذاری نہیں کرتے۔ پھر انہیں قیدیوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتاؤ کہ انسان بہت سے ارباب کا پرستار ہو یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے کہ صرف ایک ایسے اللہ کا بندہ بنے جس کا قہر اور قوت سب پر غالب ہے۔ پھر بلیغ انداز میں شرک و بت پرستی کی مذمت نہایت مدلّل طریقہ پر بیان فرمائی کہ اس کا جواز عقلاً اور نقلاً کسی طرح بھی نہیں ہے۔ اور دلائل سے یہی ثابت ہے کہ حاکمِ مطلق اور معبودِ برحق ایک اللہ ہی ہے۔ اسلئے اس نے حکم فرمایا ہے کہ تم اسی کی عبادت و پرستش کرو۔ یہ توحید و عبادتِ خداوندی کی راہ ہی راہِ راست ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کو جانتے (اور مانتے) نہیں حضرتِ یوسف علیہ السّلام مکمل دعوت و تبلیغ کے بعد ان دونوں قیدیوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن کی تعبیر بیان فرمائی۔

وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ۔ سورۂ قصص کی آخری آیت وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ الخ ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا کہ آپؐ اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکاریئے۔ کیونکہ اسکے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ جس سے کفار کو ناامید کرنا مقصود ہے جو آپؐ سے دین میں موافقت اور یکجہتی کی درخواست کرتے تھے۔ کلام ربانی کا نزول محاوراتِ انسانی میں ہوا ہے۔ عرف یہ ہے کہ جس پر غصہ زیادہ ہوتا ہے اس سے خطاب نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اپنے چہیتوں سے خطاب کرکے اس شخص کو سنایا جاتا ہے جس پر غصہ ہوتا ہے۔ بس یہ کلام اسی محاورہ پر ہے۔ اس سے اُوپر کی عبارت میں آیات کی روشنی میں توحید کے دلائل آچکے ہیں۔ اسلئے مؤلفؒ نے بطورِ نتیجہ فَلَا تَجْعَلُوا سے بطور خطاب عام اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ سورۂ ذاریات کے آخری رکوع میں بعینہٖ فَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ کے الفاظ بھی ہیں۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (شوریٰ آیت ۱۲) اسی کے پاس ہیں کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی) یعنی آسمان و زمین کے سب خزانے حق تعالیٰ ہی کی مِلک اور قبضہ میں ہیں۔ اور کسی کو نہ ان خزانوں کا علم ہے اور نہ اللہ کے سوا ان پر کسی کا اختیار ہے۔ ان کا وجود ان کا ظہور ان میں سے کسی شئی کی عطاء سب کا اختیار اللہ جل شانہٗ کو ہی ہے۔ دوسری آیت میں ہے۔

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک خاص اندازہ و مقدار سے نازل کرتے ہیں)

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا هُوَ (النمل آیت ٦٥) اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو حکم ہے آپ لوگوں کو بتادیں کہ جتنی مخلوق آسمانوں میں (فرشتے وغیرہ) ہے۔ اور جتنی مخلوق زمین میں (انس وجن وغیرہ) ہے ان میں سے کوئی بھی تمام غیب کو نہیں جانتا۔ صرف حق تعالیٰ ہی عالم الغیب ہیں۔ آیتِ مذکورہ نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ بتایا کہ علمِ غیب حق تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے جس میں کوئی فرشتہ یا نبی ورسول شریک نہیں ہوسکتا۔

علمِ غیب اللہ کی خاص صفت ہے

لفظِ غیب سے مُراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا وجود میں تو آچکی ہیں لیکن حق تعالیٰ نے اُن پر کسی کو مطلع نہیں فرمایا۔ (مظہری) پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات وواقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں۔ یا عالم میں آئندہ پیش آنیوالے ہیں۔ مثلاً کون کب اور کہاں پیدا ہوگا۔ کیا کام کریگا کتنی عمر ہوگی، زندگی میں کتنے سانس لیگا۔ کتنے قدم اُٹھائیگا۔ کہاں، کیسے اور کب مریگا۔ کہاں دفن ہوگا۔ کس کو کتنا اور کس وقت رزق ملیگا۔ بارش کب، کہاں، کسقدر ہوگی وغیرہ۔

اور دوسری قسم کی مثال وہ حمل ہے جو عورت کے رحم میں وجود تو اختیار کرچکا ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ خوبصورت ہے یا بدصورت، نیک طینت ہے یا بدخصلت، اسی طرح وہ تمام چیزیں اس دوسری قسم میں داخل ہیں جو وجود میں آنے کے باوجود مخلوق کے علم ونظر سے غائب ہیں۔ اگر ان چند سطور میں غور وفکر سے کام لیا جائے تو مسئلہ علمِ غیب پر عام طور پر پیش آنیوالے شبہات خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ لیکن عموماً لوگ لفظِ غیب کے لغوی معنی مُراد لیتے ہیں۔ کہ جو ہمارے علم ونظر سے پوشیدہ ہو خواہ دوسروں کے نزدیک اسکے حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اسکو بھی علمِ غیب کہنے لگتے ہیں جسکے نتیجہ میں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً علم نجوم، جفر، رمل یا ہتھیلی کی لکیروں وغیرہ سے آئندہ واقعات کا اندازہ کیا جاتا ہے، یا کشف والہام کے ذریعہ کسی کو آئندہ پیش آنیوالے کچھ واقعات معلوم ہوجاتے ہیں، یا مان سون اور اس کی قوتِ رفتار کو دیکھکر موسمیات کے ماہرین باد وباراں کے متعلق پیش گوئیاں کرتے ہیں اور ان سب میں سے بہت سی باتیں صحیح بھی ہوجاتی ہیں اور عوام ان سب کو علمِ غیب سمجھ لیتے ہیں، اور اہلِ بدعت کے پیشوا ایسی ہی چیزوں کو پیش کرکے عوام کو گمراہ کرتے اور ان کو اہلِ حق سے متنفر کرکے اپنے دامِ فریب میں پھنسا لیتے ہیں۔ حالانکہ علمِ غیب کو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت قرار دیا ہے۔ اب رہے مذکورہ شبہات تو ان کا جواب واضح ہے کہ کشف والہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو آئندہ کسی واقعہ کی اطلاع فرمادی تو اب وہ قرآنی اصطلاح میں علمِ غیب نہ رہا۔ اسی طرح اسباب وآلات کے ذریعہ حاصل شدہ علم بھی قرآنی اصطلاح کے موافق علمِ غیب نہیں۔ مثلاً محکمۂ موسمیات نے آلات کیذریعہ، حکیموں نے نبض کے ذریعہ، ڈاکٹروں نے اپنے آلات کے ذریعہ اسی وقت کچھ بتایا ہے جبکہ اُن واقعات وامراض کے مادّے پیدا ہوکر

ظاہر ہوگئے۔ اور چونکہ انکا ظہور عام اور تمام نہیں ہوا تھا اسلئے اہل فن کے علاوہ عوام ان سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اہل فن اسباب و آلات کیذریعہ ان کا اندازہ کرکے خبر دیدیتے ہیں جو صحیح بھی ثابت ہوجاتی ہے اور غلط بھی۔ اس اندازہ کو علم کہنا جہالت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ محکمۂ موسمیات کی خبریں یا نبض دیکھکر مریض کے مخفی حالات بتادینا وغیرہ آثار و نشانات دیکھکر علامات محسوس کرکے یا آلات کے ذریعہ سے ہوتی ہیں۔ اور جب آثار و علامات اور اشیاء کا مادہ ظاہر ہوچکا تو وہ چیزیں غیب میں شامل نہ رہیں بلکہ وہ مشاہدہ میں آگئیں۔ البتہ لطیف یا ضعیف ہونے کی وجہ سے عام مشاہدہ میں نہیں آئیں اسی لئے ان کے متعلق اہل فن کی خبریں بھی کبھی غلط ہوجاتی ہیں۔ علم نجوم، رمل، جفر، اکسیر اور دوسرے آلات کے ذریعہ بھی صرف اندازہ اور تخمینہ حاصل ہوتا ہے۔ نہ اس کو علم کہہ سکتے ہیں اور نہ علم غیب۔

اسی طرح جو وحی اور کشف والہام کے ذریعہ علوم حاصل ہوتے وہ غیب کی حدود سے نکل آئے اب ان کو علم غیب کہنا جہالت ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کو دیئے گئے علوم کو قرآن نے جا بجا "انباء الغیب" فرمایا ہے۔ علم غیب نہیں فرمایا۔ مثلاً ارشاد ہے تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ حاصل یہ ہے کہ علم الٰہی کی دو خصوصیات ہیں جن میں کوئی مخلوق اس کی شریک نہیں۔ ایک علم غیب دوسری موجودات کا علم محیط کہ اس سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں۔ قرآن مقدس کی بہت سی آیات اور حدیث کی بہت سی روایات اسپر شاہد ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب "حدیث جبریل" میں اس بحث کو قدرے تفصیل سے لکھدیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الآیۃ (حشر، آیت ۲۴) سورۂ حشر کی آخری تین آیات میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی پندرہ صفات بیان فرمائی ہیں۔ ان تینوں آیتوں میں سے ہر آیت کو دعویٰ توحید (هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ) سے شروع فرماکر چند مخصوص صفات ایسی ذکر فرمائی ہیں کہ جن میں سے ہر ایک توحید باری پر مکمل دلیل ہے۔ ان صفات کا مختصر بیان حسب ذیل ہے۔

(۱) عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (وہ جاننے والا ہے تمام پوشیدہ اور تمام ظاہر چیزوں کا) اس میں حق تعالیٰ شانہٗ کے علم غیب و علم محیط کو بیان فرمایا گیا ہے۔

(۲و۳) هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ (وہ بے حد رحم والا، بڑا مہربان ہے) اس میں حق تعالیٰ کی وسعت رحمت و شمول نعمت کو بیان فرمایا گیا کہ اس کی رحمت ساری کائنات کو عام اور اسکے انعامات سبکو عام ہیں

(۴) اَلْمَلِكُ (وہ بادشاہ ہے) تمام کائنات پر اسکی حکومت ہے اسکے حکم کے بغیر کائنات میں کچھ نہیں ہوسکتا جو ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ وہی خالق، کائنات کا مدبر و منتظم ہے۔

(۵) اَلْقُدُّوسُ (وہ تمام عیبوں سے پاک ہے) اور ہر ایسی چیز سے وہ بری ہے جو اس کی شایان شان نہیں۔ (۶) اَلسَّلَامُ (وہ سالم ہے) یعنی نہ گذشتہ زمانہ میں اس میں کوئی عیب ہوا جو حاصل ہے اَلْقُدُّوسُ کا۔ اور نہ آئندہ اس کی ذات میں کسی عیب کا احتمال ہے جو اَلسَّلَامُ کا مفہوم ہے۔

اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ سلامتی عطا فرمانیوالا ہے۔

(۷) اَلْمُؤْمِنُ (وہ امن دینے والا ہے۔) لفظ مؤمن جب انسان کے لئے بولاجاتا ہے تو اسکے معنی ایمان والے اور اللہ ورسول کی تصدیق کرنیوالے کے ہوتے ہیں۔ اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولاجاتا ہے تو اسکے معنی امن دینے والے کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ ورسول پر ایمان لانیوالوں کو ہر طرح کے عذاب اور مصیبت سے امن وسلامتی دینے والا ہے۔

(۸) اَلْمُهَيْمِنُ (وہ نگہبان ہے) ابن عباسؓ اور مجاہدؒ وقتادہؒ فرماتے ہیں کہ اسکے معنی "نگرانی کرنیوالا" "حفاظت کرنے والا" ہیں۔ قاموس میں ہے کہ هَيْمَنَ يُهَيْمِنُ (ض) کے معنی ہیں دیکھ بھال کرنیوالا، نگرانی کرنیوالا۔ (۹) اَلْعَزِيْزُ (غالب) زبردست، قوی، وہ غالب جو کبھی مغلوب نہو، وہ زبردست جسپر کوئی چیز غالب نہو سکے، اور جس کی کوئی مثل نہو۔ حلیمیؒ لکھتے ہیں کہ عزیز وہ ذات ہے جس تک رسائی نہو سکے۔ اور نہ کسی نامناسب بات کا عمل دخل اسپر ممکن ہو۔

(۱۰) اَلْجَبَّارُ (وہ صاحب عظمت وجبروت ہے) اور ہو سکتا ہے کہ یہ جبر سے ماخوذ ہو جسکے معنی ہیں ٹوٹی ہوئی ہڈی وغیرہ کا جوڑنا۔ اسی لئے جبیرہ اس پٹی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑ کر باندھی جاتی ہے۔ اس صورت میں اسکے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ہر ٹوٹی ہوئی شکستہ وناکارہ چیز کی اصلاح کرکے درست کردینے والا ہے۔

(۱۱) اَلْمُتَكَبِّرُ (وہ بڑی عظمت والا ہے۔) یہ تکبّر اور کبریاء سے مشتق ہے۔ جسکے معنی بڑائی کے ہیں۔ اور ہر بڑائی درحقیقت اللہ کے لئے مخصوص ہے کہ وہ کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ جو محتاج ہو وہ بڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اللہ کے سوا کسی پر اس لفظ کو بولنا گناہ ہے۔ اسلئے کہ اللہ کے سوا کسی کیلئے بڑائی کا دعویٰ کذب اور اللہ کی خاص صفت میں شرکت کا دعویٰ ہے۔

(۱۲) اَلْخَالِقُ (پیدا کرنے والا) یہ خلق سے اسم فاعل کا صیغہ ہے (ن) پیدا کرنا، بنانا۔ دراصل خلق کے معنی تقدیر مستقیم یعنی صحیح اندازہ ٹھہرانے کے ہیں۔ اور اس کا استعمال کسی چیز کو بغیر نمونہ کے ایجاد کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ خلق بمعنی ابداع ذات باری کی مخصوص صفت ہے۔ ابداع کے معنی اَلْاِيْجَادُ بِغَيْرِ مِثَالٍ سَبَقَ کے ہیں۔ (۱۳) اَلْبَارِئُ (پیدا کرنے والا، نکال کر کھڑا کرنے والا) برءَ (ف) سے اسم فاعل ہے۔ اس کا استعمال پیدا کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے باری، خالق کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اس آیت گرامی میں الخالق البارئ دونوں یکجا ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ اور ہم معنی ماننے کی صورت میں الباری کو الخالق کی تاکید سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ باری وہ ہے جس نے مخلوق کو تفاوت اور اجزاء واعضاء کے عدم تناسب سے بری پیدا کیا۔ اسی طرح خاصیتوں اور شکلوں نیز خوبی وبرائی میں ایک دوسرے سے ممتاز فرمایا۔ اس اعتبار سے باری خاص ہے اور خالق عام، یعنی خالق کے معنی صرف پیدا کرنے والا اور باری کے معنی مخصوص صفت پر پیدا کرنے والا ہوئے۔ ان

دونوں اسماء کے مزید فرقوں کو لغات القرآن ص۱۲ میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

(۱۴) اَلْمُصَوِّرُ (وہ صورت بنانیوالا ہے) یعنی تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص شکل وصورت جو جسکے لائق تھی عطا فرمائی ہے جس کی وجہ سے ہر مخلوق دوسری سے ممتاز ہے۔ اور جانی پہچانی جاتی ہے۔ اجناس و انواع کی صورتیں الگ الگ ہیں، اصناف کی صورتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ حتیٰ کہ افراد کی صورتوں میں بھی امتیازات ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کمالِ قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ہر شئے کو ممتاز و یکتا بنایا ہے یہ بھی اس کی شانِ یکتائی کا بیّن ثبوت ہے، ایک کی صورت کسی بھی ایک سے ملتی نہیں

لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (اسکے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں) بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ:

اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ اِسْمًا مِائَةً اِلَّا وَاحِدَةً مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (مشکوٰۃ ص۱۹۹) — بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ یعنی ایک کم سو نام ہیں جو ان کو یاد کرلیگا وہ جنت میں جائیگا۔

ترمذی، حاکم، ابن حبان، ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے ابوہریرہؓ کی روایت میں ان ناموں کی تفصیل بھی ذکر فرمائی ہے۔ مشکوٰۃ ص۱۹۹ میں بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ ننانوے اسماء موجود ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم یہاں ان اسماء اور ان کی تفصیلات کو بیان نہیں کر رہے ہیں۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ — ساری چیزیں اس کی پاکی بیان کرتی ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

یہ تسبیح زبانِ حال سے ہونا تو ظاہر ہی ہے کہ ساری مخلوقات اور ان میں عجیب و غریب صنعتیں اور ان کی انواع و اقسام کی صورتیں زبانِ حال سے اپنے بنانے والے کی حمد و ثناء اور اسکے کمالات کی مظہر ہیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد حقیقی تسبیح یعنی زبانِ قال سے پاکی بیان کرنا ہو کیونکہ تمام اشیائے عالم اپنے اپنے لائق شعور و عقل رکھتی ہیں۔ اور عقل و شعور کا تقاضا ہے کہ اپنے خالق و مالک کو پہچانا جائے اور اس کی شکر گذاری کی جائے۔ اسلئے اگر حقیقۃً ہر شئے حق تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہو تو اس میں کوئی استبعاد نہیں اگرچہ ہم ان کی قالی تسبیح کو سن اور سمجھ نہ سکیں۔ ارشادِ خداوندی ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (ہر چیز حق تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ پاتے) دوسری جگہ ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (ہر چیز کو اس کی تسبیح اور صلوٰۃ کا علم ہے)

(۱۵) اَلْحَكِيْمُ (وہ حکمت والا ہے) یہ ان آیات میں پندرھواں اسم ہے۔ حکیم کے معنی ہیں "حکمت والا" اور حکمت کمالِ علم و اتقانِ عمل کو کہتے ہیں۔ یا یہ صیغہ فعیل بمعنی فاعل ہے جو حاکم کا مبالغہ ہے فَاِنَّهٗ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ۔ یا بمعنی مُحکِم ہے یعنی اشیاء کو محکم و مضبوط کرنیوالا۔

قال تعالیٰ صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط

فائدہ ترمذی شریف میں حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور اس کے بعد تین مرتبہ سورۃ حشر کی آخری تین آیات (ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سے ختم سورۃ تک) پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتے ہیں جو شام تک اسکے لیے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں، اگر اسدن میں وہ مرگیا تو اس کو شہادت کی موت حاصل ہوگی۔ اور جسنے شام کو یہی آیات تین بار بہ ترکیب مذکور پڑھ لیں تو یہی درجہ حاصل ہوگا۔ (مظہری)

(۳۶۱) وَحَدَّثَ عَدِیُّ بْنُ حَاتِمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اور عدی بن حاتمؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا یہانتک کہ آپؐ

اَخَذَ بِیَدِیْ حَتّٰٓی اَتٰی بِیْ دَارَہٗ فَاَلْقَتْ لَہُ الْوَلِیْدَۃُ وِسَادَۃً فَجَلَسَ عَلَیْھَا

مجھ کو اپنے دولتکدہ پر لے آئے تو ایک لڑکی نے آپ کے لیے ایک تکیہ ڈالدیا آپ اسپر تشریف فرما ہوگئے

وَجَلَسْتُ بَیْنَ یَدَیْہِ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ مَا یُفِرُّکَ اَنْ

اور میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو آپؐ نے اللہ کی حمد و ثناء بیان فرمائی پھر ارشاد فرمایا کہ تم کو لآ الٰہ الا اللہ کا

تَقُوْلَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَھَلْ تَعْلَمُ مِنْ اِلٰہٍ سِوَی اللّٰہِ قُلْتُ لَا قَالَ ثُمَّ تَکَلَّمَ

قائل ہونے سے کیا چیز مانع ہے کیا تم اللہ کے سوا کوئی اور معبود جانتے ہو میں نے عرض کیا نہیں۔ عدیؓ نے کہا

سَاعَۃً ثُمَّ قَالَ تَفِرُّ اَنْ تَقُوْلَ اللّٰہُ اَکْبَرُ وَتَعْلَمُ شَیْئًا اَکْبَرَ مِنَ اللّٰہِ

کہ پھر آپؐ نے کچھ دیر گفتگو فرمائی پھر فرمایا تم اللہ اکبر کہنے سے بھاگتے ہو؟ اور کوئی چیز ایسی جانتے ہو جو اللہ سے بڑی

قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَاِنَّ الْیَھُوْدَ مَغْضُوْبٌ عَلَیْھِمْ وَاِنَّ النَّصَارٰی ضُلَّالٌ

ہو۔ عدیؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا کہ یہود "مغضوب علیہم" ہیں اور بیشک نصاریٰ "ضُلّال" (گمراہ ہیں)

قَالَ قُلْتُ فَاِنِّیْ حَنِیْفٌ مُّسْلِمٌ قَالَ فَرَاَیْتُ وَجْھَہٗ یَنْبَسِطُ فَرَحًا

عدیؓ نے کہا میں نے عرض کیا کہ میں تو "موحّد مسلمان" ہوں۔ عدیؓ نے کہا کہ میں نے آپ کا رُخِ انور دیکھا کہ خوشی سے کھل گیا۔

(ترمذی ج۲ ص۱۲۳)

(۳۶۲) عَنْ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُطْرُوْنِیْ

حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری اس طرح بیجا تعریف نہ کرو

کَمَآ اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَآ اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا

جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کی بیجا تعریف کی، میں تو اللہ کا بندہ ہوں لہٰذا تم (مجھکو) اللہ کا

عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ۔ (بخاری ص۴۹۱ ج۱)

بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔

لغات اَلْوَلِیْدَۃُ بچی، لڑکی۔ ج وَلَائِدُ (ض) جَنَنَا، پیدا کرنا، اُگانا۔ وِسَادَۃٌ بتثلیث الواو تکیہ ج وِسَادَات وَ وَسَائِدُ تفعیل سے تکیہ دینا، ذمہ دار بنانا، تفعّل سے تکیہ رکھنا۔ یُفِرُّ افعال سے بھگانا، بھاڑنا۔ (ض) دوڑنا، بھاگنا، پویہ دوڑنا، (ن) جانور کی عمر معلوم کرنیکے لئے دانت دیکھنا، کھود کرید کرنا، کھولنا۔ اَلْیَھُوْدُ اسم جمع۔ اَلْیَھُوْدِیُّ اسم مفرد ھَادَ ھَوْدًا (ن) توبہ کرنا، حق کی طرف لوٹنا۔ صفت ھَائِدٌ ج ھُوْدٌ۔ یہود علمیت و وزن فعل کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ اسپر الف لام بھی داخل ہوجاتا ہے۔ مشہور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے گوسالہ کی پرستش سے توبہ کی تھی اور حق کی طرف لوٹے تھے اسلئے یہود کو یہود کہتے ہیں۔ اَلنَّصَارٰی نَصْرَانِی کی جمع ہے۔ نُصْرَۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ حواریوں نے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کہا تھا تو جو لوگ مذہب عیسائی کے مدعی ہیں ان کو (خلاف قیاس) اَنصار کی طرف منسوب کرکے نصاریٰ کہا جانے لگا۔ یا نُصرۃ کی طرف منسوب ہے جو ایک بستی کا نام ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ نصرآن کی طرف منسوب ہے جو ایک بستی کا نام ہے۔ جو نصاریٰ کا مرکز رہی ہے۔ مَغْضُوْبٌ مفعو (س) ناراض ہونا۔ حَنِیْفٌ بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ جو شخص ایک راہ حق پکڑلے اور سب باطل راہیں چھوڑدے وہ حنیف کہلاتا ہے۔ حَنَفٌ (ض) سے ماخوذ ہے۔ گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونا، مائل ہونا، جھکنا (س ک) ٹیڑھے پاؤں والا ہونا۔ حنیف سیدھا، اسلام کے احکام پر چلنے والا، موحد، دین ابراہیمی کا متبع۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ حنیف کے ساتھ مسلم آیا ہے وہاں حاجی مراد ہے جیسے وَلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا اور جہاں بغیر لفظ مسلم ہے وہاں مسلم مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "حنیف آں رامی گویند کہ استقبال کعبہ کند و حج گذارد و ختنہ نماید و از جنابت غسل کند، حاصل آنکہ حنیف نام کسے بود کہ بشریعت ابراہیمی متدین شود" (فتح الرحمٰن در تفسیر وَلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا) ج حُنَفَاء۔ لَا تُطْرُوْنِیْ افعال سے حد سے زیادہ مدح کرنا۔ طُرُوْ طَرَاءٌ وَطَرَاءَۃٌ (ك) تروتازہ ہونا (ف) اچانک آجانا۔

ترکیب فَھَلْ تَعْلَمُ مِنْ اِلٰہٍ ای اِلٰھًا مفعول اول تعلم اور اضافہ مِنْ مبالغہ کے لئے ہے۔ تَفِرُّ اَنْ تَقُوْلَ ہمزۂ استفہامیہ محذوف جملہ انشائیہ ہے۔ اس سے اگلا جملہ بھی استفہامیہ بحذف حرف استفہام ہے۔ باقی تراکیب ظاہر ہیں۔

تشریح (۲۶۱) یہ حضرت عدی بن حاتمؓ کی اس حدیث کا درمیانی حصہ ہے جسکو امام ترمذیؒ نے

ابواب تفسیر القرآن میں ذکر کیا ہے۔ حضرت عدی بن حاتمؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے تو لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ یہ عدی بن حاتمؓ آئے ہیں۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ میں (آپ کے اخلاق حمیدہ پر اعتماد کرتے ہوئے) یونہی بغیر امان اور بغیر کسی خط وغیرہ کے حاضر خدمت ہو گیا تھا، پھر جب مجھ کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ اس سے پہلے فرما چکے تھے کہ مجھ کو امید ہے کہ عدیؓ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیگا۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ آپ مجھ کو لیکر کھڑے ہو گئے (اور دولتکدہ کی جانب روانہ ہو گئے) تو آپ سے ایک عورت ملی جسکے ساتھ ایک بچہ تھا اُن دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کو آپ سے ایک کام ہے تو آپ ان کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان کی حاجت پوری فرما دی۔ پھر آپنے میرا ہاتھ پکڑ لیا یہاں تک کہ مجھ کو اپنے دولت کدہ پر لے آئے تو ایک لڑکی نے تکیہ ڈالدیا۔ آپؐ اُسپر تشریف فرما ہو گئے۔ اور میں حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا فرما کر ارشاد فرمایا

مَا يُفِرُّكَ اَنْ تَقُوْلَ الخ یہ لفظ یُفِرّ بضم الیاء وکسر الفاء ہے ای ما یحملك علی الفرار۔ اور بہت سے محدثین نے اس کو بفتح الیاء وضم الفاء پڑھا ہے لیکن صحیح اول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کلمۂ توحید سے کیوں بھاگتے ہو، اس کا سبب کیا ہے کہ تم توحید کا اقرار نہیں کرتے۔ کیا تمہارے علم میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے؟ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا نہیں! پھر حضورؐ نے تھوڑی دیر دوسری گفت گو فرمائی پھر فرمایا کیا تم اللہ اکبر کہنے سے بھاگتے ہو؟ یعنی اللہ کو سب سے بڑا ماننے کے لئے تیار نہیں ہو، اور کوئی ہستی اس سے بڑی ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ تو آپنے ارشاد فرمایا کہ یہود مغضوب علیہم کا مصداق ہیں۔ اور نصاریٰ ضالین کا مصداق ہیں یعنی یہود و نصاریٰ افراط و تفریط اور شرک و نافرمانی کیوجہ سے غضب خداوندی کے مستحق اور گمراہ ہو گئے ہیں (تو کیا تم نصاریٰ جیسے گمراہوں کی جماعت ہی میں شامل رہو گے۔ اُن سے جُدا ہو کر اور ان کے طریق گمراہی سے دست بردار ہو کر راہِ ہدایت اور اسلام جیسے دین مستقیم پر نہ آؤ گے) فرماتے ہیں میں نے عرض کیا کہ میں ان سب سے ہٹ کر اور یکسو ہو کر مسلمان ہو گیا ہوں (اسپر آپ کو بہت خوشی ہوئی) میں نے دیکھا کہ خوشی کے مارے آپ کا رُخِ انور کھِل گیا۔ (اس سے آگے بھی حدیث کا طویل مضمون ہے کہ مجھے ایک انصاری کے پاس ٹھہرا دیا گیا۔ شام کیوقت غریب دیہاتی آئے آپنے لوگوں کو صدقات کی ترغیب دی، آخرت کی یاد دہانی، نعمتوں کا ذکر، ان کے بارے میں بازپرس اور عذاب جہنم سے نجات کا طریق اور آئندہ امن و امان کی پیشگوئی وغیرہ یہ سب چیزیں ارشاد فرمائیں)

(ف) اس روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق، تبلیغ و دعوت کا حُسنِ انداز، طالب پر عنایات و توجہات کے علاوہ غریب پروری، محتاجوں کی فریاد رسی، خلقِ خدا کے لئے

دل سوزی وراحت رسانی اور نیکی وہدایت پر خوشی ومسرت جیسے اُمور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۳۶۲) غلو فی الدین کے سبب یہود ونصاریٰ گمراہ وتباہ ہوئے اسلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس معاملہ میں احتیاط کی تعلیم دی اور تاکید فرمادی کہ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا۔ اور ان کو مقامِ نبوت ورسالت سے اُٹھا کر اُلوہیت تک پہونچانے کی کوشش کی اور گمراہ ہوگئے۔ تم میری مدح وثنا میں ایسا مبالغہ نہ کرنا۔ اور تم مجھ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہا کرو۔ اس سے آگے بڑھانا اللہ تعالیٰ کی صفات وغیرہ میں شریک کرنا غلو فی الدین اور گمراہی ہے۔ اس سے ہمیشہ احتیاط رکھنا۔ ان تاکیدات اور روشن تعلیمات کے باوجود اُمّتِ مسلمہ میں آج وہ تمام گمراہیاں موجود ہیں جو یہود ونصاریٰ میں تھیں۔ اور جن کی وجہ سے وہ گمراہ وملعون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

اَلسُّجُوْدُ لِغَیْرِ اللّٰہِ

اللہ کے سوا کو سجدہ کرنا

وَمِنَ الْاِشْرَاكِ اَنْ یُّسْجَدَ لِاَحَدٍ غَیْرِ اللّٰہِ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ
اور شرک میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا

تَعَالٰی لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ۔ (حٰمٓ السجدۃ آیت ۳۷)
کہ تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو۔

(۳۶۳) وَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كُنْتُ
اور حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اگر میں کسی کیلئے

اٰمُرُ اَنْ یُّسْجَدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا۔ {ترمذی ج۱ ص۱۳۵ و مشکوٰۃ ص۲۸۱}
سجدہ کیئے جانے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

(۳۶۴) اَخْبَرَ عُبَيْدُ اللّٰہِ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُتْبَةَ اَنَّ عَائِشَةَ وَعَبْدَ اللّٰہِ
عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ نے خبر دی کہ حضرتِ عائشہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ

ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَا لَمَّا نَزَلَ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَفِقَ
نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرضِ وفات نازل ہوا تو آپ اپنی ایک کالی کملی

یَطْرَحُ خَمِیْصَةً لَّهٗ عَلٰی وَجْهِهٖ فَاِذَا اغْتَمَّ كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ
اپنے چہرۂ انور پر ڈالنے لگے۔ پھر جب سانس گھٹ جاتی تو اس کو اپنے چہرہ سے کھول دیتے تو آپ اسی

وَهُوَ كَذٰلِكَ يَقُوْلُ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ
حالت میں ارشاد فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ اُنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو
اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ، يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوْا۔ (بخاری ۶۳۹ و مشکوٰۃ ۶۹)
سجدہ گاہ بنالیا. آپؐ ان کے اِس عمل سے امّت کو ڈراتے تھے۔

(۳۶۵) عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِؓ قَالَتْ عَائِشَةُؓ لَوْلَا ذٰلِكَ لَاُبْرِزَ قَبْرُهٗ خُشِيَ
حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر اسکا اندیشہ نہوتا تو آپ کی قبر ظاہر کیجاتی
اَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِدًا۔ (بخاری ۶۳۹)
اس بات کا اندیشہ کیا گیا کہ وہ سجدہ گاہ نہ بنالی جائے۔

(۳۶۶) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ لَمَّا اشْتَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَ
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے تو آپ کی بعض بیویوں نے
بَعْضُ نِسَائِهٖ كَنِيْسَةً رَاَتْهَا بِاَرْضِ الْحَبَشَةِ يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ وَكَانَتْ اُمُّ
ایک گرجا کا ذکر کیا جس کو انہوں نے سرزمین حبشہ میں دیکھا تھا اس گرجا کو "ماریہ" کہا جاتا تھا۔ اور حضرت
سَلَمَةَ وَاُمُّ حَبِيْبَةَ اَتَتَا اَرْضَ حَبَشَةَ فَذَكَرَتَا مِنْ حُسْنِهَا وَتَصَاوِيْرَ
ام سلمہؓ و حضرت ام حبیبہؓ ملک حبشہ تشریف لے گئی تھیں ان دونوں نے اس کی خوبصورتی اور اس میں جو تصویریں تھیں انکا ذکر
فِيْهَا فَرَفَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ اُولٰٓئِكَ اِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا
کیا تو آپ نے اپنا سر اُٹھا کر فرمایا وہ ایسے لوگ تھے کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو اُس کی قبر پر مسجد بنا لیتے
عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ
تھے پھر انہوں نے یہ تصویریں اس میں بنالیں وہ لوگ اللہ کے نزدیک مخلوق میں سب سے
عِنْدَ اللّٰهِ۔ (بخاری ۱۷۹ مشکوٰۃ ۳۸۶)
بُرے ہیں۔

(۳۶۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ صَارَتِ الْاَوْثَانُ الَّتِيْ كَانَتْ فِيْ قَوْمِ نُوْحٍ فِي الْعَرَبِ
حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل ہے کہ وہ بُت جو قوم نوحؑ میں تھے منتقل ہوکر آئے تھے جو اب تک عرب
بَعْدُ اَمَّا وَدٌّ كَانَتْ لِكَلْبٍ بِدُوْمَةِ الْجَنْدَلِ وَاَمَّا سُوَاعٌ كَانَتْ لِهُذَيْلٍ
میں موجود ہیں۔ بہرحال "وَدّ" بنی کلب کا تھا جو دومۃ الجندل میں ہے۔ اور بہرحال "سواع" قبیلہ ہذیل کا تھا
وَاَمَّا يَغُوْثُ فَكَانَتْ لِمُرَادٍ ثُمَّ لِبَنِيْ غُطَيْفٍ بِالْجُوْفِ عِنْدَ سَبَا وَاَمَّا
اور "یغوث" قبیلہ مراد کا تھا پھر بنی غطیف کا ہوگیا جو مقام "جوف" میں سبا کے قریب ہے۔ اور بہرحال

يَغُوْثُ فَكَانَتْ لِهَمْدَانَ وَاَمَّا نَسْرٌ فَكَانَتْ لِحِمْيَرَ لِاٰلِ ذِى الْكَلَاعِ
یعوق، وہ قبیلہ ہمدان کا تھا، اور نسر، تو وہ آل ذی الکلاع کے قبیلہ حمیر کا تھا۔

وَنَسْرًا، اَسْمَاءُ رِجَالٍ صَالِحِيْنَ مِنْ قَوْمِ نُوْحٍ فَلَمَّا هَلَكُوْا اَوْحَى الشَّيْطٰنُ
اور نسر (وغیرہ یہ سب) قوم نوح کے نیک لوگوں کے نام تھے جب وہ لوگ مرگئے تو شیطان نے ان کی قوم کو یہ بات

اِلٰى قَوْمِهِمْ اَنِ انْصِبُوْا اِلٰى مَجَالِسِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا يَجْلِسُوْنَ اَنْصَابًا
سمجھائی کہ تم ان کے مجسمے بنا کر انکی اُن مجلسوں میں جن میں وہ بیٹھتے تھے نصب کرلو۔ اور تم ان مجسموں کے نام

وَسَمُّوْهَا بِاَسْمَآئِهِمْ فَفَعَلُوْا فَلَمْ تُعْبَدْ حَتّٰى اِذَا هَلَكَ هٰۤؤُلَاۤءِ وَتَنَسَّخَ
انہیں بزرگوں کے ناموں پر رکھ لو، تو انہوں نے ایسا ہی کرلیا اور ان مجسموں کو پوجا نہیں گیا۔ یہانتک کہ جب وہ

الْعِلْمُ عُبِدَتْ۔ (بخاری ص ۷۳۲)
لوگ مرگئے اور علم ختم ہوگیا تو ان کی پوجا ہونے لگی۔

هٰذَا وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى (۳۶۸) اِجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔
یہ یاد رکھو۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تم گندگی یعنی بتوں سے بچتے رہو۔ (الحج آیت ۳۰)

(۳۶۹) وَقَالَ لِنَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (المدثر آیت ۵)
اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا کہ بُت کو چھوڑے رکھیے۔

لغات خَمِيْصَة کالی چادر خَمَائِص جمع۔ اِغْتَمَّ سانس گھٹنا۔ (ن) غمگین ہونا، ڈھانپ لینا، (س) لمبے بال والا ہونا۔ اَبْرَزَ اِفعال سے ظاہر کرنا، نکالنا۔ (س ن) گمنامی کے بعد مشہور ہونا۔ (ك) فضل یا شجاعت میں اپنے ہمسروں سے بڑھ جانا۔ اَوْحٰى اِفعال سے اشارہ کرنا، چھپا کر بات کہنا، برانگیختہ کرنا، وحی بھیجنا وغیرہ (ض) انہیں معانی میں۔ تَنَسَّخَ زائل ہونا، مٹنا (ف) زائل کرنا، باطل کرنا، مٹانا، لکھنا، نقل کرنا۔ الرِّجْس رَجِس گندگی، پلیدی، شیطان کا وسوسہ، خفیف حرکت، برے عمل کی سزا، (ن ض) آواز کرنا، گڑگڑانا، (س ك) برا کام کرنا۔ اَلْاَوْثَانُ وَثَنٌ کی جمع بُت (ض) عہد پر قائم رہنا۔ الرُّجْزَ گندگی، عذاب، بتوں کی پرستش، گناہ (ن) رجز پڑھنا، گڑگڑانا۔

ترکیب السُّجُوْدُ لِغَيْرِ اللّٰهِ ای هٰذا بیان السّجود لغیر الله مبتدأ و خبر۔ مِنَ الْاِشْرَاكِ متعلق محذوف خبر مقدم اَنْ يَّسْجُدَ الخ جملہ بتاویل مفرد مبتدا مؤخر۔ طَفِقَ جواب لَمَّا اتَّخَذُوْا جملہ مستانفہ وكذلك يحدث الخ

تشریح حق تعالیٰ شانہٗ خالق و مالک و منعم ہونے کی وجہ سے مستحق عبادت ہیں۔ اور صفاتِ باری میں

دوسرا کوئی بھی ان کا شریک نہیں۔ اسلئے حق تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی عبادت کا قطعاً مستحق نہیں۔ اور چونکہ عبادت کے معنیٰ انتہائی عاجزی و تذلل کے ہیں۔ اسی لئے عبادت بھی صرف ربّ العزّت ہی کی ہوسکتی ہے۔ اور سجدہ اصلِ عبادت ہے۔ کیونکہ سجدہ کی حالت میں جس قدر ذلت و عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور کسی حالت میں نہیں ہوتا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ (مشکوٰۃ ۸۴) (بندہ اپنے ربّ سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے) کیونکہ سجدہ ناک اور پیشانی زمین پر رکھنے کو کہتے ہیں جو اشرف الاعضاء ہیں اور ان کا زمین پر رکھدینا تذلل و عاجزی کا آخری درجہ ہے۔ جو شرعًا اور عقلًا کسی مخلوق کے سامنے سخت نازیبا ہے۔ اسلئے غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ اور رکوع بھی سجدہ ہی کے حکم میں داخل ہے کیونکہ وہ سجدہ ہی کا مقدمہ اور تمہید ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ نماز جو اصلِ عبادت ہے اس میں چار قسم کے افعال ہیں۔ قیام، قعود، رکوع، سجود۔ ان میں سے پہلے دو (قیام قعود) تو ایسے کام ہیں جو بطورِ عادت بھی ہوتے ہیں اور بطورِ عبادت بھی۔ یعنی انسان اپنی ضرورتوں میں بھی کھڑا ہوتا اور بیٹھتا ہے اور نماز میں بھی۔ مگر رکوع و سجدہ ایسے کام ہیں کہ جو انسان عادت کے طور پر نہیں کرتا۔ بلکہ عبادت کے طور پر ہی کرتا ہے۔ اسلئے شریعتِ محمدیہ نے ان دونوں کو عبادت ہی کا حکم دیکر غیر اللہ کے لئے ممنوع و حرام قرار دیدیا ہے۔

سوال اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ سجدۂ تعظیمی کا جواز تو قرآن پاک کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا، ابلیس نے انکار کیا تو وہ راندۂ درگاہ اور ملعون ہوگیا، اور یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں نے بھی یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ ان دونوں سجدوں کا بیان قرآن پاک میں موجود ہے۔

جواب یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سجدے جو آدم و یوسف علیہما السلام کو ہوئے عبادت کے لئے نہ تھے۔ کیونکہ غیر اللہ کی عبادت تو قطعاً کفر و شرک ہے جس کی آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی شریعت میں گنجائش نہیں۔ بلکہ شریعتِ محمدیہ سے پہلے اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کا وہی درجہ تھا جو ہماری شریعتِ اسلامیہ میں سلام و مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی کا یا تعظیم کے لئے قیام کا ہے۔

چنانچہ امام ابو بکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعتوں میں بڑوں کی تعظیم و تحیہ کے لئے سجدہ مباح تھا، اور شریعتِ محمدیہ میں وہ منسوخ ہوگیا ہے۔ اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام و مصافحہ کی اجازت دی گئی ہے۔ رکوع و سجدہ اور نماز کی طرح ہاتھ باندھکر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اصل کفر و شرک اور غیر اللہ کی عبادت تو اصولِ ایمان کے خلاف ہے جس کا

جواز کبھی کسی شریعت میں ممکن نہیں، لیکن کچھ اعمال و افعال ایسے ہیں کہ وہ بذاتِ خود تو کفر و شرک نہیں، مگر لوگوں کی جہالت و غفلت سے وہ افعال و اعمال کفر و شرک کا ذریعہ بن سکتے ہیں ایسے افعال کو پہلی شریعتوں میں بالکل تو منع نہیں کیا گیا تھا بلکہ اُن کو کفر و شرک کا ذریعہ بنانے سے روکا گیا تھا۔ جیسے جانداروں کی تصویریں اور مجسّمے بنانے کی پہلی بعض شریعتوں میں اجازت تھی۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السّلام کے قصہ میں قرآن میں مذکور ہے

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ۔ (سبا۔ آیت ۱۳) | یعنی جنّات اُن کے لئے بڑی بڑی محرابیں اور مجسّمے تیار کرتے تھے۔

اسی طرح سجدۂ تعظیمی پہلی شریعتوں میں جائز تھا لیکن آخر کار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و بُت پرستی کا ذریعہ بن گئیں۔ اور انبیاء علیہم السّلام کی شریعتوں میں تحریف و رد و بدل ہوگئی جس کو دوسرے نبیوں نے آکر مٹایا اور اصلِ دین کو نکھارا۔ شریعتِ محمدیہ چونکہ آخری اور دائمی شریعت ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر نبوت و رسالت ختم ہوچکی ہے اسلئے آپ کی آخری شریعت کو مسخ و تحریف اور رد و بدل سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے تمام سُوراخوں کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک اور بُت پرستی آسکتی تھی اور وہ تمام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دیدی گئیں جن سے پہلی اُمتیں شرک و بُت پرستی کا شکار ہوچکی تھیں۔

چنانچہ جانداروں کی تصویریں بنانے اور ان کے استعمال کو اسی لئے حرام کیا گیا، سجدۂ تعظیمی بھی اسی وجہ سے حرام قرار دیا گیا۔ اور ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کر دیا گیا جن میں کفار و مشرکین اپنے معبودوں کی عبادت کرتے، اور سورج کو پوجنے والے سورج کو پوجتے تھے۔ تاکہ یہ ظاہری موافقت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بنجائے۔ یہی وجہ ہے کہ اغیار و کفار سے مشابہت رکھنے سے بڑی سختی سے منع فرمایا گیا۔ ارشاد ہے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ مَنْ كَثَّرَ سَوَادَ قَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔

مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے غلام کو عبدی یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں، اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا رب نہ کہیں۔ حالانکہ عبد کے معنی غلام اور رب کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنیوالے کے ہیں۔ لیکن منع صرف اسلئے فرمایا گیا کہ ان الفاظ میں شرک کا شائبہ ہے ممکن ہے کہ کسی وقت جہالت کیوجہ سے یہی الفاظ آقاؤں کی پرستش کا دروازہ کھولدیں اسلئے ان الفاظ کے استعمال کو روکدیا گیا۔ بہرحال شریعت محمدیہ کو حق تعالیٰ نے ایسا کامل و مکمل کر دیا ہے کہ اسپر تمام خطروں کے دروازوں کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔

ایک سوال اور اسکا جواب

البتہ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ سجدۂ تعظیمی حضرت آدم و حضرت یوسف علیہما السّلام کے واقعات میں قرآنی آیات سے

ثابت ہے۔ شریعتِ محمدیہ میں اس کا منسوخ ہونا کس دلیل سے ثابت ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ متواترہ و مشہورہ سے سجدۂ تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اللہ کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے (مگر میری شریعت میں کسی مخلوق کے لئے سجدہ جائز نہیں) جیسا کہ یہاں مشکوٰۃ الآثار میں (۳۶۳) میں ترمذی شریف باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأۃ ۱۳۵/۱ کی حدیث میں مذکور ہے۔ یہ حدیث بیس صحابہ کرام سے مروی ہے۔ اصولِ حدیث کی معروف و مشہور کتاب "تدریب الراوی" میں لکھا ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرامؓ نقل فرمادیں وہ حدیث متواتر اور اور قرآنی آیات کی طرح قطعی ہوجاتی ہے۔ اور اِس حدیث کو نقل کرنے والے تو بیس صحابہ کرامؓ ہیں۔ ان بیس صحابہ کرامؓ کی روایات حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے بیان القرآن کے حاشیہ میں جمع فرمادی ہیں۔ ضرورت ہو تو وہاں ملاحظہ فرماویں۔ (خلاصۂ توسلات منک)

تنبیہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ اِس شرک میں گرفتار ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم سجدہ نہیں کرتے کیونکہ سجدہ میں تو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہا جاتا ہے ہم اس سجدہ میں یہ نہیں کہتے، یہ ان لوگوں کا دھوکہ ہے۔ کیونکہ وہ لوگ خود بھی اس سجدہ کو سجدہ ہی کہتے ہیں۔ پھر سجدہ کی حقیقت تو زمین پر پیشانی رکھدینا ہے۔ خواہ تسبیح پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ خود ان لوگوں کے نزدیک بھی سجدہ میں تسبیح فرض و واجب نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے نماز میں پیشانی زمین پر رکھدی اور سبحان ربی الاعلیٰ نہ کہا تب بھی سجدہ ادا ہوجائے گا۔

معارف القرآن میں سورۂ حٰم السجدہ کی آیت ۳۷ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ الآیۃ کے تحت لکھا ہے کہ "اس آیت سے ثابت ہوا کہ سجدہ صرف خالقِ کائنات کا حق ہے اسکے سوا کسی ستارے یا انسان وغیرہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ خواہ وہ عبادت کی نیت سے ہو یا محض تعظیم و تکریم کی نیت سے، دونوں صورتیں باجماعِ امت حرام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو عبادت کی نیت سے کسی کو سجدہ کریگا وہ کافر ہوجائیگا اور جس نے محض تعظیم و تکریم کے لئے سجدہ کیا اس کو کافر نہ کہیں گے، مگر اس کو ارتکابِ حرام کا مجرم اور فاسق کہا جائیگا۔

(۳۶۳) لَاَمَرْتُ الْمَرْأَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا ای لکثرۃِ حقوقہ علیها وعجزها عن القیامِ بشکرها و فی هٰذا غایۃ المبالغۃ لوجوب اطاعۃ المرأۃ فی حق زوجها فانّ السجدۃ کمالُ الانقیاد ولا تحِلّ لغیر اللہ مطلقاً عند جمیع علماء الاسلام۔

(۳۶۴) حضرت عائشہؓ و حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ اپنی سیاہ چادر رُخِ انور پر ڈالتے تھے۔ اور اس سے سانس گھٹنے لگتی تو آپ چہرۂ مبارک کھول لیتے تھے۔ آپ بے چینی میں بار بار اسی طرح کرتے تھے۔ اسی حالت میں آپنے ارشاد فرمایا

کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنالیا۔ منشاء یہ تھا کہ آپ اپنی امت کو اس حرکت سے ڈرا رہے تھے کہ وہ ایسا عمل نہ کرے۔ جو باعثِ لعنت ہے۔ علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر تعظیمی سجدہ کرتے تھے۔ انکی قبروں کو قبلہ بنا کر نماز میں ان کی طرف رُخ کرتے تھے۔ اور ان کی قبروں کو انہوں نے بُت بنا لیا تھا۔ یعنی وہ انکو پوجنے لگے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انپر لعنت فرمائی۔ اور اپنی امت کو ایسی مشرکانہ حرکتوں سے منع فرمایا ہے۔ لیکن اگر قبورِ صالحین کی تعظیم و پرستش نہ کیجائے بلکہ صرف برکت حاصل کرنے کے لئے ان کی قبروں کے قریب میں مسجد بنالیں (یا اس طرح کسی ولی کی قبر کے قریب نماز ادا کریں کہ قبر سامنے نہو اور اس کی تعظیم کی نیت بھی نہو) تو جائز ہے۔ اور ایسا کرنے والے اس وعید میں داخل نہونگے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کسی قبر کی طرف رُخ کر کے یا قبر کے قریب میں اس کی برکت و تعظیم کے ارادہ سے ہرگز نماز نہ پڑھے۔ اور احادیثِ صحیحہ کی بنا پر اس کو حرام ہی قرار دیا جائے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کسی کو اختلاف نہوگا (کیونکہ یہ شرک ہے یا ذریعۂ شرک ہے۔ اور دونوں سے احتیاط واجب ہے اور ارتکاب حرام) علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ قبروں کے قریب میں کوئی ایسی جگہ ہو کہ قبر کی طرف توجہ سے محفوظ رہے تو ایسی جگہ کو نماز کے لئے مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ گنجائش ہے وکذا حاصل ما فی الطیبی والمرقاۃ۔ میں کہتا ہوں کہ قبروں کے قریب اگر مسجد بنی ہوتی ہے تو اس میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر مسجد بنی ہوئی نہیں ہے تو قبرستان میں نماز نہ پڑھی جائے۔ اگر ضرورۃً پڑھنی ہے تو قبروں سے دور نماز ادا کی جائے۔ اسی طرح قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنے سے پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ اس میں تشبہ بالمشرکین اور تشبہ بعباد القبور ہے۔ جس سے بچنے کا ہمیں بہت سی نصوص میں حکم دیا گیا ہے۔

نسیم احمد غازی مظاہری

(۳۶۵) یہ پوری حدیث اس طرح ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَرَضِهِ الَّذِي لَمْ يَقُمْ مِنْهُ لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ قَالَتْ عَائِشَةُ لَوْلَا ذَاكَ لَاُبْرِزَ قَبْرُهٗ خَشِيَ اَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِدًا۔ (بخاری شریف ص ۶۳۹)

حضرتِ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنالیا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر یہ اندیشہ نہو تا کہ آپ کی قبر مبارک کو سجدہ گاہ بنالیا جائیگا تو آپ کی قبر ظاہر کی جاتی۔

حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام گمراہیوں پر مطلع فرمایا تھا جو آپ کی امت میں آنیوالی تھیں۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

"میری امت پر وہ سب کچھ آنا ہے جو بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) پر آیا تھا جیسا کہ ایک جوتہ

دوسرے جوتے کی برابر ہوتا ہے (یعنی میری امت کے افعال و اعمال ہوبہو بنی اسرائیل کے افعال و اعمال کی طرح ہو جائیں گے) یہانتک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھلم کھلا زنا کیا ہے تو میری اُمت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایسا کریں گے۔ اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سب فرقے دوزخ میں جائیں گے۔ صرف ایک فرقہ نجات پائیگا صحابہؓ نے عرض کیا کہ نجات پانیوالا فرقہ کونسا ہوگا (یعنی نجات پانے والے فرقے کی نشانی کیا ہے) فرمایا ان کا طریقۂ زندگی وہی ہوگا جو میرا اور میرے صحابہؓ کا ہے۔ (یعنی اتباعِ سنت و شریعت اُن کا شعار ہوگا)

(مشکوٰۃ شریف ص۳۰)

چنانچہ یہود و نصارٰی کی اس مشرکانہ حرکت یعنی قبر پرستی سے آپنے اُمت کو بارہا ڈرایا۔ اور اخیر وقت میں بھی تنبیہ و تاکید فرمادی۔ اور اسی اندیشہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو محفوظ و مستور رکھا گیا۔ لیکن اس قدر تنبیہات و تاکیدات کے باوجود آپ کی اُمت کے بدنصیب لوگوں کا ایک فرقہ قبر پرست و مشرک ہو گیا، جو حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعی ہے۔ اور اس کا شعار تعلیماتِ رسولؐ کی مخالفت اور پیغمبرِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم سے عداوت و بغاوت ہے۔

(۳۶۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو بعض ازواج مطہرات نے ایک گرجا کا ذکر کیا۔ جو سرزمین حبشہ میں انہوں نے دیکھا تھا۔ جسکا نام "ماریہ" تھا۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ کنیسہ معبد الیہود والنصارٰی کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ "کُنِشت" کا معرب ہے۔ اور ماریہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ شاید یہ "ماروئی مثلہا" کا معرب (اور مخفف) ہے۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت ام سلمہؓ و حضرت ام حبیبہؓ حبشہ تشریف لے گئی تھیں اور اس کنیسہ کو انہوں نے دیکھا تھا تو انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کنیسہ کی خوب صورتی و نقش و نگار کو بیان کیا۔ اور اس کی عجیب و غریب تصویروں کا بھی تذکرہ کیا — تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک اُٹھا کر فرمایا اولئكِ بكسر الكاف خطابًا لاحداهما او لاحدى النساء اولعائشة وفى نسخة بفتح الكاف على خطاب العام او تنزيلًا لهن منزلة الرجال) یعنی ان یہود و نصارٰی کا یہ حال تھا کہ جب ان میں سے کوئی نیک آدمی نبی یا ولی مرجاتا تو اسکی قبر پر مسجد (عبادتخانہ) تعمیر کر لیتے اور اس کا نام کنیسہ رکھ لیتے تھے۔ اور ان میں ان نیک لوگوں کے مجسمے بنا کر رکھ لیتے تھے تاکہ ان لوگوں کی یادگار قائم رہے۔ اور ان کو دیکھ کر عبادت کی ترغیب حاصل ہوتی رہے۔ لیکن ان لوگوں کی نسلوں کو شیطان نے بہکایا اور ان کے ذہن میں یہ بات ڈالدی کہ تمہارے بڑے ان کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ بعد کے لوگ ان مجسموں کی پوجا کرنے لگے اور گمراہ ہوگئے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کی اس راہ کو بڑی شدت سے بند فرمادیا اور تصاویر اور مجسموں کے بنانے کو حرام قرار دیدیا۔ اولئك شرار خلق الله ان مجسموں کو بنانے والے اور ان کی عبادت

کرنے والے بدترین خلق ہیں کیونکہ وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے تھے۔

وعن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عذاباً یوم القیامۃ مَنْ قَتَلَ نبیاً اَوْ قتلہٗ نبیٌّ اَوْ قَتَلَ اَحَدَ والدیہ والمصوّرون وعالمٌ لم ینتفع بعلمہٖ۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۳۸۵)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں میں سب سے زائد سخت عذاب قیامت کے دن اس کو ہوگا جس نے کسی نبی کو شہید کیا یا جس کو کسی نبی نے مار ڈالا یا جس نے اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا اور (جاندار کی) تصویر بنانیوالوں اور اس عالم کو جس نے اپنے علم سے نفع نہیں اٹھایا۔

(۳۶۷) قومِ نوح کے اُن بتوں کا تذکرہ قرآن مجید کی سورۂ نوح میں بھی کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا۔

اور انہوں نے (قومِ نوح کے لوگوں نے) کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو۔ اور وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔

یعنی تم اپنے معبودوں کو اور خصوصاً ان پانچ بڑے اور مخصوص بتوں کی عبادت کو نوحؑ کے کہنے سے ہرگز نہ چھوڑنا۔ یہ رؤسانے نچلے طبقہ کے لوگوں کو تاکید کی، یا آپس میں معاہدہ کیا تھا کہ تم اپنے بتوں کو پوجتے رہو۔ اسکے کہنے سے ان کی عبادت ترک نہ کرو (ان دونوں جملوں میں عطف الخاص علی العام ہے)

امام البغویؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں بُت دراصل اللہ کے نیک بندے تھے جو آدمؑ و نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں گذرے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے معتقد و متبع تھے جنہوں نے ان بزرگوں کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک انہیں کے نقشِ قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔ کچھ عرصہ کے بعد شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کے تابع ہو کر عبادت کرتے ہو اگر اُن کی مورتیاں بنا کر اپنے سامنے رکھا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائیگی کیونکہ اس سے خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ یہ لوگ فریب میں آگئے اور ان کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھے۔ اور ان کو دیکھکر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے عبادت میں ایک خاص کیفیت محسوس کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اسی حال میں یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور بالکل نئی نسل نے ان کی جگہ لے لی تو شیطان نے اُن کو یہ پٹی پڑھائی کہ تمہارے بزرگوں کے معبود بھی یہ بُت تھے اور وہ انہیں کی عبادت کیا کرتے تھے، وہ بہکاوے میں آگئے اور بُت پرستی شروع ہو گئی۔ ان پانچ بتوں کی عظمت ان کے دلوں میں کیونکہ سب سے زیادہ بیٹھی ہوئی تھی اسلئے انہوں نے باہم معاہدہ میں خاص طور پر ان کا نام لیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس مذکورہ روایت میں ہے کہ طوفانِ نوحؑ میں یہ مورتیاں ڈوب گئی تھیں اور مٹی میں دب گئی تھیں، ایک مدتِ دراز کے بعد مشرکینِ مکہ کے لئے شیطان نے ان کو برآمد کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

فرماتے ہیں کہ جو بُت قوم نوحؑ کے تھے وہی عرب میں آگئے۔ وَدّ کی پرستش دومۃ الجندل میں بنی کلب کرتے تھے۔ سواع بنی ہذیل کا بُت تھا۔ یغوث اول تو مراد کا بُت تھا۔ پھر مقام جرف میں بنی غطیف کا معبود ہوگیا۔ (یہ مقام ملک یمن میں سبا کے قریب تھا) یعوق بنی ہمدان کا بُت تھا۔ اور نسر حمیر کے قبیلہ میں خاندانِ ذی الکلاع کا۔ ان کے علاوہ عرب کے اور بُت بھی تھے۔ لات بنی ثقیف کا اور عزّٰی بنی سلیم و بنی غطفان و بنی سعد و بنی بکر وغیرہ کا بُت تھا۔ اور مناۃ اہلِ قدید و مشلل کا بُت تھا، اہلِ مدینہ بھی اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ اُساف و نائلہ اور ہبل اہلِ مکہ کے بُت تھے۔ اُساف کو حجرِ اسود کے سامنے کوہِ صفا پر کھڑا کر رکھا تھا۔ اور نائلہ کو رکنِ یمانی کے سامنے اور ہبل کو خاص کعبہ کے اندر۔ یہ بڑا قد آور آٹھ گز اونچا بُت تھا۔ مشرکین جنگ کے وقت اس کا نام پکارتے تھے۔ محمد بن کعب قرظیؒ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السّلام کے پانچ بیٹے ان (مذکورہ ۵ اصنامِ قومِ نوحؑ) کے نام سے موسوم اور بہت عبادت گذار تھے۔ ان میں سے جب ایک کا انتقال ہوا تو لوگوں کو بہت غم ہوا۔ شیطان نے کہا کہ تم غم نہ کرو میں تمہاری تسلّی کے لئے انکا مجسمہ بنائے دیتا ہوں اس کو اپنی عبادت گاہ میں اپنے سامنے رکھ لینا اور اس کو دیکھ دیکھ کر تسلّی کرتے رہنا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کو سامنے نہیں رکھ سکتے۔ شیطان نے کہا کہ اپنی عبادتگاہ میں پیچھے ہی رکھ لینا۔ انہوں نے یہ بات مان لی، پھر تو ان میں سے جو مرتا گیا اس کا مجسمہ شیطان تیار کرتا گیا۔ آخر شدہ شدہ وہ مجسمے پیچھے سے آگے آگئے اور پُجنے لگے، اور بھی روایات ہیں جن کو ہم اختصاراً چھوڑ رہے ہیں۔

بعض مفسرینؒ نے بیان کیا ہے کہ وَدّ مرد کی صورت پر تھا۔ سواع عورت کی شکل پر تھا، یغوث شیر کی صورت پر تھا۔ یعوق گھوڑے کی صورت پر تھا اور نسر گدھ کی شکل پر۔ مگر یہ سابقہ روایات کے خلاف ہے، سابقہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجسمے انسانی شکلوں پر تھے۔

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں وھو الاصح۔ یعنی ان کے انسانی صورتوں پر ہونے کا قول درست ہے۔ اور بعض مفسرین کا یہ قولِ مذکور درست نہیں ہے کہ ان کی صورتوں میں مشرکین نے بعد میں تغیر کرلیا تھا۔

(درسی تفسیر پ ۲۹ سورۂ نوح) واللہ اعلم

(۳۶۸) رجس کے معنی ناپاکی اور گندگی کے ہیں۔ بتوں کو نجاست اسلئے قرار دیا گیا ہے کہ وہ انسان کے باطن کو نجاست سے بھر دیتے ہیں۔ اسی لئے دوسری جگہ فرمایا گیا ہے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (مشرکین تو نری نجاست ہی ہیں) اور صحیح بات یہ ہے کہ مشرکین میں ہر قسم کی نجاست ہوتی ہے۔

(۱) حقیقی اور ظاہری نجاست بھی کیونکہ وہ بہت سی ناپاک چیزوں کو ناپاک ہی نہیں سمجھتے اسلئے وہ ظاہری نجاستوں سے بھی نہیں بچتے۔ جیسے شراب، پیشاب وغیرہ۔ بلکہ پیشاب جیسی چیزیں تو ان کے یہاں متبرک ہیں۔ (۲) معنوی و حکمی نجاست بھی مثلاً غسلِ جنابت وغیرہ کے تو کفار قائل ہی نہیں (۳) اور باطنی نجاست بھی یعنی عقائدِ خبیثہ فاسدہ اور اخلاقِ رذیلہ کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے، اسلئے

آیتِ مذکورہ میں ان کو بڑی نجاست قرار دیا گیا ہے۔
(مسئلہ) کوئی مسلمان بھی ظاہری نجاست یا حالتِ جنابت میں کسی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور عام کفار و مشرکین ہوں یا اہلِ کتاب وہ بھی عموماً ان نجاسات سے پاک نہیں ہوتے۔ اس لئے بلا ضرورتِ شدیدہ ان کا داخلہ بھی کسی مسجد میں جائز نہیں۔ (معارف القرآن ص۳۵۵ ج۴)

(۳۶۹) رُجز بضم الراء وکسرھا۔ مجاہدؒ، عکرمہؒ، قتادہؒ، زہریؒ، ابن زیدؒ اور ابو سلمہؒ نے کہا کہ اس سے مراد بُت ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد گناہ ہے۔ ابو العالیہؒ و ربیعؒ نے کہا کہ بضم الراء کے معنی بُت اور بالکسر کے معنی گناہ اور گندگی کے ہیں۔ ضحاکؒ نے کہا کہ اس کے معنی شرک کے ہیں۔ کلبیؒ نے کہا کہ اس کے معنی عذاب کے ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ ایسے اعمال و عقائد ترک کر دیجئے جو موجبِ عذاب ہوں۔

(ب) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے ان سب مذکورہ چیزوں کو چھوڑے ہوئے تھے۔ آپ قطعاً معصوم تھے اسکے باوجود آپ کو یہ حکم دیا گیا، حالانکہ آئندہ بھی معصوم ہونے کی وجہ سے ان چیزوں کے ارتکاب کا احتمال و امکان نہ تھا۔

(ج) درحقیقت یہ امرِ امت کے لیئے ہے آپ کو اس حکم کا مخاطب بنا کر اس میں تاکید و قوت پیدا کر دی گئی۔ تاکہ امت یہ خیال کرے کہ یہ حکم جب نبی معصوم کو بھی ہے تو ہم کو تو اس حکم کا کیسا کچھ اہتمام کرنا چاہیئے۔ بعض صوفیہ نے رُجز بمعنی صنم سے صنمِ دنیا مراد لیا ہے ای الدنیا فاترك۔ صوفیہ کے نزدیک دُنیا سب سے بڑا بُت ہے۔ اور دُنیا عارف کے نزدیک بے حد قبیح اور بندہ و مولائے حقیقی کے درمیان بُت سے زیادہ حائل ہونے والی چیز ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں اَلدُّنْيَا اَحْقَرُ مِنْ ذِرَاعِ خِنْزِيْرٍ مَيِّتٍ بَالَ عَلَيْهَا كَلْبٌ فِيْ يَدِ مَجْذُوْمٍ (دنیا مُردار سُور کی اس ہاتھ کی ہڈی سے بھی زیادہ حقیر ہے جو کوڑھی کے ہاتھ میں ہو اور کتے نے اس پر پیشاب کر دیا ہو) اور امام شافعیؒ نے فرمایا ؎

وَمَا هِيَ اِلَّا جِيْفَةٌ مُّسْتَحِيْلَةٌ = عَلَيْهَا كِلَابٌ هَمُّهُنَّ اجْتِذَابُهَا

دُنیا ایسا سڑا ہوا مُردار ہے جسپر کتے لپٹے ہوئے ہوں — اور ہر ایک کا ارادہ اس کو کھینچنے کا ہو

فَاِنْ تَجْتَنِبْهَا كُنْتَ سِلْمًا لِاَهْلِهَا — وَاِنْ تَجْتَذِبْهَا نَازَعَتْكَ كِلَابُهَا

پھر اگر تو اس سے بچیگا تو دنیا والوں کیلئے ٹھیک اور صلح کرنیوالا رہیگا۔ اور اگر تو اس کو کھینچیگا تو تجھ سے دنیا کے کتے چھینا جھپٹی کرینگے

(درسی تفسیر سورۃ مدثر)

نسیم احمد غازی مظاہری

تَصْوِيْرُ التَّمَاثِيْلِ وَنَقْشُهَا

بتوں کی صورت بنانا اور ان کو مزین کرنا

وَمِنْ لَوَازِمِ الْاِجْتِنَابِ وَالْهَجْرِ الَّذِيْ اَمَرَ بِهِمَا اللّٰهُ الْاِحْتِرَازُ مِنَ التَّصَاوِيْرِ
اور جن چیزوں سے پرہیز کرنے اور (جن چیزوں کے) چھوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کے لوازم میں سے تصویروں سے بچنا بھی ہے جیسا کہ
كَمَا وَرَدَ۔ (احادیث ذیل میں) وارد ہوا ہے۔

(٣٧٠) عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا اشْتَرَتْ نُمْرُقَةً
نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک تکیہ (یا گدا) خریدا جسمیں تصویریں
فِيْهَا التَّصَاوِيْرُ فَلَمَّا رَاٰهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَلَى الْبَابِ
تھیں۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو آپ دروازے پر ٹھہر گئے
فَلَمْ يَدْخُلْ فَعَرَفْتُ فِيْ وَجْهِهِ الْكَرَاهِيَةَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتُوْبُ
اندر تشریف نہیں لے گئے۔ اور حضرت عائشہؓ نے آپ کے رُخِ انور میں ناگواری محسوس کی۔ تو عرض کیا یا رسول اللہ
اِلَى اللّٰهِ وَاِلٰى رَسُوْلِهٖ مَاذَا اَذْنَبْتُ قَالَ مَا بَالُ هٰذِهِ النُّمْرُقَةِ قَالَتْ
میں اللہ سے اور اللہ کے رسولؐ سے معافی مانگتی ہوں مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوگیا؟ فرمایا کہ یہ تکیہ کیسا ہے؟ عرض کیا کہ
اِشْتَرَيْتُهَا لِتَقْعُدَ عَلَيْهَا وَتَوَسَّدَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
میں نے اس کو اسلئے خریدا ہے کہ آپ اسپر تشریف فرما ہوں اور اسپر ٹیک لگائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيُقَالُ
بیشک ان تصویروں والے قیامت کے دن عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا
لَهُمْ اَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ وَقَالَ اِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ فِيْهِ الصُّوَرُ لَا تَدْخُلُهُ
کہ ان کو تم زندہ کرو جنکو تم نے بنایا تھا اور فرمایا کہ جس گھر میں (جانداروں کی) تصویریں ہوتی ہیں اس میں (رحمت کے)
الْمَلٰٓئِكَةُ۔ (بخاری ص٨٨٠ مشکوٰۃ ص٣٨٥)
فرشتے نہیں آتے۔

(٣٧١) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیشک
اِنَّ مِنْ اَشَدِّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ۔
قیامت کیدن سب لوگوں سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔
(نسائی ص٣٠٠ ج٢ مشکوٰۃ ص٣٨٦)

وَمِنْ هٰذَا الْاِحْتِرَازِ النَّهْيُ عَنْ اِتِّخَاذِ السُّرُجِ عَلَى الْقُبُوْرِ۔ كَمَا رُوِيَ

اور قبروں پر چراغ جلانے کی ممانعت اسی احتیاط کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ مروی ہے

(۲۷۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے

زُوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ۔

والیوں اور ان پر مساجد بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (ترمذی ص۴۳ ج۱ مشکوٰۃ ص۷۱)

لغات

التَّصَاوِيْرُ جمع تَصْوِيْر کی مورت۔ تفعیل سے تصویر بنانا۔ صَادَ صَوْرًا (ن) آواز دینا، جھکا دینا۔ (س) جھکنا۔ تفعّل سے ذہن میں آنا، خیال میں آنا، الصُّوْرَةُ چہرہ، شکل ج صِوَر، صُوَر۔ نُمْرُقَۃ بضمّ النّون والرّاء وفی نسخۃ بکسرهما وفی القاموس مثلثۃ۔ الوِسَادَةُ الصَّغِيْرَةُ او المثيرة او الطنفسة فوق الرّحل وقال السّيوطي بتثليث النّون والرّاء وقيل بكسرهما مع كسر النّون وقال النّووي بضم النّون وفتح الرّاء يعنی چھوٹا تکیہ، گدّا، زین کے نیچے ڈالنے کا گدیلا۔ تَوَسَّدَ ٹیک لگانا، تکیہ لگانا مرّ۔ السُّرُجُ جمع سِرَاج کی چراغ (س) سفید ہونا، روشن ہونا۔ اَلْقُبُوْرُ جمع قَبْر کی انسان کے دفن کرنے کی جگہ۔ (ن ض) دفن کرنا۔ اَقْبَرَ قبر بنانا۔ زُوَّارَاتٌ جمع زُوَّارَة کی۔ زیارت کے لئے جانے والی، ملاقات کے لئے جانے والی۔ (ن) ملاقات کے لئے جانا۔ (س) کج ہونا۔

ترکیب

تصویر اپنے مضاف الیہ سے ملکر بیان محذوف کا مضاف الیہ خبر۔ هٰذَا مبتدا محذوف، یا یہ خبر محذوف هٰذا کا مبتدا ہے، یا خُذْ، اِقْرَءْ وغیرہ کا مفعول بہ۔ وَمِنْ لَوَازِمِ الخ خبر مقدم۔ الاحتراز من التصاویر مبتدا موخر۔ كَمَا وَرَدَ۔ اسم موصول وصلہ مجرور مبتدا محذوف هٰذا یا هُوَ کی خبر۔ فيها التصاوير جملہ نُمْرُقَۃ کی صفت۔ مرکب توصیفی اشْتَرَتْ کا مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ اَنَّ کی خبر۔ قام على الباب اپنے معطوف سے ملکر جواب لَمَّا۔ مَا استفہامیہ مبتدا ای اَیُّ ذَنْبٍ، اَذْنَبْتُ جملہ فعلیہ خبر۔ مَا استفہامیہ مبتدا بَالُ ای حَال اپنے مضاف الیہ سے ملکر خبر۔ تقعد عليها جملہ فعلیہ اپنے معطوف تَوَسَّدَهَا جملہ فعلیہ سے ملکر بتاویل مفرد مجرور، متعلق فعل۔ اِنَّ حرف مشبہ بہ فعل۔ ہٗ ضمیر شان مقدر اس کا اسم۔ المُصَوِّرُوْنَ مبتدا موخر مِنْ اَشَدِّ النَّاسِ خبر مقدم۔ جملہ خبر اِنَّ، امام نسائیؒ نے فرمایا وقال احمد المصوّرين یعنی ہمارے استاذ احمد بن حربؒ نے المصوّرين بالياء (منصوبًا) پڑھا ہے۔ اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس صورت میں المصوّرين اِنَّ کا اسم موخر۔ اور مِنْ اَشَدِّ الخ خبر مقدم ہوگا۔

ومن ھذا الاحتراز خبر مقدم النھی الخ بتدا موخر اور کما روی مثل کما ورد۔ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْر مرکب اضافی معطوف علیہ والمتخذین اپنے متعلق ومفعول بہ المساجد والسُّرج سے ملکر شبہ جملہ معطوف، معطوفین مفعولِ لَعَنَ۔

تشریح جن چیزوں سے پرہیز کرنے اور ان کو چھوڑنے کا حکم حق تعالیٰ شانہٗ نے دیا ہے ان میں جانداروں کی تصویریں اور بتوں کے مجسّمے بنانا بھی داخل ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں شرک کا ذریعہ ہیں۔ جیساکہ اوپر مذکور ہوا۔ چنانچہ اس سلسلہ کی بہت سی روایات میں سے چند روایات یہاں ذکر کی گئی ہیں

(۲۷۰) ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک ایسا نُمرقہ یعنی چھوٹا تکیہ یا گدّا خرید لیا جس پر جانداروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اور گھر کے اندر دروازے کے سامنے ہی اس کو رکھدیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائیں۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپؐ کی اس پر نظر پڑ گئی، آپ کو ناگواری ہوئی، اور دروازے ہی پر آپؐ کھڑے ہو گئے۔

فعرفت بظاہر یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہو اور اس کا قائل راوی ہو۔ بہر حال امّاں جان نے آپؐ کے رُخِ انور پر ناگواری کے آثار محسوس فرما لیئے تو فوراً آپکو راضی کرنے کے لئے عرض کیا یا رسول اللہ میں اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی سے توبہ کرتی ہوں مجھ سے کیا خطا سرزد ہو گئی کہ میں رُخِ انور پر ناگواری کا اثر محسوس کر رہی ہوں، اور آپؐ اس ناگواری کے سبب گھر میں داخل نہیں ہو رہے ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ اس میں حضرت صدیقہ کا حسنِ ادب ہے کہ توبہ و معافی کو اطلاع علی الذنب پر مقدم کر دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیساکہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کو خطاب فرمایا عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ الخ کہ اس میں حق تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اظہارِ تلطّف فرماتے ہوئے عفو کو مقدم فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وجہ ناراضی و ناگواری یہ نمرقہ ہے۔ حضرتِ صدیقہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے یہ حضرت والا ہی کے لئے خریدا ہے کہ آپ اس پر تشریف فرما ہوں۔ اور گاہے اس کو تکیہ بنائیں۔ امّاں جان نے اس کا خیال نہ فرمایا کہ تکیہ باعثِ ناگواری نہیں بلکہ تکیہ پر جانداروں کی تصویریں ناگواری کا سبب ہیں اسلئے جوابِ مذکور دیا کہ اس سے حضرت کی راحت مقصود ہے نہ کہ گھر کی زینت۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ یہ تکیہ ناگواری کا سبب نہیں، بلکہ اس پر جو جانداروں کی تصاویر ہیں وہ وجہ ناگواری ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان تصویروں کو بنانے اور استعمال کرنیوالے قیامت کیدن عذاب دیئے جائیں گے اور (بنانے والوں سے) کہا جائیگا کہ جو تصویریں تم نے

بناتی ہیں اُن میں جان ڈالو (یہ حکم ان کو ملامت کرنے اور اس بات کا اظہار کرنے کے لئے ہوگا کہ تم صورتوں کے بنانے میں خالق کی مشابہت اختیار کرتے تھے ان کو زندہ کرکے دکھلاؤ) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے۔ اور اسکا استعمال چونکہ حرام پر اعانت ہے اسلئے وہ بھی حرام ہے۔ اس حدیث میں تصویر کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی گئی کہ ملائکہ ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں جاندار کی تصویر موجود ہو۔ اسی وجہ سے انبیاء اور اولیاء بھی ایسے گھروں میں داخل نہیں ہوتے جس میں جانداروں کی تصویریں ہوں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نمرقہ میں تصاویر دیکھکر گھر سے باہر ٹھہر گئے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر تصویر بنانے والا جہنم میں جائیگا اور اس نے جتنی تصویریں بنائی ہوں گی اتنی ہی اسکو جانیں دی جائیں گی اور اس کو دوزخ میں عذاب دیا جائیگا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر تم کو تصویریں بنانا ہی ہیں تو درخت وغیرہ بے جان چیزوں کی بنا لو۔ (مشکوۃ ص۳۸۵)

(۳۷۱) مشکوۃ الآثار میں عن عبد اللہ بن عباسؓ ہے۔ مشکوۃ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عن عبد اللہ بن مسعودؓ ہے۔ نسائی شریف ص۳۰۰ میں عن عبد اللہ ہے جس سے مراد ابن مسعودؓ ہیں۔ مشکوۃ میں صحیحین کی روایت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰہِ اَلْمُصَوِّرُوْنَ ہے۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں یہ روایت بہت سے طرق سے نقل کی جن میں لفظ اِنَّ اور مِنْ نہیں ہے۔ اسی طرح بخاری میں بھی بغیر مِنْ اور بغیر اِنَّ ہے۔ اور بعض میں اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ ہے۔ ان دونوں کی ترکیبیں ظاہر ہیں۔ البتہ نسائی اور بعض دوسری کتب میں اِنَّ مِنْ ہے تو عنوانِ ترکیب میں بتا دیا گیا کہ اِنَّ کا اسم ضمیر شان مقدر ہے اور امام کسائیؒ فرماتے ہیں کہ مِنْ زائدہ ہے۔

اس روایت کو محدثین نے تہدید پر محمول کیا ہے۔ کیونکہ لفظ عند اللہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ سخت ترین سزا کا مستحق تو ہے لیکن اللہ کے کرم سے معافی کی توقع بھی ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پوجا کے لئے بت بناتا ہے وہ اَشَدُّ عَذَابًا ہوگا کیونکہ وہ کافر ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ شخص مراد ہے جو خلق اللہ کی مشابہت کے قصد اور اعتقاد سے تصویر بناتا ہے تو ایسا شخص بھی کافر اور اَشَدُّ عَذَابًا ہوگا۔ اور ان دونوں چیزوں میں سے کسی کا قصد نہ کرے تو وہ فاسق ہوگا۔ کافر نہ ہوگا۔ پھر غیر ذی روح کی تصاویر بنانا حرام نہیں ہے۔ یہی تمام علماء کا مذہب ہے۔ البتہ حضرت مجاہدؒ شجرۂ مثمرہ کی تصویر بنانے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ غیر ذی روح کی تصاویر بھی کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ یہ لایعنی اور لہو ولعب میں داخل ہے۔ اور جن چیزوں کی پرستش

کیجاتی ہے۔ خواہ وہ جمادات کے قبیل ہی سے کیوں نہوں جیسے چاند اور سورج، تو ان کی تصویر بنانا بھی حرام ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم۔ (مرقات ص۴۸۶ ج۴)

قبروں پر چراغ جلانا

حضرت مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح تماثیل و تصاویر بنانے سے احتیاط ضروری ہے اسی طرح قبروں پر چراغ روشن کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ احادیث میں اس سے بھی منع فرمایا گیا، اور قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح تماثیل و تصاویر بنانے والے اور قبروں پر چراغ جلانیوالے دونوں ہی حضرت پیغمبر اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی مجرم و ملعون ہونے میں مشترک اور یکساں قرار پائے چنانچہ
(۳۷۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، قبروں پر مسجدیں بنانے والوں اور قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

قبروں پر چراغ جلانا حماقت ہے

ایک مؤمن کے لیے تو یہی کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر چراغ جلانے سے منع فرمایا ہے، بلکہ ایسا کرنیوالوں پر لعنت فرمائی ہے۔ نیز جنازہ کے پیچھے آگ لیجانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو امرِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اللہ و رسول اور دین و شریعت کا کھلا مخالف اور باغی ہے۔ لیکن اگر ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ کر بھی کوئی غور و فکر کرے تو یہ عمل خالص حماقت اور پاگل پن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر چراغ کسی مؤمن کی قبر پر روشن کرتا ہے تو اول تو اس کے ایمان و عمل کی روشنی اسقدر ہے کہ وہاں اس روشنی کے آگے سورج اور چاند کی روشنی کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ اسلئے اس کی قبر پر چراغ جلانا ایسی ہی حماقت ہے جیسا کہ دوپہر کے وقت سورج کے مقابلہ میں چراغ جلانا۔ پھر اگر یہ چراغ جلانے والا مؤمنوں اور اللہ کے ولیوں سے اتنا بدظن اور بدعقیدہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کی قبر میں تاریکی ہے تو اسکے چراغ کی روشنی ظاہر ہے کہ قبر کے اندر نہیں پہونچ رہی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوگیا کہ کوئی کسی بزرگ کا اندھا معتقد ان کے کمرہ کی تاریکی دور کرنے کے لیۓ ان کے کمرہ کی چھت پر چراغ روشن کر آتے اور سمجھے کہ میں نے حضرت کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ اور اگر کسی غیر مؤمن کی قبر پر چراغ جلاتا ہے تو ظاہر ہے کہ جس کی قبر کو اللہ نے تاریک کیا ہے اِس احمق کا چراغ اس کو کس طرح روشنی دے سکتا ہے۔ اور پھر اوپر کے چراغ کی روشنی اندر کس طرح پہونچ سکتی ہے؟ غور کر لیجیۓ کہ دنیا میں اس سے بڑی اور کوئی حماقت ہو سکتی ہے؟ دراصل جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغاوت اور اُن کی مخالفت کرتا ہے اس کی سب سے پہلی سزا یہی ہے کہ وہ عقلِ سلیم سے محروم ہوجاتا ہے۔ پھر تو سیدھی اور صاف بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

اَلشِّرْكُ الْخَفِيُّ

پوشیدہ شرک

رُبَمَا يَرَى الرَّجُلُ اَنَّهُ بَرِيْءٌ مِّنَ الشِّرْكِ وَهُوَ يَقْتَرِفُ الشِّرْكَ وَ

بسا اوقات آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ شرک سے بری ہے حالانکہ وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے اور اسکے

يَكْتَسِبُ اِثْمَهُ كَالَّذِي يُصَلِّي صَلوٰةً طَوِيْلَةً وَيُحِبُّ اَنْ يَّرَاهَا النَّاسُ

گناہ کو کماتا ہے جیسے وہ شخص جو لمبی نماز پڑھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کو دیکھیں

فَيَحْمَدُوْا هٰذَا الْمُصَلِّيَ وَيَكُوْنُ لَهُ مَنْزِلَةٌ وَعَظَمَةٌ عِنْدَهُمْ فَهٰذَا

اور اس نمازی کی تعریف کریں اور ان لوگوں کے نزدیک اس کی عزت اور بزرگی قائم ہوجائے تو یہی ہے

هُوَ الرِّيَاءُ وَهُوَ الشِّرْكُ الْخَفِيُّ وَسَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"ریا" اور "پوشیدہ شرک" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کا نام

الشِّرْكَ الْاَصْغَرَ۔

"شرک اصغر" رکھا ہے۔

(۳۷۳) عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخْوَفَ

حضرت محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے زیادہ خوفناک چیز

مَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ

جس سے میں تم پر ڈرتا ہوں "شرک اصغر" ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ "شرک اصغر" کیا ہے ؟

قَالَ الرِّيَاءُ۔ (مشکوٰة شریف ص۴۵۶)

فرمایا ریاء۔

(۳۷۴) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَا هُوَ

لائے اور ہم مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تم کو اس چیز کی خبر نہ دیدوں جو میرے

اَخْوَفُ عَلَيْكُمْ عِنْدِيْ مِنَ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ قُلْنَا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خوفناک ہے ہم نے عرض کیا ضرور خبر دیدیجئے اے اللہ کے رسول،

قَالَ الشِّرْكُ الْخَفِيُّ اَنْ يَّقُوْمَ الرَّجُلُ فَيُصَلِّيْ فَيُزَيِّدُ صَلوٰتَهُ لِمَا يَرٰى

آپ نے فرمایا کہ وہ "شرک خفی" ہے (اور وہ یہ ہے کہ) آدمی نماز پڑھنے کھڑا ہو اور اپنی نماز کو اسلئے دراز کردے کہ اس کو

مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ۔ (ابن ماجہ ص۳۲۰ مشکوٰۃ ص۴۵۶)

کوئی شخص دیکھ رہا ہے۔

(۳۷۵) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں شریکوں میں شریک ہونے سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی نیک کام کرتا ہے

فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهٗ وَشِرْكَهٗ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ مَاجَةَ فَاَنَا مِنْهُ بَرِيْءٌ

اور اس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے تو میں اس کو اسکے شرک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں۔ اور ابن ماجہ کی ایک

وَهُوَ لِلَّذِيْ اَشْرَكَ۔ (مسلم ص۴۱۲ ج۲ ابن ماجہ ص۳۲۰ مشکوٰۃ ص۴۵۴)

روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں وہ عمل اسی کے لئے ہے جسکو اس نے شریک کیا۔

(۳۷۶) عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت شداد بن اوسؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا

يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ

آپ فرماتے تھے کہ جس نے دِکھلانے کے لئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھلانے کے لئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا

وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ۔ (مشکوٰۃ ص۴۵۵)

اور جس نے دکھلانے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔

(۳۷۷) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم پناہ مانگو اللہ کی

بِاللّٰهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا جُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادٍ فِيْ

"جُبُّ الحزن" (غم کے کنویں) سے صحابہؓ نے عرض کیا "جُبُّ الحزن" کیا ہے یا رسول اللہ! فرمایا دوزخ میں ایک

جَهَنَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

ایسی وادی ہے کہ دوزخ بھی اس سے روزانہ سو بار پناہ مانگتی ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ اس میں

مَنْ يَدْخُلُهٗ قَالَ الْقُرَّاءُ الْمُرَاؤُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ۔ (ترمذی ص۶۱ ج۲)

کون لوگ داخل ہوں گے فرمایا وہ قراء جو اپنے اعمال دِکھلاتے ہیں۔

(۳۷۸) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّؓ قَالَ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَاَيْتَ

حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ آپ بتائیے کہ

الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ
ایک شخص کوئی نیک کام کرتا ہے اور اسپر لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ
وَيُحِبُّهُ النَّاسُ عَلَيْهِ قَالَ تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ۔ (مشکوٰۃ ص۴۵۴)
اور لوگ اس عمل کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں فرمایا کہ یہ مؤمن کی نقد بشارت ہے۔

(۳۷۹) عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بِحَسْبِ امْرِئٍ
حضرت انسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپنے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی بُرائی کے لئے یہی کافی
مِنَ الشَّرِّ أَنْ يُشَارَ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ فِي دِينٍ أَوْ دُنْيَا إِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ۔
ہے کہ اس کی طرف دین یا دنیا کے بارے میں انگلیوں سے اشارہ کیا جائے مگر اللہ تعالیٰ جس کی حفاظت فرمالیں۔
(ترمذی ص۶۸ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۵۵)

(۳۸۰) قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ خُشُوعِ النِّفَاقِ قِيلَ وَمَا هُوَ
حضرت ابو الدرداءؓ نے فرمایا کہ تم اللہ سے پناہ مانگو نفاق کے خشوع سے۔ عرض کیا گیا کہ نفاق کا خشوع کیا ہے ؟
قَالَ أَنْ يُرَى الْجَسَدُ بِهِ خَاشِعًا وَالْقَلْبُ لَيْسَ بِخَاشِعٍ۔ {کتاب الزہد والرقاق حدیث ۱۴۳}
فرمایا وہ یہ ہے کہ جسم تو نفاق کے سبب خشوع والا دکھائی دے اور دل خشوع والا نہو۔

(۳۸۱) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
لَوْ أَنَّ رَجُلًا عَمِلَ عَمَلًا فِي صَخْرَةٍ لَا بَابَ لَهَا وَلَا كُوَّةَ خَرَجَ عَمَلُهُ إِلَى
اگر کوئی شخص کوئی کام ایسی چٹان کے اندر کرے جس کا کوئی نہ دروازہ ہو اور نہ سوراخ، تو اس کا عمل لوگوں
النَّاسِ كَائِنًا مَا كَانَ۔ (مشکوٰۃ ص۴۵۶)
تک پہونچ جائیگا خواہ وہ کیسا بھی ہو۔

لغات بَرِئَ (س) نجات پانا (س ف ك) شفایاب ہونا، چنگا ہونا، بری کرنا، پاک کرنا۔ يَقْتَرِفُ کمائی کرنا، گناہ کرنا وغیرہ (ض) سے انہیں معانی میں۔ (س) قریب ہونا۔ الْمَسِيحُ اس کے بہت سے معانی ہیں۔ مثلاً تیل لگا ہوا، بہت سیاحت کرنے والا، چاندی کا ٹکڑا، پسینہ، بہت سچا۔ گز، خوب صورت، کانا، بدصورت، بہت جھوٹا، بہت جماع کرنیوالا، گھسا ہوا درہم۔ ج مُسَحَاء و مَسْحَى (ف) پیمائش کرنا، جھوٹ بولنا، پونچھنا، تلوار سے کاٹنا وغیرہ۔ (س) کپڑے کے کھردرے پن سے رانوں کا چھل جانا۔ اچھے معانی کے اعتبار سے یہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے اور برے معانی کے اعتبار سے دجال کا۔ الدَّجَّالُ بہت جھوٹا ج دَجَّالُونَ و دَجَاجِلَة (ن) جھوٹ بولنا وغیرہ

جُبٌّ گہرا کنواں، کچا کنواں، گڑھا ج اَجْبَابٌ وجِبَابٌ وجِبَبَۃٌ (ن) کاٹنا، غالب ہونا۔ اَلْحُزْنُ والحَزَنُ رنج وغم۔ ج اَحْزَانٌ۔ الحَزْنُ سخت و بلند زمین ج حُزُنٌ وحُزُونٌ (س ن) غمگین ہونا (ك) سخت ہونا۔ سخت زمین میں چلنا۔ صَخْرَۃٌ ٹھوس بڑا پتھر، چٹان ج صَخْرٌ وصُخُورٌ و صُخُورَۃٌ وصَخَرَاتٌ۔ کُوَّۃٌ وکَوٌّ روشندان، کھڑکی۔ ج کِوَاءٌ وکُوًی وکُوَّاتٌ۔ کَوٰی کَیًّا (ض) لوہے وغیرہ سے داغ دینا، ڈنک مارنا۔

ترکیب اَنَّہٗ بَرِیٌّ جملہ یَرٰی کے دو مفعولوں کے قائمقام۔ وھو یقترف الخ معطوفین، جملہ حالیہ۔ کَالَّذِیْ مِثَالُہٗ مبتدا محذوف کی خبر۔ اَنْ یَّرَاھَا جملہ اپنے دونوں معطوفوں فَیَحْمَدُوْا اور یَکُوْنَ سے ملکر بتاویل مفرد یحب کا مفعول بہ۔ الشِّرْكَ الْاَصْغَرَ مرکب توصیفی سَمَّاہُ کا مفعول ثانی، اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ ای اخوف الاشیاء التی اخاف الخ الشرك الاصغر خبر اِنَّ۔ ما الشرك الاصغر مبتدا و خبر قال الرِّیَاء ای ھو الرِّیَاء۔ اَلَا اُخْبِرُکُمْ قال الطیبی اَلَا لیست لتنبیہ بل ھی لا النافیۃ دخلت علیھا ھمزۃ الاستفھام یعنی بقرینۃ بلٰی فی جوابھم والمعنی الا اعلّمکم وَنَحْنُ الخ اخوف دونوں متعلقوں اور ظرف سے ملکر خبر ھو عندی ای فی شریعتی وطریقتی۔ قال الشرك الاصغر ھو مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ ان یقوم جملہ بدل ماقبل سے یا مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔ فَیُصَلِّیْ بالنصب عطف علی یقوم او بالرفع ای فھو یصلی وکذا قولہ فیزید یحتمل الوجھین لِمَا متعلق یزید۔ من عمل جملہ مستانفہ ہے۔ ترکتُہٗ وشِرْکَہٗ خبر مَنْ والواو بمعنی مع۔ او المعنی ترکتہ عن نظر الرحمۃ وترکت عملہ المشترك عن درجۃ القبول فالواو عاطفۃ۔

(٣٧٧) کی ترکیب ظاہر ہے۔ القرّاء المراؤن ای یدخلھا۔

(٣٧٩) بِحَسْبِ باء زائدہ ہے۔ جملہ مبتدا و خبر ہے۔ والاولی ان یکون المبتدا مؤخرًا۔

(٣٨٠) ان یبری الجسد بہٖ ای بسبب النفاق۔ مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔ والقلب جملہ حالیہ۔

(٣٨١) لاباب لھا ولاکوّۃ مثل لاحول ولاقوۃ جملہ صفت صخرۃ کی۔ کائنًا ای ذلك العمل اسم ما الذی کان من الاعمال الحسنۃ او السیئۃ خبر عَمَلُہٗ سے حال۔

تشریح ریاکاری اور دکھلاوا بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ اگر کسی عمل سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہ ہو بلکہ مخلوق میں سے کسی کی رضا و خوشنودی کی نیت بھی اس میں شامل ہو جائے یا کوئی دنیوی غرض عزت و وجاہت یا دولت وغیرہ مطلوب ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ چنانچہ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ: لبسا اوقات آدمی یہ سمجھتا ہے کہ

وہ شرک سے بَری ہے۔ حالانکہ وہ شرک کا ارتکاب کرتا اور اس کے گناہ کو حاصل کرلیتا ہے۔ مثلاً لمبی نماز اسلئے پڑھتا ہے کہ لوگ اس کو بزرگ خیال کرکے اس سے محبت کریں، اور اس کی تعریف کریں۔ اور لوگوں کی نگاہ میں اس کو عزت ووجاہت حاصل ہوجائے اسی کو ریاء اور "شرکِ اصغر" کہتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کا نام "شرک خفی" رکھا ہے۔ چنانچہ

(۳۷۳) حضرت محمود بن لبیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ خطرناک چیز جس کا میں تمپر اندیشہ کرتا ہوں وہ "شرکِ اصغر" ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہ شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: "ریاکاری"

(۳۷۴) حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ فتنۂ دجال کی خطرناکی کا تذکرہ کررہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا کہ میں تمہیں مسیح دجال سے بھی زیادہ خوفناک چیز نہ بتادوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا فرمائیے۔ تو آپنے فرمایا کہ "شرک خفی" اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی یہ دیکھ کر کہ کوئی شخص اُسے دیکھ رہا ہے نماز لمبی کردے۔ (اور اسکے زیادہ خطرناک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ فتنۂ دجال سے اہلِ ایمان کا کچھ بگڑیگا نہیں، اور دکھلاوے سے آدمی شرک میں گرفتار ہوجائیگا اور اس کی آخرت تباہ ہوجائیگی۔ دوسرے مسیح دجال کا فتنہ خارجی اور ظاہری فتنہ ہے۔ اور ریاء انسان کا داخلی اور پوشیدہ فتنہ ہے۔ تیسرے دجال کو ہر مؤمن بُرا سمجھتا ہے، اور "ریاءکاری" کو ریاءکار بُرا نہیں جانتا)

(۳۷۵) حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں آپنے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں شریکوں میں (جن کو عامل نے ناحق میرا شریک قرار دیدیا) شرکت سے بے نیاز ہوں۔ (مجھے کسی کی شرکت کی ضرورت نہیں اور نہ میں کسی کے عمل کا محتاج ہوں) جو شخص بھی ایسا عمل کریگا کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی اور کو شریک کریگا تو میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اور ابن ماجہ کی روایت میں (اس سے زائد واضح الفاظ یہ ہیں کہ) میں اس سے بَری ہوں اور وہ عمل اسی کے حوالہ کردیتا ہوں جس کو اس نے اس عمل میں شریک کیا ہے۔ (کہ وہ اپنے عمل کی جزاء اسی سے لے لے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جزا کوئی نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اس کا عمل رائگاں اور برباد ہوا۔ اور حق تعالیٰ کی ناراضگی وبیزاری اسکے علاوہ رہی) (مشکوٰۃ میں ہے وفی روایۃ فانا منہ بری وھو للذی عملہ (یعنی میں اس عمل سے یا اس عمل کے عامل سے (ھٰذا الثانی ھو الاظہر لئلا یکون تکرار فی قولہ ھو) وہ عمل اسی کے لئے ہے جس کو دِکھلانے اور سُنانے کے لئے کیا تھا۔ اس صورت میں یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے۔ بعض نے ھو للذی عملہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ھو لفاعلہ ای ترکت ذلک العمل لفاعلہ لا اقبلہ ولا اجازی فاعلہ بذلک العمل لانہ لم یعملہ لی اور یہ دکھلاوا

ہر عمل میں ہو سکتا ہے۔ اور جس عمل میں بھی ہوگا شرک ہوگا) چنانچہ

(۳۷۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دکھلاوے کے لئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے ریاکاری کے لئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس نے نام ونمود کے لئے صدقہ دیا اس نے شرک کیا، (بعض نے کہا کہ روزہ میں دکھلاوا نہیں ہوسکتا، لیکن زبان وعمل سے لوگوں کے سامنے اظہار کرنا ہی روزہ کا دکھلاوا ہے بشرطیکہ اس کی نیت فاسد ہو، ورنہ نفسِ اظہار میں مضائقہ نہیں۔

(۳۷۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جبّ الحزن" سے پناہ مانگو۔ صحابہؓ میں سے کسی نے عرض کیا "جبّ الحزن" کیا ہے اے اللہ کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ وہ دوزخ کی ایک وادی ہے۔ (وادی پہاڑوں یا ٹیلوں کے درمیان کی اس کشادگی کو کہتے ہیں جو سیلاب کے لئے گذرگاہ ہو جمع اَوْدِیَۃٌ واَوَادِیَۃ۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم کا وہ ایک خاص حصّہ ہے) جس کے عذاب کی شدت کا یہ عالم ہے کہ خود دوزخ کے دوسرے حصے بھی اس کی شدت سے گھبراتے اور اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ اس میں کون لوگ داخل ہوں گے؟ ارشاد فرمایا کہ اس میں ریاکار علماء جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ قُرّاء وعلماء امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔ جب وہ ایسی پست حرکت پر اُتر آئیں گے، اور شرک جیسی منحوس خصلت ان میں آجائے گی تو ان کی سزا بھی اوروں کی بہ نسبت شدید ترین ہوگی۔ جو جتنی بلندی سے گرتا ہے اس کو اتنی ہی سخت چوٹ پہونچتی ہے۔

(۳۷۸) حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص کوئی نیک کام خالص اللہ کی رضا کے لئے کرتا ہے۔ لوگوں کو دکھانے یا سُنانے کا جذبہ نہیں ہوتا پھر بھی لوگ اس کے عمل پر مطلع ہوکر اس کی تعریف کرتے ہیں، اور اس سے اس عملِ خیر کی وجہ سے محبت کرتے ہیں تو کیا اس سے اس کے ثواب میں کچھ کمی آجاتی ہے یا عمل باطل ہوجاتا ہے یا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مومن کے لئے نقد خوشخبری ہے۔ یعنی یہ نیک نامی اس کے عمل کے قبول ہونے کی پہچان ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کو دو ثوابوں سے نوازتے ہیں۔ ایک دُنیا میں مدح ومحبت کی صورت میں، دوسرا آخرت میں جزائے عمل کی شکل میں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ معجل بشارت تو تعریف اور محبت ہے، اور مؤجل یوم آخرت تک باقی رہنے والی نیک نامی ہے لیکن حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جب عمل اخلاص سے کر رہا ہے تو لوگوں کی تعریف ومحبت اس کو اچھی معلوم ہو یا نہ ہو دونوں چیزیں اس کے ثواب میں خلل انداز نہ ہوں گی۔ لیکن اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کی طرف التفات نہ کیا جائے، بلکہ عملِ خیر سے رضائے خداوندی کی امید اور کوتاہیِ عمل سے ردِ عمل کا خوف دل میں رہنا چاہیئے۔

ایک حدیث میں ہے حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یارسول اللہ میں اپنے گھر کے اندر نماز پڑھ رہا ہوں (جس میں ریاء کا کوئی شائبہ نہیں) کہ ایک شخص اچانک آجاتا ہے

تو اس سے میرے دل میں ایک مسرّت پیدا ہوتی ہے کہ اس نے مجھے نیک کام کرتے دیکھ لیا (تو کیا اس سے ثواب میں کچھ کمی ہو جائے گی) آپ نے فرمایا اے ابوہریرہ تم پر خدا رحم کرے۔ تم کو اس صورت میں دو ثواب ملے چھپ کر عبادت کرنیکا اور ظاہر کر کے عبادت کرنے کا (پہلی صورت میں اخلاص تام ہے دوسری میں لوگوں کو شہادت واقتداء کی توقع ہے۔ اور خوشی حاصل ہونا ایمان کی علامت ہے۔ حدیث میں ہے

اذا سرّتك حسنتك وساءتك سيئتك فانت مؤمن۔

وقال الله تعالیٰ قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ریاء کاری کا شبہ ریاکاری نہیں ہے۔ عمل میں ریاء اسی وقت ہو گی جبکہ عامل مخلوق کی رضا جوئی یا اپنی شہرت و وجاہت کا ارادہ بھی کرے۔ اور لوگوں کی تعریف و محبّت کی خاطر اپنے عمل کو بڑھا دے یا دکھلانے کے لئے اس کو زیادہ سنوارے۔

(٣٧٩) حضرت انسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آدمی کیلئے یہی بُرائی کافی ہے کہ اس کی طرف (دینی یا دنیوی امور میں) انگلیوں سے اشارہ کیا جانے لگے۔ کیونکہ جو کسی اچھی عادت، یا امتیازی شان میں مشہور ہو جاتا ہے تو وہ کبر و عجب اور ریاء و سمعۃ جیسی آفات سے کم محفوظ رہتا ہے۔ اور اس میں ذلیل عادتیں، بداخلاقیاں اور بُرائیاں بہت پیدا ہو جاتی ہیں۔ اِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللهُ۔ ہاں حق تعالیٰ جس کی حفاظت فرمالیں تو وہ ان آفات سے محفوظ بھی رہتا ہے۔ اسی لئے بعض حضرات صوفیہ نے عبادات کو چھپانے اور اپنی دنیوی خواہشات نفسانیہ کے اظہار کو مناسب خیال کیا ہے تاکہ ظاہری بدنامی ان کو ان مہلک اخلاق سے بچالے۔ گو محققین صوفیہ نے اس کو پسند نہیں کیا۔ کسی شخص نے حضرت حسن بصریؒ سے عرض کیا کہ حضرت لوگ آپ کی جانب انگلیوں سے اشارہ کرتے ہیں۔ اس شخص کا منشاء اسی حدیث کے مضمون کی طرف متوجہ کرنا تھا، تو حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء اس ارشاد سے وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ آپ کی مُراد تو بدعتی دیندار اور فاسق دُنیادار ہے کیونکہ جب وہ اپنے فسق و بدعت میں مشہور ہو جاتے ہیں تو لوگ ان کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ پھر بعض تو اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور بعض لوگ باز آجاتے ہیں۔ اور لوگوں کے اشارات ان کے لئے تنبیہ ثابت ہوتے ہیں۔

(ف) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ میں نہ دفع شر کی طاقت ہے نہ جلب خیر کی قدرت، اور نہ عوام الناس کی مدح وذم کا کوئی اعتبار ہے۔ لہٰذا ان امور میں مخلوق کی طرف التفات نہ کرنا چاہیئے بعض روایات میں ہے لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ الْخَلْقُ عِنْدَهٗ كَالْاَبَاعِرِ (کمال ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ مؤمن لوگوں کو اونٹوں اور حیوانات لا یعقل کی طرح سمجھ لیگا) یعنی ان کی مدح وذم کا اسکے نزدیک کوئی اعتبار نہ رہے۔ اور وہ دونوں کو یکساں سمجھیگا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب

ریاست وجاہ کا دلوں میں ہونا رذائلِ نفس میں سب سے زائد خطرناک چیز ہے۔ اور اس میں علماء و عُبّاد اور اہلِ سلوک اکثر گرفتار رہیں۔ صوفیہ حضرات بھی حبِ عظیم مجاھدوں اور شدید محنتوں سے نفس کو تابع کر لیتے ہیں، اور اس کو عباداتِ خداوندی کا خوگر اور شبہات و شہوات اور معاصی سے بچنے کا عادی بنا لیتے ہیں تو یہی حبِ ریاست وجاہ ان کو اظہارِ علم و زہد اور افشائے عمل و اخلاص کی راہ سے مشاہدۂ حق اور قبولیتِ خداوندی کے درجات سے محروم کر دیتی ہے۔ اور حبِّ جاہ سے پیدا شدہ ان لذتوں اور شہوتوں میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اس کا شعور و احساس معطل ہو جاتا ہے پھر وہ سمجھتا ہے کہ میں مقربینِ حق میں شامل ہوں، اور عباداتِ خداوندی میرا مشغلۂ حیات ہے۔ مگر وہ اللہ کے نزدیک منافقین مطرودین میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی عبادات رائگاں اور برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ کیدِ نفس انتہائی خطرناک ہے جس سے صدیقین مخلصین ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ بات اکابرِ صوفیہ کے یہاں مشہور ہے کہ صدیقین کے دماغ سے تمام رذائلِ نفس کے بعد حبِ ریاست وجاہ نکلتی ہے۔ ہاں وہ حضرات اس سے مستثنیٰ ہیں جن کی شہرت خود بخود ہو جاتی ہے۔ ان کی دینی خدمات ان کو وہ شہرت دیتی ہیں کہ جن سے مفر ممکن نہیں۔ مثلاً حضرات انبیاء و مرسلین، خلفائے راشدین، علمائے محققین اور سلف صالحین رضوان اللہ علیہم اجمعین والحمد للہ رب العلمین۔

(ملخصاً مرقاۃ ص۱۰۳ ج۵)

(۳۸۰) حضرت ابو الدرداءؓ کا قول ہے انہوں نے فرمایا کہ خشوعِ نفاق سے اللہ کی پناہ مانگو۔ کسی نے پوچھا کہ خشوعِ نفاق کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ ظاہر میں تو خشوع ہو اور دل میں نہ ہو۔ اور اظہارُ خلافِ الباطنِ ہی نفاق کی حقیقت ہے۔ گو نفاق کی سب سے بڑی قسم اظہارُ الایمان وابطانُ الکُفرِ ہے جو نفاقِ عقیدہ کہلاتا ہے۔ اور اظہارُ الطاعۃ وابطانُ المعصیۃ نفاقِ عملی ہے۔ اظہار الخشوع بابطانِ خلافہ بھی اسی نفاقِ عملی میں داخل ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ:

يَكُوْنُ فِي اٰخِرِ الزَّمَانِ اَقْوَامٌ اِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ وَاَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَكُوْنُ ذَاكَ قَالَ ذَالِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰى بَعْضٍ وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ۔

(مشکوٰۃ ص۴۵۵)

اخیر زمانہ میں بہت سے لوگ ظاہر کے دوست اور باطن کے دشمن ہوں گے، آپ سے دریافت کیا گیا یا رسول اللہ ایسا کیوں ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ بعض کو بعض سے رغبت (اور طمع) ہوگی، اور ایک کو دوسرے سے خوف ہوگا۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ اخلاص اور حُب فی اللہ و بغض فی اللہ سے محروم ہو جائیں گے۔ اور حبِّ ریاست وجاہ کی وجہ سے اغراضِ فاسدہ و مقاصدِ کاسدہ پیشِ نظر ہوں گے۔ تو کبھی طمع و حرص اور لالچ کی وجہ

سے اخلاص وصدق کا اظہار ہوگا، اور کبھی لوگوں سے اندیشہ ہوگا تو اپنی بزرگی کا اظہار کریں گے۔ اسی طرح آپسی تعلقات اور محبت و عداوت اغراض سے وابستہ ہوں گی۔ کبھی قلب کے خلاف اظہارِ محبت اور کبھی اظہارِ عداوت ہوگا۔ آج یہ سب چیزیں عام ہیں۔ اور اسی کو دورِ حاضر میں سیاست کہتے ہیں۔

(۳۸۱) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص اچھا یا برا عمل کتنا ہی چھپ کر کرے وہ لوگوں کے سامنے ضرور آجائیگا، یعنی حق تعالیٰ اس کا اظہار فرمادیں گے۔

فِی صَخْرَۃٍ لَا بَابَ لَھَا وَلَا کُوَّۃَ۔ کا مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر وہ کسی ایسے پتھر کے اندر چھپ کر عمل کرے جس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ یا سوراخ نہ ہو تب بھی وہ اچھا یا برا عمل لوگوں تک پہونچ جائیگا۔ کُوَّۃ بفتح الکاف وتشدید الواو طاق اور بضم الکاف روشندان یعنی ایسا طاق جو آر پار ہو۔ فالاُولیٰ اَولیٰ فانھا فی باب المبالغۃ اعلیٰ۔

کَائِنًا مَا کَانَ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل اچھا ہو یا برا ہو، کرنے والا اچھا ہو یا برا ہو، اسکے ظاہر کرنیکا ارادہ کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، وہ عمل اقوال کے قبیل سے ہو یا افعال کے قبیل سے۔ دنیا میں اس کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ عامل پر اُس اچھے یا بُرے قول وعمل کے اثرات رونما ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۴۵۶ میں عثمانِ غنیؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا پوشیدہ عمل اچھا یا برا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس اچھے یا برے عمل کی چادر (ہیئت وصورت اور علامت) ظاہر فرمادیتے ہیں جسکے ذریعہ وہ پہچانا جاتا اور دوسروں سے ممتاز ہوجاتا ہے۔ (کما یعرف بالرداء کون الرجل من الاعیان اوغیرہ من الاعوان) علاوہ ازیں بسا اوقات دوسرے طرق سے بھی اس کا اظہار ہوکر وہ عمل پذیرائی یا رُسوائی کا باعث بنجاتا ہے، اور آخرت میں تو اوّلین و آخرین کے سامنے اظہار ہوگا ہی۔ اِلَّا مَاشاء اللہ ان یسترہ برداء غفرانہ۔

شرکِ اکبر و اصغر سے بچنے کا عمل

حکیم ترمذیؒ نے صدیق اکبرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ھُوَ فِیْکُمْ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ یعنی شرک تمہارے اندر چیونٹی کی رفتارِ بے آواز سے بھی زیادہ پوشیدہ طریقہ پر آجاتا ہے۔ اور فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاتا ہوں کہ اگر تم وہ کام کرلو تو شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر (ریاء) سب سے محفوظ ہوجاؤ۔ تم تین بار روزانہ یہ دعا کیا کرو اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُکَ بِمَا لَا اَعْلَمُ۔

(خلاصۂ تورات ص۴۸)

وَمِمَّا يُقَارِبُ الشِّرْكَ وَرُبَّمَا يُبَلِّغُهُ الْإِهْلَالُ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَالذَّبْحُ عَلَى

اور ان چیزوں میں سے جو شرک کے قریب کر دیتی ہیں اور بسا اوقات شرک میں مبتلا کر دیتی ہیں غیر اللہ کے نام پر بولنا اور

النُّصُبِ وَالْإِسْتِقْسَامُ بِالْأَزْلَامِ وَالطِّيَرَةُ وَالْكَهَانَةُ۔

استھانوں پر ذبح کرنا اور جوئے کے تیروں سے تقسیم کرنا اور بد فالی لینا اور غیب کی خبریں دینا بھی ہیں۔

(۳۸۲) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ۔ تم پر حرام کیے گئے مُردار اور خون اور سُور کا گوشت اور وہ جانور

اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ

جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا اور جو گلا گھٹنے سے مرجائے اور جو کسی ضرب سے مرجائے اور جو اونچے سے گر کر مرجائے اور جو

وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا

کسی ٹکر سے مرجائے اور جسکو کسی درندے نے کھایا ہو مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا ہو۔ اور (حرام ہے) وہ جانور جو استھانوں

بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ط (مائدہ آیت ۳)

پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم جوئے کے تیروں سے تقسیم کرو، یہ سب گناہ ہیں۔

(۳۸۳) وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَ

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جُوا اور بُت

الْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ

اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں۔ تو ان سے تم بچتے ہی رہو تاکہ تم کو فلاح

تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ

نصیب ہو۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت و بغض

الْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ

ڈالے۔ اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ (مائدہ آیت ۹۰ و ۹۱)

تو کیا تم باز آجاؤ گے۔

لغات اَلْمَيْتَةُ المیت کا مؤنث مُردار ج مَيْتَاتٌ (ن ض س) مرنا اَلدَّمُ خون ج دِمَاءٌ۔ دم اسمائے محذوفۃ الاعجاز میں سے ہے۔ اس کی اصل دَمْيٌ یا بقول بعض دَمْوٌ تھی۔ کبھی کلمۂ اخیرہ کو میم سے بدل کر دَمٌّ مشدّد بھی کہتے ہیں۔ تصغیر دُمَيٌّ مثنیٰ دَمَانِ، دَمَيَانِ اور دَمَوَانِ آتا ہے (س) خون دینا۔ لَحْمٌ گوشت ج لُحُوْمٌ، لِحَامٌ، لُحْمَانٌ (ن) مضبوط کرنا (ف) گوشت

کھلانا (س) گوشت کا خواہشمند ہونا، موٹا ہونا۔ اَلْخِنْزِیْرُ سُور۔ ج خَنَازِیْر۔ اُهِلَّ اِفعال سے، نیا چاند نکلنا، مہینہ شروع ہونا، آواز بلند کرنا۔ هَلَّ هَلاًّ (ن) خوش ہونا، چلّانا وغیرہ۔ اَلْمُنْخَنِقَةُ وہ جانور جو گلا گھٹ کر مرگیا ہو۔ اِنْخِنَاق اپنا گلا گھوٹنا۔ خَنْقًا (ن) گلا گھوٹنا، پھندا لگ جانا۔ اَلْمَوْقُوْذَةُ مفعو وہ جانور جو کسی ضرب سے مرگیا ہو (ض) پھینکنا، مہلک ضرب لگانا۔ اَلْمُتَرَدِّيَةُ وہ جانور جو کنویں وغیرہ میں گر کر مرگیا ہو۔ تَرَدِّی (تفعّل) اوپر سے نیچے گرجانا۔ رَدٰی رَدْيًا و رَدَيَانًا (ض) دھکا دینا، مارنا، گرنا، بلندی سے پستی میں گرنا۔ رَدِیَ رَدیً (س) ہلاک ہونا، گرنا۔ اَلنَّطِيْحَةُ سینگ مارا ہوا، سینگ مارنے سے مرا ہوا۔ ٹکّر مارا ہوا نَطْحًا (ض ف) دفع کرنا، ہٹانا، سینگوں سے مارنا۔ اَلسَّبُعُ درندہ ج سِبَاعٌ وسُبُوْعٌ و اَسْبُعٌ وسُبُوْعَةٌ۔ سَبْعًا (ف ن) ساتواں ہونا، ساتواں حصہ لینا، سات بنانا، پھاڑنا، گالی دینا وغیرہ۔ ذَكَّيْتُمْ تفعیل سے ذبح کرنا، بھڑکانا، بڑی عمر کا اور موٹا ہونا۔ (ن) ذبح کرنا، بھڑکنا، تیز ہونا (س) ذہین ہونا۔ نُصُبٌ کھڑی کی ہوئی چیز، بُت ج اَنْصَابٌ (ن ض) تھکانا، تکلیف دینا، بلند کرنا، کھڑا کرنا، گاڑنا وغیرہ (س) تھکنا۔ اَلْاَزْلَامُ زَلَم کی جمع کھُر، بے پر کا تیر، فال نکالنے کا تیر (ن) خطا کرنا، کاٹنا، کم دینا۔ فِسْقٌ نافرمانی، گناہ۔ (ن ض ک) حق وصلاح کے راستہ سے ہٹ جانا، بدکار ہونا۔ اَلْخَمْرُ انگوری شراب، ہر نشیلی چیز ج خُمُوْرٌ (ن ض) چھپانا، شراب پلانا (س) پوشیدہ ہونا، چھپنا۔ اَلْمَيْسِرُ جُوا، تیروں کا جُوا، وہ ذبح شدہ جانور جس پر جُوا کھیلا جائے۔ يُسْرًا (ن ض ک) نرم ہونا، جُوا کھیلنا، کم ہونا آسان ہونا۔ يَصُدُّ (ن) روک دینا، منع کرنا، (ن ض) اعراض کرنا، چلّانا وغیرہ۔

ترکیب اَلْاِهْلَالُ لِغَيْرِ اللّٰهِ اپنے چاروں معطوفات سے ملکر مبتدائے مؤخر۔ مِمَّا الخ بہ ترکیب مشہور خبر مقدم، جملہ معطوفات مل کر حُرِّمَتْ کا نائب فاعل۔ اَلْخَمْرُ تینوں معطوفات سے مل کر مبتدا رِجْسٌ اپنی صفت کائن مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ سے مل کر خبر۔ يُوْقِعُ جملہ اپنے معطوف وَيَصُدَّكُمْ جملہ سے مل کر بتاویل مفرد مفعول بہ يُرِيْدُ کا۔ فَهَلْ جملہ شرط اِذَا سَمِعْتُمْ هٰذَا وغیرہ محذوف کی جزا۔

تشریح (۲۸۲) یہ سورۃ مائدہ کی تیسری آیت کا نصف اول ہے۔ جس میں نُو قسم کے جانوروں اور خون اور جوئے کے تیروں سے تقسیم کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ حصۂ آیت گیارہ محرّمات کو شامل ہے۔

(۱) میتہ میتہ یعنی مُردار۔ اس سے مُراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع

ذبح کرنا ضروری ہو۔ مگر وہ بغیر ذبح کیے خود بخود کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مرجائے۔ ایسے جانور کا گوشت طبی طور پر بھی انسان کے لئے سخت مضر ہے اور روحانی طور پر بھی۔ البتہ مچھلی اور ٹڈی کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں بغیر ذبح بھی حلال ہیں۔ کیونکہ ان میں دم مسفوح نہیں ہوتا۔ مسند احمد، ابن ماجہ، دار قطنی اور بیہقی وغیرہ کی احادیث صحیحہ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے لئے دو مُردار حلال کیئے گئے۔ ایک مچھلی دوسرے ٹڈی۔ اور دو خون حلال کردیئے گئے۔ ایک جگر دوسرے تلی۔ قرآن پاک میں ہے اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ جس سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور (مچھلی) بغیر ذبح حلال و جائز ہے۔ البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے پانی کے اوپر آجائے وہ حرام ہے۔ (مصباح)

مسئلہ ۱:- جو شکاری جانور قابو میں نہیں کہ ذبح کیا جائے، اور اس کو بسم اللہ پڑھکر تیر وغیرہ دھار دار چیز سے زخم لگادیں اور اس سے وہ مرجائے تو وہ بھی حلال ہے۔ مطلقاً زخمی ہوجانا کافی نہیں، کسی آلہ جارحہ (دھار دار ہتھیار) سے اس کا زخمی ہونا شرط ہے۔ اسی کے حکم میں وہ حلال گوشت بہیمہ (گائے بیل بھینس، اونٹ وغیرہ) ہے۔ جو بدک کر بے قابو ہوگیا یا کنویں وغیرہ میں گر گیا، اور باقاعدہ اس کے ذبح پر قدرت نہ رہی۔ یہ ذبح اضطراری کہلاتی ہے۔

مسئلہ ۲:- کلب معلَّم، سکھایا ہوا باز وغیرہ بھی اگر بسم اللہ پڑھکر شکار پر چھوڑا جائے، اور وہ اسکو زخمی کرکے چھوڑ دے، اور وہ شکار قابو میں آنے سے پہلے مرجائے تو وہ بھی حلال ہے۔

مسئلہ ۳:- بندوق کی گولی سے جو جانور مرجائے، یا پتھر اور لاٹھی وغیرہ مارنے سے ذبح کرنے سے پہلے مرجائے وہ بھی مردار اور موقوذہ کے حکم میں ہے، ہاں مرنے سے پہلے ذبح کرلیا جائے ــ تو حلال ہے۔

مسئلہ ۴:- آج کل بندوق کی ایک نوک دار گولی چلی ہے۔ اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے۔ کہ وہ تیر کے حکم میں ہے۔ مگر جمہور علماء کے نزدیک وہ تیر کے حکم میں نہیں، اس کا مارا ہوا بھی مُردار ہی شمار ہوگا۔ کیونکہ وہ آلۂ جارحہ نہیں، بلکہ خارقہ ہے۔ جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے۔

مسئلہ ۵:- آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسلئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اسی طرح اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ اور یہی حکم ہے تمام نجاستوں کا۔ جس طرح ان کا استعمال حرام اسی طرح خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہانتک کہ باختیار خود مُردار جانور یا کوئی ناپاک چیز کسی جانور کو کھلانا بھی حرام ہے، ہاں ایسی جگہ رکھدیں جہاں کوئی کُتّا بلّی خود کھالے تو کوئی حرج نہیں، البتہ خود اٹھاکر کھلانا جائز نہیں۔

مسئلہ ۶:- اس آیت سے حرمتِ میتہ میں عموم معلوم ہوتا ہے جسمیں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں۔

لیکن دوسری آیت میں عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ کے الفاظ سے اس کی تشریح کردی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میتہ کے صرف وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہوں۔ اسلئے مُردار جانور کی ہڈی، بال وغیرہ جو کھانے کی چیزیں نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے۔ آیتِ شریفہ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ہ میں جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ذبیحہ کی شرط نہیں۔ البتہ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے۔ اسلئے وہ دباغت دینے کے بعد حلال وجائز ہوگی۔ احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے۔

مسئلہ:- مُردار کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں۔ ان کا استعمال اور خرید وفروخت سب حرام ہیں۔

مسئلہ:- یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں صابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے۔ مگر مُردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہونے کی وجہ سے گنجائش ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابۂ کرام (ابن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو موسٰی اشعریؓ وغیرہ) نے مردار کی چربی کا استعمال صرف کھانے میں حرام قرار دیا ہے۔ اور خارجی استعمال کی اجازت دی ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کی خرید وفروخت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ:- دودھ کا پنیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے جس کو عربی میں اَنْفَحَہ کہتے ہیں۔ یہ چیز ایک جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے جس کو دودھ میں شامل کرنے سے وہ جم جاتا ہے۔ اگر وہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ مذبوح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں۔ لیکن غیر مذبوح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ وامام مالکؒ اس کو پاک قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔

یورپ وغیرہ سے جو پنیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبوح کا اَنفحہ استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے۔ اسلئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ گو امام اعظمؒ وامام مالکؒ کے قول پر گنجائش ہے۔ ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض پنیر ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے اور ڈبہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ونجس ہے۔

(۲) خون

دوسری چیز جس کو اس آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ خون ہے۔ لفظ دَم بمعنی خون اگرچہ اس آیت میں مطلق ہے مگر قرآن کریم میں دوسری جگہ اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا فرما کر یہ بتا دیا گیا کہ خون سے مراد بہنے والا خون ہے۔ فقہاءؒ وصحابہؓ وتابعینؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس دم سے مراد دمِ مسفوح ہے۔ اور باتفاق فقہاء خون منجمد جیسے جگر، تلی وغیرہ حلال اور پاک ہیں۔

میتہ کے ذیل حدیث مذکور میں مچھلی اور ٹڈی کے ساتھ کبد وطحال کا بھی استثناء مذکور ہے۔

مسئلہ:۔ جبکہ حرام صرف بہنے والا خون ہے۔ تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے باتفاقِ علمائے اسلام وہ پاک ہے۔ اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں۔ لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو دھونا چاہیے۔

مسئلہ:۔ جس طرح دمِ مسفوح کا کھانا، پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے۔ اور جس طرح دیگر تمام نجاستوں کی خرید و فروخت اور اُن سے نفع اُٹھانا حرام ہے، اسی طرح دمِ مسفوح کی خرید و فروخت وغیرہ حرام ہے۔ اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے۔ کیونکہ قرآن میں لفظِ دم میں مسفوح کے علاوہ کوئی قید نہیں۔ اسلئے وہ حرمتِ استعمال کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔

خون چڑھوانے کا مسئلہ

مریض کو کسی دوسرے کا خون چڑھوانے کے مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے اس کو نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے۔ اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں داخل کرنا دو وجہوں سے حرام ہو۔ اول اسلئے کہ اعضائے انسانی کا احترام واجب ہے۔ اور یہ استعمال اسکے احترام کے خلاف ہے۔ دوسرے خون نجاستِ غلیظہ ہے۔ اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔ لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعتِ اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امورِ ذیل ثابت ہوئے۔ اول یہ کہ خون اگرچہ جزءِ انسانی ہے مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضائے انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے انسان کے بدن میں ڈالا جاتا ہے۔ اسلئے اسکی دودھ کی سی مثال ہوگئی۔ جو بدنِ انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرے انسان کا جزءِ بدن بنجاتا ہے۔ اور شریعتِ اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیشِ نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے۔ اور ماں جبتک بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے اسپر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا ہے۔ طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بچوں کا رزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے۔ وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے۔ یا ان کی ماں کو ہی معاوضہ دیکر اس سے دودھ پلوائے۔ قرآن کریم میں واضح تصریح موجود ہے۔

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ

اگر تمہاری مطلقہ بیویاں تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دیدیا کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزءِ انسانی ہونے کے باوجود ضرورۃً بچوں کے لئے اس کے استعمال کی اجازت دیگئی ہے۔ اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی اجازت ہے جیساکہ عالمگیری میں ہے۔

ولا بأس بان یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشربہ للدواء۔
(عالمگیری ۱۱۴)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دوا کے لئے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔

اور مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے۔ (مغنی کتاب الصید ۶۰۲/۸)
اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اور دودھ کی طرح خون بھی جزء بدن ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ دودھ پاک اور خون ناپاک ہے۔ تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزء انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی۔ صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا۔ علاج و دواء کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ اسلئے ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنیکا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں۔ مگر علاج و دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے۔ اضطراری حالت سے مُراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو۔ اور کوئی دوسری دواء اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہو۔ اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظنِ غالب ہو۔ ان شرطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نصِ قرآنی کی رو سے جائز ہے جس میں مضطر کے لئے مُردار جانور کھاکر جان بچانے کی اجازت صراحۃً مذکور ہے۔ اور اگر اضطراری حالت نہو یا دوسری دوائیں بھی کام کرسکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں بحث تداوی بالمحرم میں مذکور ہے۔ (معارف القرآن جلد اوّل)

(۳) سور کا گوشت

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی وہ لحم خنزیر ہے۔ آیت میں حرمت خنزیر کے ساتھ لحم کی قید مذکور ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے گوشت کی تخصیص مقصود نہیں۔ بلکہ اس کے تمام اجزاء بالاجماع حرام ہیں لیکن لفظ لحم سے اس طرف اشارہ ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے۔ کہ وہ ذبح کرکے پاک ہوسکتے ہیں، اگرچہ اُن کا کھانا حرام ہی رہیگا۔ اور خنزیر کا گوشت اس کو ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ نجس العین بھی ہے اور حرام بھی۔ صرف چمڑا سینے کے لئے اسکے بالوں کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

(۴) غیر اللہ کے نامزد کیئے ہوئے جانور

چوتھے وہ جانور ہیں جو غیر اللہ کے لئے نامزد کردیئے گئے جس کی تین صورتیں متعارف ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے۔ اور ذبح کرتے وقت بھی غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ یہ صورت باجماعِ امّت حرام اور یہ ذبیحہ میتہ ہے۔ اس کے کسی جزء سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ صورت مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ کا مدلول صریح ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے لیکن ذبح کرتے وقت اللہ ہی کا نام لیا جائے۔ جیسے بہت سے جاہل مسلمان بزرگوں

اور پیروں کے نام پر اُن کو خوش کرنے کے لئے بکرے، مُرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں۔ لیکن ذبح کیوقت اسپر اللہ ہی کا نام لیتے ہیں۔ یہ صورت بھی بالاتفاق حرام اور یہ ذبیحہ مردار ہے۔ اسلئے کہ یہ بھی آیت مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ کا مدلول صریح ہے۔ جیساکہ حواشی بیضاوی میں ہے

فَكُلُّ مَا نُودِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللهِ فَهُوَ حَرَامٌ وَاِنْ ذُبِحَ بِاسْمِ اللهِ تَعَالٰى حَيْثُ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْاَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيْحَةً وَقَصَدَ بِذِبْحِهِ التَّقَرُّبَ اِلٰى غَيْرِ اللهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَذَبِيْحَتُهُ ذَبِيْحَةُ مُرْتَدٍّ۔

ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا حرام ہے۔ اگرچہ اس کو اللہ کے نام سے ذبح کیا گیا ہو۔ کیونکہ تمام علماء کا اسپر اتفاق ہے کہ اگر کوئی مسلمان کوئی جانور ذبح کرے اور اس سے غیر اللہ کے تقرب کا قصد کرے تو وہ مرتد ہو جائیگا اور اُسکا وہ ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائیگا۔

نیز در مختار کتاب الذبائح میں ہے۔

ذُبِحَ لِقُدُوْمِ الْاَمِيْرِ وَنَحْوِهٖ كَوَاحِدٍ مِّنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِاَنَّهٗ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ وَلَوْ ذُكِرَ اسْمُ اللهِ وَاَقَرَّهُ الشَّامِي ص ۲۱۴ ج ۵

جو جانور کسی امیر یا بڑے آدمی کے آنے کیوجہ سے ذبح کیا گیا وہ حرام ہوگا۔ کیونکہ وہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ میں داخل ہے۔ اگرچہ اس ذبیحہ پر (بوقت ذبح) اللہ ہی کا نام لیا گیا ہو۔ اور علامہ شامی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

بعض دوسرے حضرات نے اس کو مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ کا مدلول صریح قرار نہیں دیا، بلکہ اسلئے حرام قرار دیا ہے کہ علت مشترک ہے یعنی اس میں تقرب الی غیر اللہ کی علت موجود ہے۔ اسلئے یہ بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ کے حکم میں داخل ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط واسلم ہے۔ نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل دلیل (آگے آنیوالا جملہ) وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام جانور بھی حرام ہیں جن کو معبودان باطل پر ذبح کیا گیا ہو۔ حاصل یہ ہے کہ مَآ اُهِلَّ الخ کا مدلول صریح قسم اول ہے اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا مدلول صریح قسم ثانی ہے۔ اور علت دونوں میں مشترک (التقرب الی غیر اللہ) ہے۔

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصِّيَاحِ بِاسْمِ الْمَقْصُوْدِ بِالذَّبِيْحَةِ وَغَلَبَ ذٰلِكَ فِيْ اِسْتِعْمَالِهِمْ حَتّٰى عُبِّرَ بِهٖ مِنَ النِّيَّةِ الَّتِيْ هِيَ عِلَّةُ التَّحْرِيْمِ۔

(قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)

عرب کی عادت تھی کہ جسکے لئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرتے وقت اسی کا نام باواز بلند پکارتے، اور یہ رواج انمیں عام تھا یہانتک کہ اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہے لفظ اہلال سے تعبیر کیا گیا۔

امام قرطبیؒ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابۂ کرامؓ میں سے دو حضرات حضرت علیؓ و حضرت عائشہؓ کے فتاوٰی پر رکھی ہے۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا۔ جس پر کسی غیر اللہ کے نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علیؓ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل قرار دیکر حرام فرمایا کیونکہ اس سے مقصود تقرب الی غیر اللہ تھا۔ اور سب صحابۂ کرامؓ نے ان کے اس فتوی کو تسلیم کیا۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے حضرت عائشہؓ کی ایک طویل حدیث نقل کی جس کے اخیر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہؓ سے پوچھا کہ ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگ ہیں، ان کے یہاں روز، روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور وہ ان تہواروں کے دنوں میں ہمارے پاس ہدیہ تحفہ بھیج دیتے ہیں۔ ہم اس کو کھائیں یا نہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ:

"جو جانور ان کے تہوار کے دن ذبح کیا جائے وہ نہ کھاؤ، لیکن انکے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو"

حاصل یہ ہے کہ یہ صورت ثانیہ جسمیں تقرب الی غیر اللہ کی نیت تو ہے مگر وقت ذبح اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ بعض کے نزدیک مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے۔ بعض کے نزدیک اشتراک علت کیوجہ سے اس میں داخل ہے۔ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا مدلول صریح ہونے کی وجہ سے بھی حرام ہے۔ بہر کیف اس کی حرمت بھی متفق علیہ ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کا کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر غیر اللہ کے تقرب و تعظیم کے لئے اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اسکے ذبح کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کو حرام جانیں۔ یہ جانور پہلی دونوں قسموں سے الگ ہے۔ یہ فعل بھی بنص قرآن حرام ہے، جیساکہ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ الآیۃ (مائدہ آیت ۱۰۳) سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ جانور اُن کے اس فعل حرام وعقیدۂ باطلہ سے حرام نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے باطل عقیدہ کی تائید ہوتی ہے بہرکیف یہ جانور دوسرے جانوروں کی طرح حلال ہے۔ یہ جانور شرعی اصول کے مطابق اپنے مالک کی ملک سے نہیں نکلا۔ یہ اسی کا مملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ کی بنا پر سمجھتا ہے کہ وہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہوگیا۔ اب اگر اس کو چھوڑنیوالا کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت کردے یا ہبہ کردے تو اس کو ذبح کرکے کھا سکتے ہیں۔ جیساکہ دیوتاؤں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور جن کا مندروں کے پجاریوں کو اختیار ہوتا ہے اکثر ان کو وہ مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں، تو ان کو ذبح کرکے کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح بعض بدعتی وجاہل مسلمان بھی مزارات کے نام مُرغا، بکرا چھوڑ دیتے ہیں اور مزارات کے مجاوروں کو ان کا اختیار دیدیتے ہیں۔ اور مجاور لوگ ان کو فروخت کردیتے ہیں تو جو لوگ ان جانوروں کو خرید لیں وہ ان کو ذبح کرکے کھا سکتے ہیں، اور فروخت بھی کرسکتے ہیں سب حلال ہے۔

غیر اللہ کی نذر کا مسئلہ

یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے۔ جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے بھی ہے۔ مثلاً کھانا، مٹھائی وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور پر ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں۔ حضراتِ فقہاء نے اس کو بھی اشتراکِ علت (تقرب الیٰ غیر اللہ) کیوجہ سے مَآ اُہِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ کے حکم میں داخل کر کے حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس پرشاد اور چڑھاوے کا کھانا، پینا، دوسروں کو کھلانا پلانا، بیچنا، خریدنا اور کسی طرح بھی اس سے نفع اٹھانا سب حرام ہوگا۔ کتبِ فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔

(۵) مُنْخَنِقَہ یعنی وہ جانور جو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو، یا خود ہی جال وغیرہ میں پھنس کر اس کا دم گھٹ گیا ہو۔ یہ اور اس کے بعد آنے والی چار قسمیں گو مَیتَہ میں داخل ہیں۔ مگر اہلِ جاہلیت انکو حلال سمجھتے تھے۔ اِسلئے ان سب کو الگ الگ تفصیل سے بیان کر کے ان کی صراحۃً تردید اور اہلِ اسلام کو ان تمام کی حرمت پر تنبیہ کی گئی ہے۔

(۶) موقوذہ یعنی وہ جانور جو ضربِ شدید کے ذریعہ ہلاک ہوا ہو جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو یا شکار تیر سے اسطرح قتل ہوا ہو کہ دھار کا حصہ اسپر نہیں لگا۔ چنانچہ حضرتِ عدی بن حاتمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات "معراض" تیر سے شکار کرتا ہوں، اگر شکار اس سے مرجائے تو کیا میں وہ شکار کھا سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ شکار عرضِ تیر کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذہ میں داخل ہے۔ اس کو نہ کھاؤ۔ اور اگر تیر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت جصاصؒ نے "احکام القرآن" میں اپنی اسناد سے نقل کی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تیر انداز نے تیر بسم اللہ پڑھکر پھینکا ہو۔ جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا ہو اس کو بھی فقہاء نے موقوذہ میں داخل مان کر حرام قرار دیا ہے۔ امام جصاصؒ نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے المقتولۃ بالبندقۃ تلك الموقوذۃ یعنی بندوق کے ذریعہ جو جانور قتل کیا گیا وہ موقوذہ (اور حرام) ہے۔ امام اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ وغیرہ سب ائمہ اسپر متفق ہیں۔

(۷) مُتَرَدِّیَہ۔ یعنی وہ جانور کسی پہاڑ یا ٹیلہ یا اونچی عمارت وغیرہ سے نیچے گر کر یا کنویں وغیرہ گہرائی میں گر کر مرجائے وہ بھی حرام ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ اگر کوئی شکار پہاڑ پر کھڑا ہے اور تم نے بسم اللہ پڑھکر تیر مارا۔ اور وہ تیر کی زد سے پہاڑ سے نیچے گر کر مرگیا تو اس کو نہ کھاؤ (ہو سکتا ہے کہ اس کی موت تیر کی زد سے نہ ہوئی ہو، بلکہ نیچے گرنے کی وجہ سے ہوئی ہو تو وہ متردیہ میں داخل ہو جائیگا) اسی طرح اگر کسی پرندہ پر تیر پھینکا اور وہ پانی میں گر کر مرگیا تو اسکے کھانے کو بھی منع فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ وہ پانی میں ڈوب کر مرا ہو۔ حضرت

عدی بن حاتمؓ نے یہی مضمون رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت کیا ہے۔ (جصاصؒ)

(۸) نَطِیْحَۃ یعنی وہ جانور جو کسی ٹکر اور تصادم (ایکسیڈنٹ) سے ہلاک ہوگیا ہو۔ جیسے ریل موٹر وغیرہ کی زد سے یا دوسرے جانور کی ٹکر سے مرجائے۔

(۹) مَآ اَکَلَ السَّبُعُ یعنی وہ جانور جس کو کسی درندے نے پھاڑ دیا ہو اور وہ مرگیا ہو۔
ان نو اقسام کی حرمت بیان فرماکر ایک استثناء ذکر کیا گیا۔ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ یعنی ان جانوروں میں سے اگر تم نے کسی جانور کو زندہ پالیا اور (قاعدہ کے موافق) ذبح کرلیا تو وہ حلال ہے۔ اس استثناء کا تعلق شروع کی چار قسموں سے تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ میتۃ ودم میں تو اس کا امکان ہی نہیں — اور خنزیر و مَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ اپنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا ان میں برابر ہے، اسی لئے حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت قتادہؒ وغیرہ سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار قسموں کے بعد والی پانچ قسموں (منخنقۃ وغیرہ) سے متعلق ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ منخنقۃ یا موقوذۃ یا متردیۃ یا نطیحۃ یا ما اکل السبع میں سے جو جانور زندہ پالیا گیا اور اسی حالت میں اس کو قاعدۂ شرعیہ کے مطابق ذبح کرلیا گیا تو وہ جانور حلال ہوگیا۔

(۱۰) مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ یعنی وہ جانور بھی جس کو نصب پر ذبح کیا گیا حرام ہے۔ نصب وہ پتھر جو کعبہ کے اردگرد کھڑے تھے، اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے، ان کے پاس لاکر جانوروں کی قربانی کرتے اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔ اگرچہ یہ قسم مَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ میں داخل ہے۔ مگر سابقہ اقسام کی طرح اس سے بھی اہل جاہلیت کی صراحۃً تردید مقصود ہے۔ یاد رکھیئے کہ ہر ایسی چیز کو نصب کہا جائیگا جس کو عبادت کے لئے کھڑا کیا گیا ہو یا اس کی پرستش کی جاتی ہو خواہ وہ بت ہو یا درخت یا پتھر یا قبر وغیرہ۔

(۱۱) اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَامِ یعنی فال کے تیروں کے ذریعہ قسمت کی خیر وشر کو جاننا یا قرعہ کے تیروں کے ذریعہ اونٹوں کے گوشت کی تقسیم کی کیفیت سے واقف ہونا۔ زمانۂ جاہلیت میں دس تیر تھے جو ایک تھیلہ میں بھرے ہوئے خانۂ کعبہ کے اندر قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے رہتے تھے۔ اُن میں سات تیروں پر تو معیّن حصّے لکھے ہوئے تھے، اور تین تیروں پر کوئی حصّہ لکھا ہوا نہیں تھا۔ ان تیروں کے نام اور حصے اس طرح تھے کہ فذ کا ایک حصہ، توام کے دو حصّے۔ رقیب کے تین حصے، حلس کے چار حصے، نافس کے پانچ حصے، مسبل کے چھ حصے، معلّی کے سات حصے، یہ کل سات تیر اور اٹھائیس حصے ہوئے۔ اور تین تیروں پر کوئی حصہ لکھا ہوا نہ تھا۔ وہ تین تیر سفیح، منیح وغد تھے۔ علامہ ابن حاجبؒ نے ان سب کو مندرجۂ ذیل اشعار میں درج کیا ہے ؎

ھِیَ فَذٌّ وَتَوأَمٌ وَرَقِیْبٌ ٭ ثُمَّ حِلْسٌ وَنَافِسٌ ثُمَّ مُسْبِلٌ

وَالْمُعَلّٰى وَالْوَغْدُ ثُمَّ سَفِيْحٌ ۞ وَمَنِيْحٌ وَذِي الثَّلَاثَةِ تُهْمَلُ
وَلِكُلٍّ مِمَّا عَدَاهَا نَصِيْبٌ ۞ مِثْلُهٗ اِنْ تُعَدُّ اَوَّلَ اَوَّلُ

زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب کی عادت یہ تھی کہ قسمت آزمانے کے لئے دس آدمی مل کر ایک اونٹ خریدتے اور ذبح کرتے، اور اس کے گوشت کو اٹھائیس حصوں پر تقسیم کرتے تھے۔ پھر وہ تیروں والا تھیلا ایک شخص کو دیدیتے، وہ شخص اس کو خوب ہلاتا پھر ہر ایک کے نام پر ایک ایک تیر نکالتا، جسکے نام پر جتنے حصوں کا تیر نکلتا اس کو ان اٹھائیس حصوں میں سے اتنے مل جاتے۔ اس طرح سات تیروں والے ایک سے سات تک حصے پالیتے۔ اور اپنی اپنی قسمت پر فخر کرتے تھے۔ البتہ تین خالی تیر جن کے نام پر آتے ان کو کوئی حصہ نہ ملتا۔ اور وہ بدقسمت شمار ہوتے، وہ بھی رنجیدہ ہوتے اور دوسرے بھی انپر ہنستے، اور ان کا مذاق بناتے تھے۔ اور جو اس جوئے میں شریک نہ ہوتا اس کو بھی ملامت کرتے اور اس کو کنجوس بتاتے تھے۔ البتہ حصوں میں آئے ہوئے گوشت کو خود نہ کھاتے تھے۔ بلکہ فقراء پر تقسیم کردیتے تھے۔ حافظ ابن کثیر وغیرہ محققین مفسرین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مُراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردّد کے وقت اپنے مقاصد اور ارادوں میں فیصلہ کرتے تھے۔ کسی پر اَمَرَنِيْ رَبِّيْ لکھا تھا اور کسی پر نَهَانِيْ رَبِّيْ لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح ہر تیر پر اسی قسم کی باتیں لکھی ہوئی تھیں جب کسی کام میں تردّد ہوا تیر نکال کر دیکھ لیا۔ اگر اَمَرَنِيْ رَبِّيْ والا نکل آیا کام شروع کردیا اور اسکے خلاف نکلا تو رک گئے۔ گویا اپنے بتوں سے یہ ایک قسم استخارہ اور مشورہ تھا۔ کیونکہ اسکی بنیاد خالص جہالت وہم پرستی پر تھی۔ اسلئے قرآن کریم نے اس حرکت کی شدید مذمت کی اور اس کو ناپاک، فسق اور شیطانی عمل قرار دیا۔ حافظ ابن کثیر وغیرہ کے بیان کے مطابق استقسام بالازلام طیرہ (بدفالی) میں داخل ہے۔ اور اول قول پر میسر (جوئے) میں داخل ہے۔ اور ثانی الذکر آیت میں میسر کے بعد مستقلاً اس کو اسی لئے ذکر فرمایا کہ اہلِ جاہلیت کی صراحت ووضاحت کیساتھ تردید اور اس جاہلانہ عادت کی مذمت شدید ہو جائے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں خواہ اہلِ جفر کے ذریعہ ہوں یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالازلام کے حکم میں ہیں۔ اور استقسام بالازلام کا لفظ کبھی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جس میں قرعہ اندازی اور لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جاتی ہے۔ یہ بھی بنصِ قرآن حرام ہے۔ جس کو قرآن کریم نے میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ اور شعبیؒ نے فرمایا کہ جسطرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس وروم میں شطرنج، چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام

لیا جاتا ہے وہ بھی اَزلام کے حکم میں ہیں۔

قرعہ اندازی کی جائز صورت

اگر سب حصّے برابر تقسیم کر دیئے گئے ہوں، اور حصّوں کی تعیین کے لئے قرعہ اندازی کر لی جائے۔ مثلاً ایک مکان چار برابر کے شریکوں میں تقسیم کرنا ہے تو قیمت کے لحاظ سے اس کے چار حصے برابر لگا دیئے گئے۔ اب یہ متعین کرنا کہ ان میں کونسا حصہ کس شریک کے پاس رہے، اس کی تعیین اگر آپسی مصالحت و رضامندی سے نہ ہو تو قرعہ اندازی کر لی جائے اس سے جس کے نام پر جسطرف کا حصہ نکل آئے وہ اس کو دیدیا جائے یہ جائز ہے۔ اور حدیث سے بھی ثابت ہے۔

ذٰلِکُمْ فِسْقٌ۔ (یہ سب گناہ اور حرام ہے) صاحبِ مظہری کہتے ہیں کہ قسمت معلوم کرنیکا یا تقسیم کرنے کا یہ طریقہ فسق و گمراہی ہے۔

(۳۸۳) یہ تحریم خمر کے سلسلہ کی آخری آیت ہے۔ دیگر رسوم جاہلیت کی طرح عرب میں شراب نوشی و قمار بازی بھی عام تھی۔ اہلِ مکہ کی طرح اہلِ مدینہ میں بھی ان کا عام رواج تھا۔ عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے ظاہری فوائد کے پیشِ نظر ان میں مبتلا تھے۔ مگر کچھ لوگ جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے تھے ان سے بچتے بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت بلند تھا کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونیوالی تھی آپ اس سے پہلے ہی متنفر رہتے، صحابۂ کرامؓ میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جو شراب حرام نہونے کے دور میں بھی اس سے مکمل پرہیز رکھتے تھے۔ ان حضرات کی نظروں میں اس کے مفاسد تھے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ جبرئیل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیارؓ کی چار خصلتیں بہت محبوب ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر طیارؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں؟ عرض کیا کہ میں نے ابتک اُنکا اظہار کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں۔ (۱) میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اسلئے میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا۔ (۲) میں نے بتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی نفع و ضرر نہیں اسلئے زمانۂ جاہلیت میں بھی میں نے کبھی بُت پرستی نہیں کی۔ (۳) اور مجھے کیونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے بارے میں سخت غیرت ہے اسلئے میں نے کبھی زنا نہیں کیا۔ (۴) اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دنائت و ذلت کی بات ہے اسلئے کبھی دورِ جہالت میں بھی میں نے جھوٹ نہیں بولا۔

(معارف از روح البیان)

مدینۂ طیبہ پہونچکر ان حضرات کو شراب کے مفاسد کا احساس زیادہ ہوا حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی خراب کرتے ہیں اور مال بھی برباد کرتے ہیں۔

ان کے بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے ؟ اس سوال کے جواب میں سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔ آیت یہ ہے

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (آیت ۲۱۹)

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ ان میں گناہ بڑا ہے۔ اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا کہ شراب اور جوئے میں گو کچھ ظاہری فائدے ضرور ہیں مگر ان سے گناہ کی ایسی بڑی بڑی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو ان کے فوائد و منافع سے بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کیا گیا مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کردیئے گئے۔ گویا اسکے ترک کرنے کیلئے ایک قسم کا مشورہ دیدیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہی بہت سے صحابۂ کرامؓ نے شراب چھوڑ دی۔ اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا ہی نہیں، بلکہ مفاسد کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہوں تو پھر شراب میں کوئی حرج نہو گا۔ اسلئے پیتے رہے یہانتک کہ ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے صحابۂ کرامؓ میں سے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد حسب دستور شراب پی گئی۔ اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آگیا، نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، حضرت علیؓ کو امام بنایا گیا۔ انہوں نے نشہ کی حالت میں جو قرأت شروع کی تو سورۂ کافرون کو غلط پڑھا اسپر سورۂ نساء کی آیت نازل ہوئی۔ اور یہ شراب بندی کے سلسلہ کا دوسرا مرحلہ تھا۔ آیت یہ ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء آیت ۴۳)

اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں اسوقت تک نماز کے قریب نہ جاؤ جبتک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہہ رہے ہو۔

اس آیت سے خاص اوقات نماز میں شراب کو قطعی طور پر حرام کردیا گیا۔ باقی اوقات میں اجازت رہی۔ بعض صحابہؓ نے اس آیت کے نزول پر شراب چھوڑ دی کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکدے اس میں کوئی خیر نہیں ہوسکتی۔ مگر چونکہ اوقاتِ نماز کے علاوہ دیگر اوقات کے بارے میں ابھی صاف طور پر حرمت نازل نہیں ہوئی تھی اسلئے بعض حضرات اوقاتِ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہانتک کہ ایک اور واقعہ پیش آگیا۔ وہ یہ کہ حضرت عتبان بن مالکؓ نے چند صحابۂ کرامؓ کی دعوت کی جن میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے۔ کھانے کے بعد حسبِ دستور شراب کا دور چلا۔ عرب کی عادت کے مطابق نشہ کی حالت میں شعر و شاعری اور اپنے اپنے مفاخر کا بیان شروع ہوا۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے

ایک قصیدہ پڑھا جس میں انصارِ مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح تھی، اسپر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آگیا اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سعدؓ کے سر پر دے ماری جس سے ان کو شدید زخم آگیا نشہ ہرن ہوگیا۔ اور دوڑے دوڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر انصاری جوان کی شکایت کرنے لگے، اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيَانًا شَافِيًا (یا اللہ ہمیں شراب کے بارے میں کوئی واضح بیان اور قانون عطاء فرمادیجئے) اس پر شراب کے متعلق سورۂ مائدہ کی مفصل آیت نازل ہوگئی، اور اس تیسرے مرحلہ میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیدیا گیا۔ اور وہ آیت یہی زیرِ بحث آیت ہے۔

شریعتِ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں تدریج و آہستگی سے اسلئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصًا نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بڑا گراں ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا فِطَامُ الْعَادَةِ اَشَدُّ مِنْ فِطَامِ الرَّضَاعَةِ (عادت کا چھوڑ دینا ماں کا دودھ چھوڑ دینے سے بھی زیادہ گراں ہوتا ہے) اسلئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اوّل اس کی برائی ذہن نشین کرائی، پھر نماز کے اوقات میں اس کو ممنوع قرار دیا۔ اس کے بعد قطعی طور پر حرام قرار دیکر پوری سختی کے ساتھ اس قانون کو امّت پر نافذ فرمادیا، اور یہ سختی بھی حکمت کا تقاضا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر قانون تشنۂ عمل رہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے شراب پر بیشمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں، جو کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

حُرمتِ قمار

اس آیت میں دوسری چیز مَیسِر ہے۔ لغت میں اس کے اصل معنی آسانی، سہولت، تونگری اور تقسیم کرنے کے آتے ہیں۔ یاسر گوشت تقسیم کرنے والے منتظم کو کہتے ہیں۔ جاہلیتِ عرب میں جوئے کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کرکے اس کے حصّے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو زیادہ حصے ملتے اور بعض محروم رہتے۔ پھر محروم رہنے والے کو پورے اونٹ کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی تھی، اور سب گوشت فقراء میں تقسیم کردیا جاتا تھا، وہ خود استعمال نہ کرتے تھے۔
اس خاص جوئے میں فقراء کا فائدہ اور یسر (آسانی، تونگری) اور جوا کھیلنے والوں کا اظہارِ سخاوت بھی تھا۔ اسی لئے اس کو باعثِ فخر سمجھتے اور جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔ پھر اس تقسیم و آسانی وغیرہ کی مناسبت سے قمار (اور جوئے) کو مَیسِر کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جواری کو بعض مرتبہ بآسانی تونگری حاصل ہوجاتی ہے، تو اس کھیل کا نام ہی لفظ مَیسِر کے ساتھ بطورِ تفاؤل رکھدیا گیا۔
تمام صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ اس پر متفق ہیں کہ جوئے کی تمام صورتیں مَیسِر میں داخل اور حرام ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، قتادہؒ، معاویہ بن صالحؒ، عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب والجوز (یعنی میسر کی ہر قسم جوا ہے۔ یہانتک کہ بچوں کا لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ سے کھیل بھی اس میں داخل ہے)

اور ابن عباسؓ نے فرمایا المخاطرة من القمار یعنی مخاطرہ قمار میں داخل ہے۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ مخاطرہ کا مطلب ہے ایسا معاملہ کرنا جو نفع و نقصان کے درمیان دائر ہو۔ جیسے آجکل لاٹری کے طریقوں میں پایا جاتا ہے۔ اسلئے میسر و قمار کی تعریف کا حاصل یہ ہوا کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں برابر ہوں۔ اور اسی بنا پر خالص نفع یا خالص تاوان برداشت کرنے کی دونوں صورتیں مساوی ہوں۔ (شامی کتاب الحظر والاباحة ص۳۵۵ ج۵) مثلاً یہ بھی احتمال ہو کہ زید پر تاوان پڑجائے اور یہ بھی کہ عمر پر پڑجائے، اس کی جتنی صورتیں اور قسمیں پہلے زمانہ میں رائج تھیں یا اس دور میں مروج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں وہ سب میسر و قمار (اور جوا) کہلائیں گی۔ دورِ حاضر میں معموں کا مشہور کاروبار اور تجارتی لاٹریاں بھی سب اس میں داخل ہیں۔ ہاں اگر ایک جانب سے انعام مقرر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کریگا اس کو یہ انعام ملیگا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ معاملہ نفع و نقصان کے درمیان دائر نہیں بلکہ نفع و عدمِ نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیث صحیحہ میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے جن میں مال کی ہار جیت ہوتی ہے تاش پر اگر روپیہ کی ہار جیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت بریدہؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا سور کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علیؓ نے فرمایا شطرنج جوئے میں داخل ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ شطرنج تو نردشیر سے بھی زیادہ بُری ہے۔ (ابن کثیر)

ابتدائے اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا اسلئے حرمت سے پہلے بعض صحابہؓ نے اس کام کو بھی کیا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شراب کی طرح اس سے بھی متنفر و مجتنب رہے۔

یہاں تحریم خمر و میسر اور انکے مفاسد کا بیان مقصود ہے

آیت زیر بحث اور اسکے بعد والی آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اصل مقصود

خمر و میسر کی حرمت اور ان دونوں چیزوں کے مفاسد کو بیان کرنا ہے۔ اس میں انصاب (بتوں) کا ذکر کرکے ان جرائم کی شدت کو ظاہر کرنا ہے۔ کہ جس طرح بت پرستی شدید جرم ہے اسی طرح شرب خمر اور میسر بھی سخت جرائم ہیں۔ حدیث میں ہے مُدْمِنُ الْخَمْرِ اِنْ مَّاتَ لَقِیَ اللّٰہَ کَعَابِدِ وَثَنٍ (یعنی شراب کا عادی مرکر اللہ سے اس طرح ملیگا جیسے بت پرست) ایک روایت میں ہے شَارِبُ الْخَمْرِ کَعَابِدِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰی (شراب خور لات و عزیٰ کے پجاری کی طرح ہے) ایک حدیث میں ہے کہ چار شخص جنت میں نہ جائیں گے۔ قطع رحمی کرنیوالا، جواری، احسان جتانے والا اور شراب کا عادی۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین شخصوں پر جنت حرام فرما دی ہے۔ ایک شراب کا خوگر دوسرا قطع رحمی کرنے والا، تیسرا دیوث جو اپنے اہل میں گندے کاموں کو قائم رکھتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس میں فرق نہیں کرتا ہوں کہ شراب پیوں یا اللہ کو چھوڑ کر اس ستون کی پرستش کروں (یعنی میرے نزدیک دونوں برابر ہیں)، یہ تمام روایات مشکوٰۃ ص ۳۱۸ میں ہیں۔ ان سے ان گناہوں کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور انصاب کو ان کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ بھی بخوبی واضح ہوسکتی ہے۔ اور جوئے کی قسم تقسیم بالازلام چونکہ مخاطبین اولین (اہل عرب) کا خاص مشغلہ تھا اسلئے اس کو بھی خاص طور پر ذکر فرمایا گیا۔
حاصل یہ ہے کہ یہاں اصل شراب اور جوئے کی سخت حرمت اور ان کے مفاسد کو بیان کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ تحریم خمر و میسر کے بعد آگے ان کے مفاسد کا بیان ہے۔

خمر و میسر کے مفاسد

شراب اور جوئے کے مفاسد تو بہت ہیں جن کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، مگر آیات مذکورہ میں تین قسم کی بنیادی خرابیوں کا ذکر ہے اسلئے ان کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ | (یہ سب چیزیں) گندی شیطانی کام ہیں ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح کو پہونچو۔)

یعنی یہ مذکورہ چیزیں خمر و میسر وغیرہ فطرت سلیمہ کے نزدیک گندی، قابل نفرت چیزیں اور شیطانی چال ہیں جن میں پھنس جانے کے بعد انسان بیشمار مفاسد، مہلک خرابیوں اور اقسام و انواع کے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جن سے آدمی کی روح مردہ اور اس کی دنیا و آخرت تباہ و برباد ہو جاتی ہے ان مفاسد کو بیان فرما کر حکم دیا کہ ان سے پرہیز رکھو تاکہ تم کو فلاح و بہبود نصیب ہو۔ کیونکہ دنیوی و اخروی فلاح ان چیزوں سے پرہیز کرنے پر موقوف ہے۔

(۲) اسکے بعد دوسری آیت میں خمر و میسر کے دنیوی اور ظاہری مفاسد کا بیان ہے۔

(۲) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ اِلٰى قَوْلِهٖ الْمَيْسِرِ۔ | یعنی شیطان تمہیں شراب اور جوئے میں مبتلا کر کے تمہارے درمیان بغض و عداوت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ان آیات کا نزول گو غیظ و غضب اور جنگ و جدل ہی کے ان واقعات پر ہوا جو شربِ خمر کے نتیجہ میں پیش آئے تھے۔ لیکن وہ حادثات اتفاقی نہ تھے، بلکہ خمر و میسر کے لازمی نتائج و ثمرات ہیں، کیونکہ نشہ میں انسان اپنی عقل اور ہوش و حواس کو کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح ہارنے والا جواری اپنی ہار مان کر گو فوری طور پر نقصان برداشت کر لیتا ہے، مگر اپنے حریف پر غیظ و غضب اور بغض و عداوت اس کے ضروری اور لازمی اثرات و ثمرات ہیں، حضرت قتادہؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اہل عرب اپنے اہل و عیال اور مال و منال تک کو جوئے میں ہار کر انتہائی رنج و غم کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ اس جملہ میں شراب اور جوئے کی اصل دنیوی اور جسمانی خرابیوں کا بیان ہوا ہے۔ گو نتیجہ کے طور پر دینی و اخروی اور روحانی بربادی بھی ضروری ہے۔

(۳) وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ یعنی خمر و میسر میں مبتلا کر کے شیطان چاہتا ہے کہ تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کر دے۔ یہ خرابی بظاہر روحانی و اخروی خرابی ہے۔ جس کو دنیوی خرابی کے بعد مکرر ذکر فرمایا ہے۔ اس میں اشارہ ہوسکتا ہے کہ اصل قابلِ فکر اخروی ابدی زندگی ہے۔ عاقل کے نزدیک روحانی و اخروی خوبیاں مطلوب و مرغوب اور ان کی خرابیوں اور نقصانات سے پرہیز لازم و محبوب ہوتا ہے۔ دنیوی چند روزہ زندگی نہ کچھ قابلِ فخر و لائقِ فکر ہے۔ نہ اس کی خرابی کچھ زائد باعثِ رنج و غم ہے۔ اس کی دونوں حالتیں عیش و راحت اور رنج و غم فانی ہیں ؎

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت = تلخی و خوشی و زِشت و زیبا بگذشت

خلاصہ یہ ہے کہ پہلے جملہ میں خمر و میسر کے اثر سے روحانی و اخروی خرابیوں کا ذکر ہے۔ دوسرے جملہ میں جسمانی و دنیوی مفاسد کا اور تیسرے جملہ میں مکرر روحانی و اخروی نقصانات کا بیان ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو تینوں جملوں میں مختلف پہلوؤں سے روحانی و جسمانی، دنیوی و اخروی، ذاتی و جماعتی، انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے نقصانات و مفاسد اور ہر نوع کی تباہی و بربادی کو مکرر سہ کرر تاکید در تاکید کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پھر مومن کی دنیا و آخرت، اسی طرح ظاہر و باطن کے منافع و نقصانات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کا سبب اور ایک کا نفع دوسرے کے نفع کے لئے لازم ہے۔ اگر اس مختصر تحریر پر غور فرما لیا جائیگا تو تفصیلات تک رسائی آسان ہو جائے گی۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ذکر اللہ میں تو نماز بھی داخل ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ پھر ذکر اللہ کے بعد آیتِ شریفہ میں نماز کو علیحدہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟ جواب یہ ہے کہ

اس میں نماز کی اہمیت اور ذکر اللہ کی تمام اقسام و انواع میں اس کی خاص افضلیت و اشرفیت کیطرف اشارہ کرنے کے لئے نماز کو مستقل بطور عطف الخاص علی العام ذکر فرمایا گیا ہے۔ پھر خمر و میسر کے مفاسد و ثمرات بد کی تفصیلات بیان فرمانے کے بعد ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ایک عجیب و غریب دل نواز انداز سے بطور استفہام فرماتی ہے۔ ارشاد ہے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ یعنی جب خمر و میسر کی یہ تمام برائیاں اور خرابیاں تمہارے علم میں آگئیں تو ان سے اب بھی باز آجاؤ گے؟ حضرات صحابہؓ نے جب اس آیت شریفہ کو سنا تو عرض کیا قَدِ انْتَهَيْنَا رَبَّنَا (اے ہمارے رب ہم بالکل باز آگئے)

بے مثال تعمیل حکم

حرمت شراب کا حکم پاتے ہی حضرات صحابہؓ نے فوراً تعمیل کی، گھروں میں رکھی ہوئی شرابیں بہادیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کردی گئی۔ توجس کے ہاتھ میں شراب کا جو برتن تھا وہ وہیں پھینکدیا۔ جس کے پاس جو شراب کا سبو یا خم تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا۔ حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دور شراب کے ساقی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ، ابی بن کعب اور سہیل رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ مجلس میں موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب نے کہا کہ اب یہ سب شراب گرادو، اسکے جام و سبو توڑ دو۔ بعض روایات میں ہے کہ اعلان حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب لبوں تک پہونچا ہوا تھا اس نے وہیں سے اس کو پھینکدیا، مدینہ میں اس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی رَو کا پانی۔ اور مدینہ کی گلیوں میں عرصۂ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کے رنگ و بو مٹی سے نکھر آتے تھے۔

جس وقت یہ حکم ہوا کہ جس کے پاس شراب ہو وہ فلاں جگہ جمع کردے، اس وقت صرف وہ ذخیرے رہگئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، فرمانبردار صحابہؓ نے بلا تأمل وہ سب مقرر جگہ پر جمع کردیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اور اپنے دست مبارک سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کردیا۔ جو باقی رہ گئے وہ باقی صحابہؓ سے چاک کرادیئے۔ ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملک شام سے شراب درآمد کرتے تھے وہ اس زمانہ میں ابھی ساری رقم جمع کرکے شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب تجارتی مال (شراب) لیکر مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان کو حرمت شراب کی خبر ملی تو جاں نثار صحابی نے اپنے اس سارے سرمایہ کو جس سے نفع کی امیدیں وابستہ تھیں، وہیں مدینہ سے باہر ایک پہاڑی پر ڈالدیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اب میرے پاس

جو مال ہے اس کے متعلق کیا حکم ہے، اور اب مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے ان کی شراب بہادو۔ جاں نثار صحابی نے حکم کے مطابق بلا جھجک اپنے ہاتھ سے اپنا باقی ماندہ سارا سرمایہ زمین پر بہادیا۔ یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا ایک کھلا کرشمہ اور صحابہ کرامؓ کی بے مثال وحیرت انگیز اطاعت کا ایک نمونہ تھا، آدمی جس چیز کا خوگر ہوتا ہے اس کو یکبارگی چھوڑ دینا، اور جس کے بغیر چند لمحات صبر نہ کر سکے، حکمِ الٰہی و فرمانِ نبوی کی وجہ سے اس سے مستقل صبر کر لینا انہیں حضرات کا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی اتباع کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(۳۸۴) عَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ سُئِلَ عَلِیٌّ هَلْ خَصَّكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی
حضرت ابو الطفیلؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ حضرات کو رسول اللہ
اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِشَیْءٍ قَالَ مَا خَصَّنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے ساتھ خاص کیا ہے؟ فرمایا کہ ہمکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی چیز کے ساتھ
بِشَیْءٍ لَمْ یَعُمَّ بِهِ النَّاسَ کَافَّةً اِلَّا مَا کَانَ فِیْ قِرَابِ سَیْفِیْ هٰذَا
خاص نہیں کیا کہ آپ نے اسکے ساتھ تمام لوگوں کو عام نہ کیا ہو مگر جو کچھ میری اس تلوار کے میان میں ہے۔ ابو الطفیلؓ
قَالَ فَاَخْرَجَ صَحِیْفَةً مَکْتُوْبٌ فِیْهَا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیْرِ اللّٰهِ
فرماتے ہیں کہ پھر انہوں نے ایک صحیفہ نکالا جس میں لکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے
وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْاَرْضِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) مَنْ غَیَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ
اور اللہ اس پر لعنت کرے جو زمین کے نشان چرائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جو زمین کے نشان بدل دے۔
وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهٗ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰی مُحْدِثًا۔
اور لعنت کرے اللہ تعالیٰ اسپر جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور لعنت کرے اللہ تعالیٰ اس شخص پر جو کسی بدعتی کو ٹھکانہ دے۔ (مسلم ص ۱۶۱/۲، مشکوٰۃ ص ۳۵۷)

لغات قِرَاب میان ج قُرُبٌ واَقْرِبَةٌ قِرَابُ الشیءِ اندازے میں برابر قَرَبًا (ن) تلوار کو میان میں داخل کرنا، میان بنانا، (س ك) قریب ہونا (س) کوکھ کے درد والا ہونا صَحِیْفَة لکھا ہوا کاغذ، ورق ج صُحُفٌ وصَحَائِفُ۔ مَنَار بفتح المیم جمع مَنَارَةٌ وهی علامة الاراضی التی تمیز بها حدودها۔ روشنی کی جگہ، علامت جو راستہ کی رہنمائی کے لئے لگائی جائے، دو چیزوں کے درمیان کے حدود۔ مُحْدِثًا اسم فاعل ایجاد کرنیوالا، پیدا کرنیوالا، پاخانہ

کرنیوالا، بدعتی، دین میں نئی چیز پیدا کرنے یا نئی بات عمل میں لانیوالا، مجرم۔

تشریح (۴۸۴) بعض لوگوں نے یہ بات مشہور کردی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ واہلِ بیت کو بعض خصوصیات اور مخصوص وصایا سے نوازا ہے، اسلئے لوگ اسکی تحقیق کے سلسلہ میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے پوچھتے تھے چنانچہ اس روایت میں یہی مذکور ہے۔ کہ کسی شخص نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ حضرات (اہل بیت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کی خصوصیت دی ہے۔ اور ایسی کوئی وصیت کی ہے جو عام مسلمانوں سے علیحدہ ہو؟ حضرت علیؓ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اسکے علاوہ کوئی خصوصیت عطا نہیں کی جو میری تلوار کے میان میں ہے۔ اور یہ فرما کر اپنی تلوار کے میان سے ایک تحریر نکالی۔ (یہاں یہ بات یاد رکھیئے کہ اِلَّا مَا فِي قِرَابِ سَيْفِي هٰذَا میں استثناء متصل ہے۔ اور گو اس تحریر مذکور میں احکام مخصوص نہ تھے مگر شاید حضرت علیؓ کے گمان میں ایسا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو استثنائے منقطع مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے "لیکن جو میری اس تلوار کے میان میں ہے میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ مخصوص ہے یا اور سب لوگوں کے لئے بھی عام ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ استثناء باب مبالغہ میں سے ہو۔ جیسے مندرجہ ذیل شعر میں ہے ؎

لا عیب فیھم غیر ان سیوفھم ٭ بھن فلول من قراع الکتائب

(میرے ممدوحین میں اسکے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواریں لشکروں کو مارنے کیوجہ سے کند ہیں)

ظاہر ہے کہ یہ عیب نہیں بلکہ خوبی اور بہادری ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے قول کا مطلب بھی یہی ہے کہ مجھکو یہ احکام مخصوص عطاء ہوئے ہیں جو اس پرچہ میں ہیں، اور ان میں کوئی خصوصیت نہیں بلکہ عام ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس صحیفہ میں چار قسم کے لوگوں پر لعنت تھی۔ (۱) اللہ تعالیٰ لعنت کرے اس شخص پر جو غیر اللہ کیلئے ذبح کرے (۲) اللہ کی لعنت اسپر جو زمین کی علامت چرالے۔ ایک روایت میں ہے بدل دے۔ یعنی اسکے نشان کو اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ نصب کردے۔ جس سے ایک کی زمین کم ہوجائے اور دوسرے کی زیادہ)۔ (۳) اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اسپر جو اپنے ماںباپ پر لعنت کرے یعنی خود اپنی زبان سے کرے، یا سبب بنجائے مثلاً کسی کے ماںباپ پر لعنت کرے جواباً وہ اسکے ماںباپ پر لعنت کرے ومنه قوله تعالیٰ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (۴) اور اللہ تعالیٰ کی لعنت اسپر جو کسی مُحْدِث کو ٹھکانہ دے (مُحدِث وہ شخص جس نے کوئی جرم یا جنایت کی ہو۔ اور اس کے ٹھکانہ دینے کا مطلب یہ ہے اس کو پناہ دے کر اسکی حمایت کرنا اور اس مجرم وجانی اور صاحب حق کے درمیان حائل ہوکر صاحب حق کو اس سے اپنا

حق وصول کرنے میں مانع بننا۔ مُلا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں جانی علی الاسلام یعنی بدعتی بھی داخل ہے جبکہ اس سے بدعت پر مؤاخذہ کرنے سے باز رکھے۔

اَلطِّيَرَةُ

بدفالی

(۳۸۵) عَنْ قَطَنِ بْنِ قَبِيصَةَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت قطن بن قبیصہؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قَالَ الْعِيَافَةُ وَالطَّرْقُ وَالطِّيَرَةُ مِنَ الْجِبْتِ۔ (ابوداؤد ص۱۸۹ ج۲ مشکوٰۃ ص۳۹۲)

کہ فال بد اور کہانت اور شگون شیطانی کام ہیں۔

(۳۸۶) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں

قَالَ الطِّيَرَةُ شِرْكٌ قَالَهُ ثَلٰثًا۔ (ابوداؤد ص۱۸۹ ج۲ ص۳۹۲)

کہ بدشگونی شرک ہے اس کو آپؐ نے تین بار فرمایا۔

(۳۸۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیک فال لیتے

يَتَفَاءَلُ وَلَا يَتَطَيَّرُ وَكَانَ يُحِبُّ الْاِسْمَ الْحَسَنَ۔ (مشکوٰۃ ص۳۹۲)

اور بدفالی نہیں لیتے تھے اور اچھے نام کو پسند فرماتے تھے۔

(۳۸۸) عَنْ عُرْوَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى

حضرت عروہ بن عامرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فال کا ذکر کیا گیا

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنُهَا الْفَالُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَاِذَا رَاٰى

تو آپؐ نے فرمایا کہ نیک فال اچھی ہے اور بدشگونی کسی مسلمان کو (مقصد سے) واپس نہ کرے

اَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ لَا يَاْتِيْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَ

پھر جب تم میں سے کوئی ایسی چیز دیکھے جو اسکو ناپسند ہو تو یہ کہے۔ اے اللہ بھلائیاں آپ ہی لاسکتے ہیں اور

لَا يَدْفَعُ السَّيِّاٰتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (ابوداؤد ص۱۹۱ ج۲ مشکوٰۃ ص۳۹۲)

"برائیوں کو بھی آپ ہی دفع فرما سکتے ہیں اور نہ گناہوں سے بچنے کی کسی میں طاقت ہے اور نہ نیکی کرنیکی قوت مگر آپ ہی کی توفیق سے۔

تشریح ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ الفال ہمزہ کے ساتھ ہے، اور اس کا اکثر استعمال ہمزہ کو الف سے بدل کر ہوتا ہے۔ فال نیک شگون و بدشگون دونوں کو عام ہے اور الطیرۃ (بکسر التاء وفتح الیاء وقد تسکن) کا اطلاق صرف بدشگونی میں ہوتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ فال، طیرۃ کی ضد ہے۔ جیسے مریض سنے یا سالِمُ اور کسی چیز کو تلاش کرنے والا سُنے یا واجد۔ اور یہ لفظ خیر و شر دونوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور طیرۃ شر میں اور منحوس و فالِ ردی (بدشگونی) میں استعمال ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قاموس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ فال مختص بالخیر ہے، گاہے شر میں استعمال ہوتا ہے۔ اور طیرۃ شر ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو اصل وضع کے اعتبار سے دونوں ضدین ہیں۔ اور نہایہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فال اصل وضع میں طیرۃ سے اعم ہے۔ اور بعض استعمالات میں دونوں مترادف ہیں۔ لیکن احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طیرۃ اعم ہے اور فال اخص ہے کما جاء ھھنا فی روایۃ عامر احسنھا الفال۔ اور طیرۃ تطیر سے ماخوذ ہے جیساکہ خیرۃ تخیر سے مشتق ہے اور یہ دونوں (طیرۃ اور خیرۃ) تفعل سے مصدر ہیں۔ ان دونوں مصدروں کے علاوہ اس وزن پر مصادر نہیں آتے۔ عرب کے جاہلوں کی عادت تھی کہ پرندوں، ہرنوں اور جانوروں سے فال لیتے تھے، کبھی ان کے ناموں سے، کبھی ان کی آوازوں سے، اور کبھی اس طرح کہ پرندوں کو اڑاتے یا جانوروں کو دوڑاتے تھے، اگر وہ داہنی جانب سے بائیں جانب کو اڑ گئے یا گذر گئے تو یہ کامیابی کی علامت تھی، اور وہ اپنے مقاصد کی جانب چلے جاتے تھے۔ اور اسکے برعکس ہوا تو اس کو ناکامی کی علامت سمجھتے تھے، اور اپنے مقصد کی طرف جانے سے رک جاتے تھے۔ اسی طرح شکار کو ان کے ٹھلوں اور گھروں سے ہنکاتے، اگر وہ داہنے سے بائیں کو گذر گئے تو اس کو بروح کہتے اور اس کے برعکس کو سنوح اور اس سے کامیابی اور ناکامی کی فال لیتے تھے۔ جیساکہ ہندوستان میں بھی پرندوں کی آوازوں سے فال لیتے ہیں۔ کوّے کے بولنے کو مہمانوں کی آمد کی علامت، اُلّو کے بولنے کو بربادی و ویرانی کی نشانی، بلّی کے رونے کو مریض کے مرنے کی علامت۔ اسی طرح اعضاء کے پھڑکنے سے بھی فال لی جاتی ہے، اور چھینکنے سے بھی بدشگونی لی جاتی ہے۔ وغیرہ۔ شریعت مطہرہ نے ان توہمات میں الجھنے سے اپنے ماننے والوں کو منع کیا۔ اور ایسی چیزوں کو باطل قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ ان چیزوں میں نفع ونقصان کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فالِ نیک پسند تھی، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

لَا طِیَرَۃَ وَخَیْرُھَا الْفَالُ قَالُوْا وَمَا الْفَالُ قَالَ الْکَلِمَۃُ الصَّالِحَۃُ یَسْمَعُھَا اَحَدُکُمْ۔ (مشکوٰۃ ص ۳۹۱)

شگون بے اصل ہے البتہ بہترین شگون فال ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا فال کیا ہے؟ فرمایا کوئی نیک بات جس کو تم میں سے کوئی سنے۔

دوسری حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے۔ حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَتَطَیَّرُ مِنْ شَیْءٍ فَاِذَا بَعَثَ عَامِلًا سَأَلَ عَنْ اِسْمِہٖ فَاِذَا اَعْجَبَہٗ اِسْمُہٗ فَرِحَ بِہٖ وَرُؤِیَ بِشْرُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِنْ کَرِہَ اسْمَہٗ رُؤِیَ کَرَاھِیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِذَا دَخَلَ قَرْیَۃً سَأَلَ عَنْ اِسْمِھَا فَاِنْ اَعْجَبَہٗ اِسْمُھَا فَرِحَ بِہٖ وَرُؤِیَ بِشْرُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِنْ کَرِہَ اسْمَھَا رُؤِیَ کَرَاھِیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ۔

(مشکوۃ ص۳۹۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز سے بدشگونی نہ لیتے تھے اور جب آپ کسی کو عامل بناکر بھیجتے تھے تو اسکا نام دریافت فرماتے پھر اسکا نام آپکو پسند آتا تو آپ خوش ہوتے اور اسکی خوشی آپکے رُخ انور میں نمایاں ہوتی۔ اور اگر آپ اسکے نام کو ناپسند فرماتے تو اسکی کراہیت (ناپسندیدگی) آپکے رُخ انور میں دکھائی دیتی تھی۔ اور جب آپ کسی بستی میں داخل ہوتے تو اسکا نام دریافت فرماتے پھر اگر آپ کو اسکا نام پسند آتا تو آپ اس سے خوش ہوتے اور اسکی خوشی آپکے رُخ انور میں ظاہر ہوتی اور اگر آپ اسکے نام کو ناپسند فرماتے تو اسکی ناپسندیدگی آپکے رُخ انور میں دکھائی دیتی تھی۔

(ف) یعنی آپ بدشگونی تو نہیں لیتے تھے، جیسا کہ عرب کا دستور تھا ہاں اچھے نام کو پسند اور بُرے نام کو ناپسند فرماتے تھے۔ اور یہ مزاج کی سلامت اور طبیعت کی لطافت و پاکیزگی کا تقاضا بھی ہے۔ اور عموماً اسمار کا اثر مسمّی پر پڑتا ہے۔ لکل لہ من اسمہ نصیب۔ اسی لئے اچھے نام رکھنا سنت اور پسندیدہ ہے امام طبرانیؒ نے اوسط میں اور بزارؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے اِذَا بَعَثْتُمْ اِلَیَّ رَجُلًا فَابْعَثُوْہُ حَسَنَ الْوَجْہِ حَسَنَ الْاِسْمِ (مرقاۃ ص۵۲۵ ج۸)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پسند تھی کہ آپ جب کسی حاجت کے لئے تشریف لیجائیں تو یَا رَاشِدُ یا یَا نَجِیْحُ سُنیں (جس سے آپ فال نیک لیتے تھے) (مشکوۃ ص۳۹۲)

(۳۸۵) قطن بفتح القاف والطاء، قَبِیصۃ بفتح فکسر ابیہ ای قبیصۃ بن مخارق الھلالی العِیافۃ بکسر العین وھی زجر الطیر والتفاؤل باسمائھا واصواتھا وممرھا۔ وقال علی القاری والاعتبار فی ذلک باسمائھا کما یتفاءل بالعُقاب علی العِقاب وبالغُراب علی الغربۃ وبالھُدھُد علی الھُدٰی والفرق بینھا وبین الطیرۃ ان الطیرۃ ھی التشاؤم بھا وقد تستعمل فی التشاؤم بغیر الطیر من حیوانٍ وغیرہ۔ وھو من عادۃ العرب وھو کثیر فی اشعارھم۔ الطرق بفتح فسکون وھو الضرب بالحصی الذی یفعلہ النساء وقیل ھو الخط فی الرمل۔ کذا فی النھایۃ والحاصل انہ نوعٌ من التکھن۔ الجبت السحر والکھانۃ وقیل ھو کل ما عبد من دون اللّٰہ فالمعنی انھا ناشئۃ من الشرک وقیل ھو الساحر والاظھر انہ الشیطٰن والمعنی انہ من عمل الجبت۔ فقط نسیم احمد

حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ عیافۃ یعنی پرندوں یا ان کے ناموں، آوازوں اور ان کے گذرنے سے شگون لینا اور طرق یعنی کہانت سنگریزہ مار کر یا ریت وغیرہ پر حساب لگا کر فال لینا۔ اور طیرۃ یعنی پرندوں یا دیگر حیوانات سے بدشگونی لینا۔ یہ سب بُت پرستی و شرک میں داخل اور شیطانی کام ہیں۔ کیونکہ یہ سب توہمات ہیں۔ شیطان انسان کو توہمات میں مبتلا کر کے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ ان چیزوں سے کسی یقین تک آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔ قال لبید۔

لَعَمْرُكَ مَا تَدْرِي الطَّوَارِقُ بِالْحَصٰى ÷ وَلَا زَاجِرَاتُ الطَّيْرِ مَا اللّٰهُ صَانِعُ

(۳۸۶) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار ارشاد فرمایا کہ طیرۃ شرک ہے۔ کیونکہ شگون لینے والے جاہل یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اس سے نفع حاصل ہوجائیگا یا نقصان کو دفع کر دیگا۔ تو جب لوگ شگون پر عمل کریں گے تو گویا انہوں نے نفع وضرر میں طیرہ کو اللہ کا شریک بنا لیا لِاَنَّ مَنِ اعْتَقَدَ اَنَّ شَيْئًا سِوَى اللّٰهِ يَنْفَعُ اَوْ يَضُرُّ بِالْاِسْتِقْلَالِ فَقَدْ اَشْرَكَ شِرْكًا جَلِيًّا۔ وَاِنْ لَمْ يَعْتَقِدْ ذٰلِكَ وَعَمِلَ بِمُوْجِبِ الطِّيَرَةِ فَقَدْ اَشْرَكَ شِرْكًا خَفِيًّا۔ چونکہ عرب کے جہلاء طیرہ کو مؤثر بالذات سمجھتے تھے۔ تو ان کی جہالت وسوء اعتقاد کی وجہ سے ان کا یہ عمل شرک ہوا۔

(۳۸۷) یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ آپ فال نیک لیتے اور بدشگونی کو ناپسند فرماتے اور اچھے نام کو پسند فرماتے تھے۔

(۳۸۸) حضرت عروۃ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طیرہ کا ذکر ہوا تو آپنے فرمایا کہ طیرہ میں سے فالِ نیک ٹھیک ہے (یعنی فال بد غلط ہے) اور فالِ بد کسی مسلمان کو اسکے مقصد سے باز نہ رکھے۔ یعنی طیرہ پر کوئی مسلمان عمل نہ کرے۔ کیونکہ یہ شرک ہے۔ لیکن اگر غیر اختیاری طور پر دل میں بدشگونی پیدا ہوجائے یا بدشگونی کے موافق کوئی ناگوار حال پیش آجائے تو اس چیز کو جس سے بدشگونی لی جاتی ہے مؤثر بالذات نہ سمجھے۔ کیونکہ یہ شرک ہے۔ بلکہ دعاء پڑھ لے تاکہ شرک اور اس کے خیال سے بَری ہوجائے، اور بدشگونی سے بھی دل پاک ہوجائے۔ دعاء یہ ہے اَللّٰهُمَّ لَا يَاْتِيْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

قطن بن قبیصہ

قطن بن قبیصہ الہلالیؒ تابعی ہیں، ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے۔ ان کی کنیت ابوسہلہ ہے۔ یہ اپنے والد قبیصہ بن المخارق سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے ان کے بیٹے حرب اور حیان بن علاء۔ قطن شریف اور سجستان کے والی تھے۔ ان کے والد قبیصہ ابن مخارق الہلالی صحابی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور وفد حاضر ہوئے تھے۔ ان کا شمار بھی اہل بصرہ میں ہے۔ ان سے ان کے بیٹے قطن اور ابوعثمان النہدی وغیرہ روایت کرتے

ہیں۔ قطن بفتح القاف والطاء ومخارق بضم المیم وبالخاء المعجمۃ وبالراء والقاف۔ تراجم الاحبار ص۲۹ ج۳ میں ہے لہٗ (ای للقطن) صحبۃ قال النسائی لاباس بہ وقال ابن سعد مدحہ زیاد الاعجم وذکرہ ابن حبان فی الثقات لہٗ عند ابی داؤد والنسائی والطحاوی حدیث الطیرۃ۔

عروۃ بن عامرؓ هو عروۃ بن عامر القرشی تابعی سمع ابن عباس وغیرہ روی عنہ عمرو بن دینار وحبیب بن ابی ثابت اخرج ابوداؤد وحدیثہٗ فی الطیرۃ وھو مرسل۔ (مرقاۃ ص۵۲۶ ج۴)

اَلْکَہَانَۃُ

کہانت

(۳۸۹) عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ الْحَکَمِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اُمُوْرًا کُنَّا نَصْنَعُھَا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ کُنَّا نَأْتِی الْکُھَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتُوا الْکُھَّانَ قَالَ قُلْتُ کُنَّا نَتَطَیَّرُ قَالَ ذٰلِکَ شَیْءٌ یَّجِدُہٗ اَحَدُکُمْ فِیْ نَفْسِہٖ فَلَا یَصُدَّنَّکُمْ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ یَّخُطُّوْنَ خَطًّا قَالَ کَانَ نَبِیٌّ مِّنَ الْاَنْبِیَاءِ یَخُطُّ فَمَنْ وَّافَقَ خَطَّہٗ فَذَاکَ۔ (مسلم ص۲۳۳ ج۲ مشکوٰۃ ص۳۹۲)

حضرت معاویہ بن حکمؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ بہت سے ایسے کام ہیں جو ہم جاہلیت میں کرتے تھے (مثلاً) ہم کاہنوں کے پاس جاتے تھے آپ نے فرمایا کہ تم کاہنوں کے پاس نہ جاؤ، معاویہ نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ ہم شگون لیتے تھے آپ نے فرمایا کہ یہ ایسی چیز ہے جس کو تم میں سے کوئی شخص اپنے دل میں پاتا ہے لہٰذا یہ چیز تمکو روک نہ دے۔ معاویہ نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ خط کھینچتے تھے فرمایا کہ پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر خط کھینچتے تھے توجسکا خط ان کے موافق ہوجاتا ہے تو وہ ٹھیک ہوتا ہے۔

(۳۹۰) عَنْ حَفْصَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَسَاَلَہٗ عَنْ شَیْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَہٗ صَلٰوۃُ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا۔ (مسلم ص۲۳۳ ج۲ مشکوٰۃ ص۳۹۳)

حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو "عراف" کے پاس گیا اور اس سے کوئی غیب کی بات پوچھی تو چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہ ہوگی۔

تشریح کَھانت بفتح الکاف وکسرها۔ کَھَنَ (ف ن ك) کَھَانَۃٌ بفتح الکاف غیب کی خبر دینا، اور بکسر الکاف کہانت کے پیشہ کو کہتے ہیں۔ یہاں پر مُراد وہ آئندہ کے امور غیبیہ ہیں جن کو لوگ نہیں جانتے۔ عرب میں اس کا دستور تھا اور بہت لوگ اس کا دعوٰی کرتے تھے کہ ہم آئندہ کی غیبی خبریں جانتے ہیں۔ اور کہتے تھے کہ جنات ہمارے تابع ہیں، وہ ہمیں آئندہ کی خبریں بتاتے ہیں۔ احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین آسمان کی جانب جاتے اور فرشتوں کی باتیں سُنکر کاہنوں تک پہونچاتے۔ اور وہ ان میں سَو اضافات کرکے کفار کو پہونچاتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ان شیاطین کو آسمانوں سے روکدیا گیا اور کہانت کا دیوالہ نکل گیا۔ بعض پنڈت اس کا دعوٰی کرتے تھے کہ ہم اسباب کے ذریعہ غیبی امور پہچان لیتے ہیں۔ مثلاً سائل کے کلام سے، اس کے فعل اور حال سے، اس کے نام وغیرہ سے۔ اور ایسے پنڈت کو اہل عرب عَرَّاف کہتے تھے۔ دوسرا فرق کہانۃ اور عرافۃ میں یہ بھی ہے کہ کاہن آئندہ کی خبریں دیتا ہے، اور عرّاف کی خبروں کا تعلق زمانۂ ماضی سے ہوتا ہے کمعرفۃ الشیٔ المسروق ومکانۃ الضالّۃ وغیرھما۔

(۳۸۹) اُمُوْرًا منصوب علیٰ شریطۃ التفسیر ہے، اور اس کا فائدہ تفخیم ہے۔ یعنی یا رسول اللہ چند امور جن کو ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں کرتے تھے۔ وہ شرعًا کیسے ہیں؟ مثلاً ہم لوگ کاہنوں کے پاس جاتے اور ان سے آئندہ کے متعلق سوال کرتے تھے۔ (کُھّان بضم الکاف وتشدید الھاء کَاہِن کی جمع ہے) تو آپنے فرمایا ان کے پاس نہ جاؤ، اور ان کے صدق کا اعتقاد نہ رکھو۔ کیونکہ آئندہ حالات کو تو صرف عالم الغیب ہی جانتا ہے، معاویہؓ نے دوسرا سوال یہ کیا کہ ہم بدفالی لیتے تھے۔ آپنے فرمایا کہ پرندوں اور حیوانات اور ان کے اسماء واصوات کو خیر وشر اور نفع و ضرر میں کوئی دخل اور اثر نہیں، بلکہ یہ آدمی کا اپنا خیال ہوتا ہے۔ علّامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ بجائے لاتطیروا کے یہ جواب زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ اس میں تطیر کی نفی دلیل کے ساتھ ہے۔ جب یہ تطیر خیالی چیز ٹھہری جس کا واقعات سے کوئی تعلق نہیں تو ایسی فرضی اور غیر واقعی چیز کا اعتقاد کرکے کاموں سے رک جانا عقلمندی کی بات نہیں۔ اسلئے تم اس خیال کی وجہ سے اپنے مقاصد سے نہ رُکو۔ — اور خیالی بے حقیقت اٹکلوں میں اُلجھ کر اپنے کاموں سے باز نہ رہو۔

معاویہؓ نے تیسرا سوال یہ کیا کہ ہم میں سے بعض لوگ خطوط کھینچکر آئندہ کے خیر وشر کا فیصلہ کرتے ہیں (اور اس علم کو علمِ رمل کہتے ہیں) آپنے فرمایا کہ ایک پیغمبر (حضرت دانیالؑ یا حضرت ادریسؑ) کو یہ علم عطا ہوا تھا۔ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّہٗ خط منصوب ہے مفعولیت کی بنا پر یا مرفوع ہے فاعلیت کی بنا پر، اور مفعول مقدر ہے ای فَمَنْ وَافَقَ خَطُّہٗ خَطَّ ذٰلِكَ النَّبِیِّ فَذَاكَ۔ یعنی جس کا خط اس نبی کے خط کے موافق ہوجاتا ہے تو وہ مُصیب (درست) ہوتا ہے، ورنہ نہیں —

حاصل یہ ہے کہ یہ طریقہ بھی اٹکل اور تخمینہ کا ہے۔کیونکہ موافقت موہوم ہے،اور امر موہوم کا یقین کرنا اور اس میں مشغول ہونا حرام ہے۔

(۳۹۰) عَرَّاف عارف کا مبالغہ ہے۔اس کے معنی کاہن،طبیب اور منجم کے آتے ہیں،علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی کاہن کی ایک قسم ہے۔علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ عراف شئ مسروق کا مکان اور گمشدہ چیز کی جگہ بتاتا ہے۔حاصل یہ ہے کہ عراف بھی ایک قسم کا کاہن ہی ہے۔جو شخص اس سے کوئی بات پوچھے اور اس کو سچا سمجھے اور اس کی تصدیق کرے تو چالیس روز اس کی نماز قبول نہیں ہوگی یعنی چالیس دن اس کو نمازوں کا ثواب نہ ملیگا۔گو ذمہ سے فریضہ ساقط ہوجائے (یہاں لَمْ تُقْبَلْ صیغہ تانیث ہے۔اور صلوٰۃ بالتنوین ہے یا مضاف بلاتنوین ہے) طبرانی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں مَنْ اَتٰی کَاهِنًا فَسَأَلَهٗ عَنْ شَیْءٍ حُجِبَتْ عَنْهُ التَّوْبَةُ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً فَاِنْ صَدَّقَهٗ بِمَا قَالَ کَفَرَ۔اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ تائب کے اعمال قبولیت کے درجۂ کمال کو پہونچتے ہیں کما قال تعالیٰ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس کی نماز کے قبول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو نمازوں کا ثواب نہ ملیگا۔اگرچہ فرض ساقط ہوجائیگا اور اعادہ کی ضرورت نہ رہے گی۔اس کی نظیر وہ نماز ہے جو مغصوب زمین میں پڑھی گئی ہو کہ اس میں بھی فرض ساقط ہوجاتا ہے،اور اُس پر ثواب مرتب نہیں ہوتا۔فرائض وواجبات جب صحیح طور سے ادا کیے جائیں تو ان پر دو چیزیں مرتب ہوتی ہیں،اُن کا ذمہ سے ساقط ہونا اور حصولِ ثواب۔اور جب ارضِ مغصوبہ میں نماز ادا کی جائے گی تو اول چیز تو حاصل ہوجائیگی (یعنی سقوطِ فرض وواجب) اور ثانی حاصل نہ ہوگی۔(یعنی ترتبِ ثواب) لیکن زیر بحث حدیث میں ان امور پر تو علماء کا اتفاق ہے کہ (۱) جو شخص عراف کے پاس گیا تو اس کی چالیس دن کی نمازوں کا اعادہ لازم نہیں ہوگا (۲) دوسرے یہ بھی مسئلہ مسلّم ہے کہ گناہوں سے نیکیاں باطل نہیں ہوتیں (۳) ہاں آدمی مرتد ہوجائے تو اسکے اعمال حبط ہوجائیں گے۔(۴) لیکن اگر مرتد مسلمان ہوجائے تو اسپر بھی نمازوں کا اعادہ واجب نہیں ہوگا،ہاں حج کا اعادہ کریگا۔کیونکہ وہ عمر بھر کا ایک فرض ہے،پہلا باطل ہوگیا اسلئے اس کا اعادہ کریگا۔ان سب باتوں سے یہ بات حاصل ہوئی کہ عراف کے پاس جانے والے کو نوافل وفرائض کا ثواب ملنا چاہئے کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔(اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے) اسلئے اگر عراف کی تصدیق کرنیوالا کافر نہیں ہوا تو مطلب حدیث کا یہ ہوگا کہ اس کو نمازوں کا نفسِ ثواب تو ملیگا لیکن اجر مضاعف جو انعام خداوندی ہے وہ چالیس روز تک اس انعام سے محروم ہوجائیگا۔کیونکہ اجر مضاعف انعام ہے جو خوشنودی سے حاصل ہوسکتا ہے۔اور اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی وغضب کا کام کیا ہے،اسلئے اس کو یہ محرومی ہوئی۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں وھو الاظھر والاقرب الی الصواب۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر تمام عبادات میں سے اس میں نماز کی تخصیص اسلئے ہوگی کہ وہ تمام اعمال میں افضل اور عماد الدین ہے۔
امام نووی فرماتے ہیں وَالْاَحْسَنُ اَنْ یُّفَوَّضَ عِلْمُہٗ اِلَی الشَّارِعِ (یعنی بہتر یہ ہے کہ اسکے علم کو شارع کے حوالہ رکھا جائے) اور اربعین کا عدد ہوسکتا ہے کہ تحدید کے لئے ہو یا تکثیر کے لئے ہو۔ واللہ اعلم
یاد رکھیے کہ اگر کوئی شخص کاہن وعراف سے استہزاء وتکذیب کیلئے کچھ دریافت کرتا ہے تو اس کیلئے یہ وعید مذکور نہیں ہے۔

حضرتِ معاویہ بن الحکمؓ

ھو معاویۃ بن الحکم السلمی صحابی نزل بالمدینۃ روی عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم وعنہ ابنہ کثیر وعطاء بن یسار وابو سلمۃ ابن عبد الرحمٰن قال ابو عمر یعتزل بالمدینۃ ویسکن بنی سلیم ثبت ذکرہٗ وحدیثہٗ فی صحیح مسلم وفی ابوداؤد والنسائی۔ مات سبع عشرۃ ومائۃ۔

حضرتِ حفصہؓ

ام المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر بن الخطابؓ ہیں۔ ان کی والدہ زینب بنت مظعون تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خنیس بن حذافہ سہمیؓ کے نکاح میں تھیں۔ اپنے شوہر کے ہمراہ ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے بعد بیوہ ہوگئیں۔ جب ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ وحضرت عثمانؓ سے ان کے نکاح کے سلسلہ میں ذکر کیا۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عدمِ ضرورت کا عذر پیش کردیا، اور صدیق اکبرؓ نے سکوت اختیار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے بعد حضرتِ ابو بکرؓ نے حضرتِ عمرؓ سے معذرت کی کہ آپ کو میرے سکوت سے ناگواری ہوئی ہوگی مگر مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ معلوم تھا اسلئے یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میں اپنے بارے میں کچھ کہوں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو ظاہر کردوں، اسلئے سکوت اختیار کرلیا تھا۔
بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام دیا تو حضرتِ عمرؓ نے اُن کا سرکارؐ سے ۳ھ میں نکاح کردیا۔
شیخ ولی الدین لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بار ایک طلاق دیدی تھی پھر جب آپ پر وحی نازل ہوئی کہ حفصہؓ سے رجعت کرلیجیے کیونکہ وہ بہت عبادت گذار، شب بیدار اور بہت روزے رکھنے والی ہیں، اور وہ جنت میں بھی آپ کی بیوی رہیں گی، تو آپ نے اُن سے رجعت کرلی تھی۔ اُن سے حضراتِ صحابہؓ وتابعینؒ میں سے ایک بڑی جماعت نے احادیث روایت کی ہیں۔ اور وہ براہِ راست نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اپنے والدِ محترم حضرتِ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں وفی الخلاصۃ لھا ستون حدیثًا اتفقا علی ثلثۃ وانفرد مسلم بستۃ وفات ساٹھ سال کی عمر میں شعبان ۴۵ھ میں ہوئی۔ رضی اللہ عنہا۔

کتبہ احمد نازش زیدی مظاہری

اَشْنَعُ الْاٰثَامِ وَالْمَعَاصِیْ

گناہوں اور نافرمانیوں میں بدترین گناہ

وَلَا یَذْھَلُ عَنْکَ اَنَّ اَقْبَحَ الْاٰثَامِ وَاَشْنَعَ الْمَعَاصِیْ ھُوَ الْاِحْدَاثُ
اور تم کو یہ یاد رہنا چاہئے کہ گناہوں میں بدترین گناہ اور نافرمانیوں میں سب سے بری نافرمانی دین میں کسی نئی بات کا
فِی الدِّیْنِ وَمَعْنَی الْاِحْدَاثِ فِی الدِّیْنِ اَنْ یُّجْعَلَ مِنَ الدِّیْنِ مَالَمْ یَکُنْ
پیدا کرنا ہے۔ اور دین میں نئی بات پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کو دین میں داخل کردے جو (دین میں داخل) نہیں
دِیْنًا وَھٰذَا ھُوَ التَّحْرِیْفُ فِی الدِّیْنِ وَھُوَ رَدٌّ مَّرْدُوْدٌ لَامُحَالَۃَ کَمَا۔
اور اسی کو دین میں تحریف کرنا کہتے ہیں۔ اور وہ نالائق قبول اور قابل رد ہے اس میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ

(۳۹۱) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس امر (دین) میں ایسی بات پیدا
ھٰذَا مَالَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ۔ (مشکوٰۃ ص۲۷)
کردے جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔

وَالْحَقُّ اَنَّ الْاِحْدَاثَ فِی الدِّیْنِ ھُوَ اِفْتِرَاءٌ عَلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْکَارٌ
اور حق یہ ہے کہ "احداث فی الدین" اللہ اور اس کے رسول پر بہتان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو اس امت کو دین
وَرَدٌّ لِمَا بَشَّرَ اللّٰہُ بِہٖ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ مِنْ تَکْمِیْلِ الدِّیْنِ حَیْثُ قَالَ
کے کامل کردینے کی خوشخبری دی ہے اس کا انکار اور رد ہے۔ کیونکہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا ہے
سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ
آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ فَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ
اور تمہارے اسلام کو دین ہونے کے لئے پسند کرلیا۔ تو تم نئی باتوں سے بچتے رہو۔
الْاُمُوْرِ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

(۳۹۲) وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّھَا ضَلَالَۃٌ وَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ
تم نئی باتوں (بدعات) سے بچتے رہو۔ کیونکہ نئی باتیں گمراہی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔ (ترمذی ص۹۲ ج۲ مشکوٰۃ ص۳۰)
نے فرمایا سارے کاموں میں بدترین بدعات ہیں۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

لغات

اَشْنَعُ اسم تفضیل شَنُعَ شَنَعًا (ف س) بُرا سمجھنا، رُسوا کرنا، گالی دینا۔ (ک) قبیح ہونا، الآثَامُ اِثْمٌ کی جمع گناہ بابہٗ سمع۔ المَعَاصِی مَعْصِیَۃٌ کی جمع (ض) مخالفت کرنا، نافرمانی کرنا۔ یَذْھَلُ (ف) بھولنا، غافل ہونا (س) ہکا بکا ہونا، ہوش میں نہ رہنا۔ اَقْبَحُ اسم تفضیل (ک) بدترین۔ التَّحْرِیْفُ پھیر دینا، بدل دینا، جھکانا (ض) بمعناہ۔ لا مَحَالَۃَ ضروری، لاشک فیہ۔ اِفْتِرَاءٌ تہمت لگانا، جھوٹ باندھنا۔ (ض) بمعناہ۔

تشریح

مؤلفؒ فرماتے ہیں کہ گناہوں میں سب سے زیادہ بُرا گناہ اور نافرمانیوں میں بدترین نافرمانی "احداث فی الدین" ہے۔ "احداث فی الدین" کا مطلب غیر دین کو دین میں داخل کر دینا ہے۔ اسی کو "تحریف فی الدین" کہتے ہیں جس کی اسلام میں قطعًا گنجائش و اجازت نہیں۔ اور ایسی کوئی بات دین نہیں بن سکتی۔ بلکہ وہ مردود و نامقبول ہے۔ چنانچہ:

(۳۹۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے ہمارے اس دین اسلام میں کوئی ایسی نئی چیز پیدا کر دی جو دین نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔ یعنی جس نے وہ بدعت ایجاد کی وہ اسی پر واپس ہے۔ وہ چیز دین نہیں بن سکتی۔ کیونکہ دین اپنی جگہ کامل و مکمل ہے، اس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہیں۔ مَا لَیْسَ مِنْہُ کا مطلب یہ ہے کہ جس کا کتاب و سنت سے کسی طرح ثبوت نہیں۔ لہٰذا جو احکام کتاب و سنت سے صراحت کے ساتھ یا استنباطِ مجتہدین سے ثابت ہیں وہی دین ہیں۔

(۱) درحقیقت بدعت اللہ اور اس کے رسولؐ پر زبردست الزام اور بدترین جھوٹ اور بہتان ہے۔ کیونکہ جو اپنی طرف سے مسئلہ گھڑ کر اس کو دین بتاتا ہے وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ اور اسکے رسولؐ نے یہ حکم دیا ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر افتراء و بہتان اور بدترین جھوٹ ہے۔

(۲) بدعتی بدعت کو دین گردان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (نعوذ باللہ) خیانت کا الزام رکھتا ہے کہ دین کا یہ حکم آپ نے بیان نہیں کیا۔ (۳) بدعتی دین میں نئی بات داخل کر کے اللہ اور اسکے رسولؐ کی تحمیق و تجہیل کرتا ہے کہ انہوں نے یہ حکم نہیں دیا حالانکہ یہ حکم ہونا چاہیئے تھا۔ (۴) بدعتی اپنی گھڑی ہوئی بدعت کو دین بنا کر حقِ تشریع میں دست اندازی اور شرک فی الرسالۃ کے جُرم کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ (۵) بدعتی دین کی بے بہا و حسین چادر میں ناپاک ٹاٹ کا پیوند لگا کر دین کو بگاڑتا ہے۔ اسی لیئے وہ مشرک و کافر سے بھی زیادہ خطرناک اور اسلام و مسلمین کے لئے مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اکرام کرنا اور اس کو ٹھہرانا دین کی عمارت کے منہدم کرنے میں اس کی اعانت اور سببِ لعنت ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی کوئی عبادت (فرض و نفل) قبول نہیں ہوتی۔ اور آخرت میں اس کو کتے کی شکل میں مسخ کر کے جہنم میں پھینک دیا جائیگا۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

(۶) بدعتی دینِ اسلام کو ناقص سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو قرآن پاک میں تکمیلِ دین و اتمامِ نعمت کی خوشخبری دی ہے اس کا انکار کرتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

(۱) یہ آیت عرفہ کے دن نازل ہوئی جو تمام سال کے دنوں میں سیدالایام ہے۔

(۲) یہ عرفہ جمعہ کے دن تھا اور جمعہ خود سیدالایام ہے۔ اس کے فضائل معروف ہیں۔

(۳) اس جمعہ میں بھی وقت عصر کے بعد کا تھا۔ جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خاص طور پر جمعہ میں قبولیتِ دعاء کی خاص گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے۔

(۴) پھر عرفہ کے دن اور بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونیکا خاص وقت ہے۔

(۵) مقامِ نزول میدانِ عرفات کا ایک خاص حصہ جبلِ رحمت کا قرب ہے۔ جو عرفہ کے دن نزولِ رحمت کا خاص مقام ہے۔

(۶) حج کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا اجتماع ہے جسمیں تقریبًا ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ شریک ہیں۔

(۷) سیدالانبیاء اپنے پروانوں (صحابہ کرامؓ) کے ساتھ جبلِ رحمت کے نیچے اپنی ناقہ عضباء پر سوار تشریف فرما ہیں، اور حج کے سب سے بڑے رکن (وقوفِ عرفہ) میں مشغول ہیں۔

(۸) یہ اتنا متبرک، عظیم المرتبت اور رفیع الشان مجمع ہے کہ نہ یہاں اس سے پہلے کبھی ہوا، نہ بعد میں ہوا، نہ قیامت تک ہوگا۔ ان برکتوں، رحمتوں، عظمتوں میں یہ آیتِ کریمہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ بقول ابن عباسؓ قرآن مقدس کی تقریبًا یہ آخری آیت ہے۔ جس کے بعد احکام سے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اس کے بعد صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیات کا نزول ہوا۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اکیاسی دن دنیا میں تشریف فرما رہے۔ کیونکہ ۹ ذوالحجہ ۱۰ھ میں اس آیت کا نزول ہوا۔ اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

یہ آیتِ پاک جو اس شان و اہتمام سے نازل ہوئی امتِ محمدیہ کے لئے ایک بہت بڑی بشارت، عظیم نعمت اور طغرائے امتیاز بفضلِ کارساز ہے۔ جس کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ دینِ برحق و نعمتِ خداوندی کا انتہائی معیار جو بنی نوعِ انسان کو عطاء ہونیوالا تھا وہ آج مکمل کر دیا گیا، گویا زمانۂ آدمؑ سے جو دینِ حق کی تنزیل و ترویج شروع ہوئی، اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسبِ حال اس نعمت کا ایک حصہ اولادِ آدمؑ کو عطاء ہوتا رہا آج (۹ ذی الحجہ ۱۰ھ) میں وہ انعامِ حق و دینِ برحق مکمل صورت میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو عطاء فرما دیا گیا۔

اس میں جس طرح تمام انبیاء و رسل پر سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت و فضیلت اور شانِ

امتیاز کا اظہار ہے۔ اسی طرح امت محمدیہ مرحومہ کی خاص فضیلت وشانِ امتیازی کا اعلان بھی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ چند علمائے یہود نے حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ کے قرآن میں ایک آیت ایسی ہے کہ یہود پر اگر ایسی آیت نازل ہوجاتی تو وہ اس کے نزول کے دن کو اپنے لئے جشن عید کا دن بنا لیتے۔ فاروقِ اعظمؓ نے پوچھا وہ کونسی آیت ہے؟ انہوں نے یہی آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ پڑھ دی۔
حضرت فاروقِ اعظمؓ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس مقام پر کس دن نازل ہوئی، اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لئے دوہری عید کا دن تھا، ایک عرفہ دوسرے جمعہ

تہواروں کا اسلامی اصول

فاروقِ اعظمؓ کے اس جواب میں ایک اسلامی اصول کیطرف اشارہ ہے۔ جو سارے عالم میں اسلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ہر قوم ومذہب کے لوگ اپنے اپنے حالات وخصوصیات کے تحت خاص خاص تاریخی واقعات (کسی بڑے آدمی کی پیدائش، وفات، تخت نشینی، فتح وغیرہ) کے دنوں کی یادگاریں مناتے ہیں، اور ان کو عید اور تہوار کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔ ان میں کسی شخصیت یا واقعہ کی یادگار یا عزت افزائی کے سوا کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اسلام "اشخاص پرستی" کا قائل نہیں۔ اس نے جسطرح "بت پرستی" کو مٹایا۔ اسی طرح "شخصیت پرستی" کو بھی ختم کیا ہے۔ اس نے ان تمام رسوم جاہلیت اور شخصی یادگاروں کو چھوڑ کر مقاصد کی یادگاریں قائم کرنیکا اصول بنایا۔
اسلام میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی موت وحیات یا شخصی حالات کا کوئی دن منانے کے بجائے ان کے اعمال کے دن منائے گئے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ووفات اور امتحانات میں کامیابیوں کے دن منانے کے بجائے ان کے اعمال میں جو چیزیں مقاصدِ دین کے متعلق تھیں ان کی یادگاروں کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ ان کو دین ومذہب کا جزء اور فرض وواجب قرار دیدیا گیا۔
قربانی، ختنہ، صفا، مروہ کے درمیان سعی، منیٰ میں تین مقامات پر کنکریاں مارنا وغیرہ یہ ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ کے ایسے اعمال کی یادگاریں ہیں جو انہوں نے اپنے نفسانی جذبات اور طبعی تقاضوں کو رضائے خداوندی پر قربان کرتے ہوئے ادا کیئے تھے۔
اسی طرح شب برات، شب قدر، رمضان المبارک، یوم عرفہ، یوم عاشوراء، جمعۃ المبارکہ وغیرہ شخصی یادگاریں نہیں۔ بلکہ اعمال واخلاق میں بلندیاں حاصل کرنے کے وہ اوقات ہیں جو منجانب اللہ مقرر کیئے گئے ہیں۔ عیدیں سال بھر میں صرف دو رکھی گئیں۔ وہ بھی خالص دینی اور عبادتی لحاظ سے۔
پہلی عید رمضان المبارک کے روزوں کی تکمیل اور حج کے مہینوں کی شروعات پر۔ اور دوسری عبادتِ حج سے فراغت کے بعد رکھی گئی۔

حاصل یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے بتادیا کہ یہود و نصاریٰ اور کفار کی طرح ہماری عیدیں تاریخی واقعات یا شخصی حالات کی یادگاریں نہیں ہوتیں۔ اور نہ مسلمانوں کا کوئی تہوار کفار کی طرح خود ساختہ ہوتا ہے۔ بلکہ ہمارے تہوار بھی وحیِ ربانی کے ذریعہ مقرر شدہ ہیں۔ اور اس آیت کے نزول کے وقت تو قدرتی طور پر دُو عیدیں موجود ہی تھیں۔ یومِ عرفہ اور یومِ جمعہ (اور صحابہؓ کے لئے دیدارِ حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام عیدوں سے بڑھکر تھا) ؎

عِیۡدٌ وَّعِیۡدٌ وَّعِیۡدٌ صِرۡنَ مُجۡتَمِعَہ ÷ وَجۡہُ الۡحَبِیۡبِ وَیَوۡمُ الۡعِیۡدِ وَالۡجُمُعَہ

عیدِ میلادُ النبیؐ

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ ولادت کی عید منائی۔ اسی طرح بہت سی دوسری غیر مسلم قوموں نے اپنے پیشواؤں کی پیدائش کے دن منائے۔ کچھ مسلمانوں نے ان کو دیکھ کر ان کی اتباع و پیروی کرلی۔ اور کفار کی اقتدا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش پر "عیدِ میلاد النبی" کے نام سے ایک عید گھڑلی اور اس سلسلہ میں بازاروں میں جلوس اور اقسام و انواع کی خرافات کے مظاہروں اور اس رات میں چراغاں وغیرہ خود ساختہ چیزوں کو عبادت سمجھ کر کرنے لگے۔ اس طرح حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلافِ امت کے خلاف کفار کی اتباع میں ایک جاہلانہ رسم جاری کردی۔

حالانکہ دن منانے کی یہ رسم ان قوموں میں تو چل سکتی ہے جو باکمال ہستیوں سے محروم اور ان کے حیرت انگیز کارناموں کے لحاظ سے مفلس ہیں۔ ان میں دو چار شخصیتیں اس قابل ہوتی ہیں، اور ان کے کچھ مخصوص کام ایسے ہوتے ہیں جن کی یادگار منانے کو وہ قومی فخر سمجھتی ہیں۔ اسلام کے دامن میں قابلِ فخر و مایۂ ناز شخصیتیں بے شمار ہیں۔ اور ان شخصیتوں کے حیرت انگیز کارنامے لاتعداد ہیں۔

اسلام میں اگر دن منانے کی رسم چلے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار تو انبیاء علیہم السلام ہیں جن کی نہ صرف پیدائش بلکہ ان کے حیرت انگیز معجزات اور عظیم الشان کارناموں کی بڑی طویل فہرست ہے جن کے دن منائے جائیں۔ پھر ان پیغمبروں کے صحابہؓ اور ان کے عظیم کارنامے نہ معلوم کتنے ہیں۔ پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ہر لمحہ عجیب و غریب کارناموں اور حیرت انگیز معجزات سے لبریز ہے جن کا دن منایا جائے۔ پھر نزولِ قرآن، غزوات، فتوحات وغیرہ واقعات میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کا دن نہ منایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ ہیں جن میں سے ہر ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ ہے۔ کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی کہ ان کی اور ان کے بیشمار کارناموں کی یادگاریں نہ منائی جائیں۔ اور یہ رسم چل پڑے تو صحابہ کرامؓ کے بعد تابعینؒ، ائمہ دینؒ، فقہاؒ و محدثینؒ، علمائے امت، اولیاء اللہ، مشائخ کرام اور مجاہدینِ اسلام پر نظر ڈالیئے تو کروڑوں کی مقدار میں ہیں۔ یادگاری دن منائے جائیں تو ان کو چھوڑ دینا کیا ان کے حق

میں بے انصافی اور ناقدرشناسی نہ ہوگی۔ اور اگر یہ طے کرلیا جائے کہ سبھی کے یادگاری دن منائے جائیں تو سال بھر میں کوئی دن ہمارا یادگار منانے سے خالی نہ رہے۔ بلکہ ہر دن کے ایک ایک لمحہ میں ہزاروں کی یادگاریں اور عیدیں منانی پڑیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اس کا قرار نہ رسمِ جاہلیت کو جاری نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کو کفار کا شیوہ قرار دیکر نظر انداز فرمادیا۔ یہود کے جواب میں فاروقِ اعظمؓ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

آیتِ شریفہ کا مطلب

اس آیت میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امتِ مرحومہ کو تین خصوصی انعامات کی بشارت دی۔ (۱) اکمالِ دین (۲) اتمامِ نعمت (۳) اس امتِ مرحومہ کے لئے اسلام کا انتخاب۔

پہلا انعام اکمالِ دین

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا مطلب یہ بتایا ہے کہ:

"آج دینِ حق کے تمام حدود و فرائض اور احکام و آداب مکمل کردیئے گئے ہیں، اب نہ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت ہے نہ کمی کا احتمال" (روح) یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کوئی حکم نازل نہیں ہوا، ہاں ترغیب و ترہیب یا نازل شدہ احکام کی تاکید کی آیات اتریں۔

اور مجتہدین وائمہ دین نے جو نئے نئے واقعات و حالات پیش آنے پر اپنے اجتہاد سے مسائل بیان فرمائے وہ سب اصولِ شرعیہ کی روشنی میں احکامِ شرعیہ کے حدود و فرائض وغیرہ کی تشریحات ہیں۔

دوسرا انعام اتمامِ نعمت

وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ سے مراد مسلمانوں کا غلبہ و عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے۔ جسکا آغاز و ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسومِ جاہلیت کے مٹانے اور اس سال مشرکین کے حج میں شریک نہ ہونے سے ہوا۔

اکمال و اتمام میں فرق

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دین کے ساتھ تو لفظ اَکْمَلْتُ استعمال فرمایا گیا۔ اور نعمت کے ساتھ لفظ اَتْمَمْتُ حالانکہ بظاہر دونوں ہم معنیٰ اور مترادف ہیں۔ لیکن درحقیقت دونوں کے مفہوم میں ایک فرق ہے جس کو امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں ذکر کیا ہے کہ کسی چیز کا اکمال و تکمیل اس چیز کی غرض اور مقصود کے پورا ہوجانے کو کہتے ہیں۔ اور اتمام شئی کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی دوسری شئی کی ضرورت و حاجت نہ رہی۔ اس لئے اکمالِ دین کا حاصل یہ ہوا کہ قانونِ الٰہی و احکامِ دین کا جو مقصد تھا وہ آج پورا ہوگیا۔ اور اتمامِ نعمت کا مطلب یہ ہوا کہ اب مسلمان کسی کے محتاج نہ رہے۔ ان کو خود حق تعالیٰ نے غلبہ و قوت اور اقتدار عطاء فرمادیا جس سے وہ اپنے دین کے احکام کو خود جاری و نافذ کرسکتے ہیں (لیکن بندۂ ناچیز کے نزدیک اکمالِ دین کا مطلب یہ ہے کہ دینِ اسلام میں قیامت تک کیلئے کمی یا بیشی کی کوئی گنجائش

اور ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور اتممت اس کی وضاحت اور دلیل ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے کسی شعبۂ حیات میں اسلام کے علاوہ کسی مذہب یا آئین کی ضرورت نہیں۔ اسلام ایسا آئینِ خداوندی ہے کہ جس میں مسلمانوں کو قیامت تک پیش آنیوالے حالات اور مسائل انفرادی واجتماعی کا حل اس میں موجود ہے۔ اور یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اسلام سے ہٹ کر کسی اور مذہب وآئین میں اسکا تلاش کرنا عبث ہے۔ اور یہ بھی اسلام کی حقانیت کا روشن ثبوت اور برہانِ قاطع ہے۔ اسی لئے تیسرے جزء میں رَضِیتُ لَکُمُ الخ سے اسلام کی پسندیدگی کا اعلان اور اس کی پیروی کا حکم فرمایا گیا۔ کیونکہ جب اسلام کا کامل وہمہ گیر زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونا ثابت ہوچکا، تو یہ بات خود بخود بطور نتیجہ مفہوم ہوگئی کہ اسلام ہی اختیار کرلینے کے لائق مذہب ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں دنیا کے تمام مذاہب ناقص وناپسندیدہ ہیں۔ واللہ اعلم

نسیم احمد غازی مظاہری

فوائد

(۱) آیت شریفہ میں حق تعالیٰ نے دین کی نسبت مسلمانوں کی طرف اور نعمت کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا میں دین کا ظہور مسلمانوں کے اعمال وافعال سے ہوتا ہے۔ اور عطائے نعمت اور اس کا اتمام اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔

(۲) اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ کی تقریر سابق سے یہ وہم نہ کرنا چاہئے کہ پہلے پیغمبروں کے ادیان ناقص تھے بلکہ جس طرح ان حضرات کی نبوتیں تمام زمانوں، مکانوں اور انسانوں کے لئے عام نہ تھیں۔ اسی طرح ان کے ادیان بھی ان کی نبوتوں اور محدود امتوں کے اعتبار سے کامل ومکمل تھے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے برخلاف کہ آپ تمام جن وانس، پورے عالم اور قیامت تک تمام زمانوں کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ آپ کا دین، آپ کی ہمہ گیر رسالت ونبوت کے اعتبار سے کامل ہے۔ چونکہ دوسرے ادیان میں یہ کمال نہ تھا اسلئے ان کو منسوخ کردیا گیا۔ اور آیت مذکورہ کی جو تقریر بین القوسین کی گئی اسپر یہ وہم پیش نہیں آسکتا۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی اس کی تفسیر یہی منقول ہے۔

تیسرا انعام دینِ اسلام کی پسندیدگی

رَضِیتُ الخ یعنی ایسا کامل ومکمل دین جسمیں کمی اور بیشی ممکن نہیں۔ اور قیامت تک کسی دوسرے دین کی ضرورت نہیں۔ پورے عالم کے بسنے والے انس وجن کے انفرادی واجتماعی تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ یہ دین منسوخ ہونے سے محفوظ اور تحریف وتبدیل سے مامون ومصون ہے۔ اس ممتاز شان والا دین اسلام میں نے تمہارے لئے منتخب کیا۔ اور تکوینی طور پر تمہیں اس دین کے لئے پیدا کیا۔ اور اس دینِ کامل کو تمہارے لئے بھیجا ہے۔ ابن کثیر وبحر محیط وغیرہ میں روایت ہے

کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو سب مسلمان خوش ہو رہے تھے، مگر فاروقِ اعظمؓ رو رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی، تو عرض کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے۔ کیونکہ اکمالِ دین کے ساتھ ارسالِ رسول کی ضرورت بھی پوری ہو چکی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصدیق فرمائی۔ اور آنیوالے وقت نے بھی حضرت فاروق اعظمؓ کی دانائی کا ثبوت پیش کر دیا کہ اس آیت کے نزول کے اکیاسی دن بعد آفتابِ رسالت و نبوت غروب ہو گیا۔ (ماخوذ از معارف القرآن ج ۳)

وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ تم بدعات سے دُور رہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: (۳۹۲) تم بدعات سے بچتے رہو کیونکہ وہ گمراہی ہیں۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ تمام امور میں بدترین امر بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ ؎

اَلَا فَالْزَمُوْا سُنَّةَ الْاَنْبِيَاءِ ❊ اَلَا فَاحْفَظُوْا سِيْرَةَ الْاَصْفِيَاءِ

یاد رکھو۔ نبیوں کے طریقہ کو مضبوط پکڑ لو ❊ خبردار نیکوں کی سیرت کی حفاظت کرو۔

وَمَنْ يَّبْتَدِعْ بِدْعَةً لَّمْ يُكْرَمِ ❊ بِوِجْدَانِهٖ رُتْبَةَ الْاَتْقِيَاءِ

اور جو شخص کوئی بدعت گھڑے گا اس کو ❊ متقیوں کا رتبہ پانے کی عزت حاصل نہ ہوگی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔ البدعة کل شیءٍ عمل بغیر مثالٍ سبق (بدعت ہر ایسی چیز ہے جس پر عمل کیا جائے۔ اور پہلے سے اس کی مثال نہ ہو) یہ دراصل بدعت کے لغوی معنی ہیں۔ شرعاً بدعت کے معنی یہ ہیں کہ " دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کر لینا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی۔ لیکن یہ تعریف بھی ناقص ہے۔ اس ناقص تعریف ہی کے پیشِ نظر حدیث کل بدعةٍ ضلالة میں تاویل کر کے اس کو "عام مخصوص منہ البعض" ماننا پڑتا ہے۔ یا بدعت کی تقسیم بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی طرف کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر شیخ عزّ الدین بن عبد السلام نے اپنی کتاب "القواعد البدعة" میں بدعت کی ۵ قسمیں بیان کر ڈالیں۔

(۱) بدعتِ واجبہ۔ جیسے قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے علم نحو کا حاصل کرنا، اور جیسے اصولِ فقہ کی تدوین اور (رواۃِ حدیث کے بارے میں) جرح و تعدیل پر کلام کرنا۔

(۲) بدعتِ محرمہ۔ جیسے جبریہ، قدریہ، مرجئہ اور مجسمہ وغیرہ کے مذاہب اور ان پر رد بدعتِ واجبہ میں داخل ہے۔ کیونکہ ان بدعات و خرافات سے شریعت کی حفاظت فرضِ کفایہ ہے۔

(۳) بدعتِ مندوبہ۔ جیسے مسافر خانے، مدرسے اور خانقاہیں وغیرہ بنانا، اور ہر اچھا کام جو عہدِ اوّل میں نہ تھا۔ جیسے جماعتِ عامہ کے ساتھ تراویح ادا کرنا، اور تصوّف کی باریکیوں میں کلام کرنا۔

(۴) بدعتِ مکروہہ۔ جیسے مَساجد اور مَصاحِف کا مزیّن کرنا۔ یعنی شافعیہؒ کے نزدیک اور احنافؒ کے نزدیک مساجد اور مصاحف کا مزیّن کرنا جائز ہے (بشرطیکہ مالِ مسجد سے نہو)

(۵) بدعتِ مباحہ۔ جیسے شوافع کے نزدیک بعد نمازِ فجر اور بعد نمازِ عصر مصافحہ کرنا۔ اور احنافؒ کے نزدیک یہ مصافحہ مکروہ ہے۔ اسی طرح کھانے پینے اور مکانات وغیرہ میں وُسعت و فراخی کرنا۔

شیخ عزّ الدینؒ فرماتے ہیں کہ ان میں سے بعض اقسام میں اختلاف بھی ہے جیسا کہ ہم نے (مصافحہ و تزیین مساجد وغیرہ) میں اوپر بیان کر دیا۔

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جو نئی چیز کتاب و سنت، آثارِ صحابہؓ و اجماعِ امّت کے خلاف ہوگی وہ بدعت و گمراہی ہوگی۔ اور جو کارِ خیر ان کے خلاف نہو گا وہ مذموم نہیں ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے قیامِ رمضان (تراویح با جماعت) کے بارے میں فرمایا نعمت البدعۃ ھٰذہٖ (یہ اچھی بدعت ہے) (ھٰذا اٰخر کلامِ الشیخ فی تھذیب الاسماء و اللغات) ورُوِیَ عن ابن مسعودؓ ما راٰہ المؤمنون حسنًا فھو عند اللہ حسن (یعنی اجماعِ امّت جس چیز پر ہو جائے وہ چیز اچھی ہے) اور حدیث مرفوع میں ہے اِنَّ اللہَ لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَۃٍ۔ (اللہ تعالیٰ میری امّت کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے گا)

امام نوویؒ نے بدعت کی جیسی ناقص تعریف کی ہے اسی بنا پر کسی کو احادیث میں تاویلاتِ رکیکہ کرنی پڑیں، کسی نے کہا کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بدعتِ حسنہ، ایک بدعتِ سیئہ۔ اور اس تقسیم کے پیشِ نظر ہر بوالہوس اپنی خرافات کو بدعتِ حسنہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے مسلمانوں کو دھوکہ اور گمراہی میں مُبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح بعض نے بدعت کی دو قسمیں کر دیں۔ بدعت فی الدین، بدعت للدین۔ اور کہا کہ پہلی قسم جائز اور دوسری قسم ناجائز ہے۔ اس تقسیم نے بھی گمراہوں کو گمراہی کی ترویج کی راہ دیدی۔ اگر کوئی تعزیہ داری کرتا ہے اور قبروں کو پختہ بنا کر ان کو سجدہ گاہ بنا دیتا ہے، وہ سب ان کو دین کی بقاء کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب تقسیمات اور احادیثِ رسولؐ میں تاویلات باطل ہیں۔ نہ کوئی بدعت اچھی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ایسی چیز جس کو دین کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہو بدعت میں داخل ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی بدعت مباح، مندوب اور واجب ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی کسی صحابی (مثلاً حضرت عمرؓ) کے کسی فعل کو شرعًا بدعت کہا جا سکتا ہے۔ جن حضرات نے ایسا کہا انہوں نے عقل و انصاف سے کام نہیں لیا۔ یا وہ دین کے اقدار اور سنت و بدعت کی حقیقت تک رسائی سے بے بہرہ رہے۔ واللہ اعلم

اس اجمال کی وضاحت یہ ہے کہ جو کچھ کتاب و سنت، اجماعِ امت اور قیاسِ شرعی سے ثابت ہے وہ سب دین ہے۔ اور سنت میں داخل ہے۔ آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ سب سنت میں داخل ہیں۔ اور ہر دور کے اہلِ خیر کا کسی مسئلہ پر اجماع ہدایت ہے۔ لا تجتمع امّتی علی الضلالۃ۔

ہاں اگر ان چاروں مذکورہ دلیلوں میں سے کسی دلیل سے کوئی چیز ثابت نہیں تو وہ بددینی و گمراہی اور بدعت ہے۔ اب سمجھئے کہ حضرت عمرؓ نے جو تراویح باجماعت کا نظم فرما کر نعمت البدعۃ ھٰذہ فرمایا اس سے لغوی معنی مراد ہیں یعنی یہ نیا طریقہ کیسا اچھا ہے۔ اس سے وہ شرعی بدعت ہرگز مراد نہیں ہو سکتی۔ جو زیر بحث ہے۔ اور جس پر احادیث میں وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کے فعل کو کیسے بدعت کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام خلفائے راشدین کے اعمال وافعال کو سنت قرار دیکر ان کو مضبوطی سے تھام لینے کا حکم فرمایا ہے۔ جیسا کہ عرباض بن ساریہؓ کی حدیث (۳۹۳) میں عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الخ میں آرہا ہے۔ اسی طرح کسی صحابی کے کسی فعل کو بدعت کہنا بددینی اور جرأت بے جا ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ۔ (مشکوۃ ۵۵۴) میرے صحابہ ستاروں کی طرح روشن ہیں ان میں سے تم جس کی بھی اتباع کرلوگے ہدایت پاجاؤگے۔

اسی طرح علوم آلیہ (صرف و نحو، کلام، اصول فقہ و حدیث، اسمائے رجال، جرح و تعدیل اور مذاہب باطلہ کی تردید وغیرہ) کو بدعت کہنا غلط ہے۔ یہ سب سنت میں داخل ہیں۔ کیونکہ انکی تحصیل پر تمام امت کا اجماع ہے۔ اسی طرح مساجد کے میناروں کی تعمیر، مساجد کی تزئین، مصاحف کی تزئین، مدرسوں و مسافر خانوں اور خانقاہوں کی تعمیر وغیرہ پر تمام امت کا اجماع ہے۔

آیات قرآنیہ و احادیث صحیحہ سے اجماع امت کا معتبر اور اصول دین میں داخل ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ کی دو حدیثیں اوپر بھی مذکور ہو چکیں۔ (۱) ما راٰہ المؤمنون حسنًا الخ (۲) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ اُمَّتِيْ الخ اجماع کے حجت ہونے کی وجہ سے ائمہ اربعہ کی تقلید بھی ہدایت ہے۔ کیونکہ تکوینی طور پر تمام امت کا اجتماع تقلید پر ہو چکا۔ اس کے بعد تقلید سے بغاوت کی بدعت آئی ہے۔ افسوس ہے کہ احادیث سے بغاوت کرنے والے غیر مقلدین اپنے آپ کو "اہل حدیث" کہہ کر اپنے انکار حدیث کے عیب کو چھپاتے ہیں۔ اگر وہ احادیث کے منکر نہ ہوتے تو ضرور ائمہ کی تقلید کرتے۔ اور اجماع کے سلسلہ کی احادیث کا انکار نہ کرتے۔

ایک بات اور سمجھئے وہ یہ کہ اگر عبداللہ نے عبدالرحمٰن کے پاس ایک ہزار روپے کی رقم امانت رکھی تو شرعًا عبدالرحمٰن امین کہلائیگا۔ اب ان کے ذمہ اس امانت کی حفاظت ضروری ہوگئی۔ وہ اس کا بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرکے اس امانت کی حفاظت کریں۔ اپنی جیب میں رکھ کر، صندوق یا تجوری میں رکھ کر یا کسی اپنے معتمد علیہ معتبر شخص کے پاس رکھ کر، غرض جس طرح بھی وہ امانت محفوظ رہے وہ اس کو اختیار کرنے کے مامور و مکلف ہیں۔ اور نفس امانت میں ان کو کسی قسم کے تبدیل و تصرف کا اختیار نہیں ہے۔ اگر کرتے ہیں تو وہ خیانت میں شمار ہوگا۔

اسی طرح امانتِ دین کی حفاظت جن علوم، جن مکانات اور جن طریقوں سے ہو سکتی ہے امت ان سب کی مکلف ہے۔ اصل امانت دین ہے۔ اس کی ہر طرح حفاظت کیجائے۔ جو بہتر طریقہ بھی اس کی حفاظت کا اختیار کیا جائیگا صحیح ہے۔ وہ اصل دین نہیں۔ اور طریقہ کی تبدیل دین کی تبدیل نہیں ہے۔ ہاں دین کی امانت میں دخل اندازی اور تبدیل و تصرف خیانت و بددینی ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن چیزوں کو بدعت للدین بتایا جاتا ہے یا بدعت حسنہ کا نام دیا جاتا ہے، اور عزالدین بن عبد السلام نے جس کی وجہ سے بدعت کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا یہ سب عبث باتیں ہیں۔ اور ان چیزوں کو بدعت و سنت کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ احادیث میں کسی ادنی تاویل کی ضرورت ہے۔ اسی لئے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں ارشاد فرمایا کہ کوئی بدعت، بدعت حسنہ نہیں ہو سکتی۔ ہر بدعت سیئہ اور ضلالت ہے۔ ان سب کے علاوہ اگر غور کیا جاتے تو مدرسہ کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رکھدی تھی۔ صفہ آپ کے مدرسہ کا نام تھا، اور اصحاب صفہ طلبہ تھے۔ ان کے کھانے کا نظم صدقات اور چندہ سے ہوتا تھا۔ مسجد نبوی کی تزئین و توسیع حضرت عثمانؓ نے فرمائی تھی۔ جو اس زمانہ کے اعتبار سے تھی۔ فرق باطلہ وعقائد فاسدہ کی تردید قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ (ابن عباسؓ وغیرہ) کے خوارج وفرق باطلہ سے مناظرے مشہور ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن وسنت، آثار صحابہؓ وتابعینؒ اجماع امت اور قیاس شرعی سے جن چیزوں کا ثبوت موجود ہے ان کو بدعت میں کس طرح داخل کیا جا سکتا ہے۔ اور شرعی دلائل سے جن کا ثبوت نہیں ان امور میں خیر اور حسن کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اس تحریر کے مطالعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا مطالعہ فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: اِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ۔ تم ان نئی باتوں سے پرہیز رکھو جن کا شرعًا کوئی ثبوت نہیں۔ سب سے زیادہ بدترین اور خطرناک امور یہی نئے امور ہیں۔ ان کو دین میں شامل کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ دین میں تحریف و تبدیل ہو جاتے۔ اور جس طرح پہلے تحریف و تبدیل کی راہ سے گمراہی میں جا پھنسے، کہیں اسی طرح بدعات کی مرتکب ہو کر یہ امت بھی گمراہی کے غار میں نہ جا پڑے۔

وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ۔ تمام امور میں بدترین نئے امور ہیں۔ اور ہر نئی گھڑی ہوئی چیز بدعت ہے۔ جس کا انجام جہنم ہے۔

---

(۳۹۳) عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلّٰی بِنَا ذَاتَ یَوْمٍ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِیْغَةً ذَرَفَتْ
ایک دن ہم کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ ہماری جانب اپنے رخ انور کے ساتھ متوجہ ہوئے اور ہمکو بہت موثر وعظ فرمایا کہ اس سے
مِنْهَا الْعُیُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ قَالَ فِیْهَا مَنْ یَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِیْ
آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور اس سے دل ڈر گئے۔ اس وعظ میں آپ نے (یہ بھی) فرمایا کہ تم میں جو میرے بعد زندہ رہے گا
فَسَیَرٰی اخْتِلَافًا كَثِیْرًا فَعَلَیْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ
تو بہت اختلافات دیکھے گا۔ تو تم میری سنت کو اور ان خلفاء کی سنت کو مضبوط پکڑ لینا جو رشد وہدایت والے
الْمَهْدِیِّیْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِیَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ
ہیں۔ (اسکی بار بار تاکید کرتا ہوں کہ) اس کو تم مضبوطی سے تھام لینا۔ اور اس کو ڈاڑھوں سے پکڑ لینا۔ اور تم نئے امور سے
الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ [ابوداؤد ص۲۸۵ ترمذی ص۹۲، ابن ماجہ ص۵ مشکوٰۃ ص۲۹]
بچتے رہنا۔ کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (اور گمراہی کا انجام دوزخ ہے)

(۳۹۴) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِیْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ یَّمِیْنِهٖ وَعَنْ
ایک (سیدھا) خط کھینچا پھر فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر آپ نے چند خطوط اس خط کے داہنے اور بائیں کھینچے
شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰی كُلِّ سَبِیْلٍ مِّنْهَا شَیْطَانٌ یَّدْعُوْ اِلَیْهِ
اور فرمایا یہ ایسے راستے ہیں کہ ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔
وَقَرَأَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ۔ الآیۃ (مشکوٰۃ ص۳۰)
اور آپنے یہ آیت تلاوت فرمائی " وانّ ہٰذا صراطی مستقیماً " الخ

(۳۹۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ
لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ كَمَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ
میری امت پر ضرور ایسا وقت آئیگا جیسا بنی اسرائیل پر آچکا ہے بالکل اس طرح جیسے ایک جوتہ دوسرے
بِالنَّعْلِ حَتّٰی اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَّنْ اَتٰی اُمَّهٗ عَلَانِیَةً لَكَانَ فِیْ اُمَّتِیْ
جوتہ کی برابر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے اگر کوئی ایسا ہوا کہ اس نے اپنی ماں سے کھلم کھلا زنا کیا تھا
مَنْ یَّصْنَعُ ذٰلِكَ وَاِنَّ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰی ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ
تو ضرور میری امت میں سے بھی وہ ہوگا جو ایسا کریگا۔ اور بیشک بنی اسرائیل بہتر ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے

مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ
اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سب کے سب دوزخ میں جائیں گے۔
اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ
مگر صرف ایک فرقہ (نجات پائیگا) صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کونسا فرقہ ہے۔ آپ نے فرمایا یہ فرقہ وہ ہوگا
أَصْحَابِي۔ (ترمذی ج۲ ص۸۹ مشکوٰۃ ص۳۰)
جس کا طریقہ حیات وہ ہوگا جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے۔

لغات ذَرَفَتْ (ض) بہنا۔ تفعیل سے متعدی وَجِلَتْ (س) ڈرنا، خوف محسوس کرنا۔ افعال سے متعدی (ك) بوڑھا ہونا۔ الرَّاشِدِيْنَ اسم فاعل جمع مذکر (ن س) ہدایت پانا، راہ راست پر چلنا۔ الْمَهْدِيِّيْنَ اسم مفعول جمع مذکر۔ وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ حق کی طرف رہنمائی کریں۔ تَمَسَّكُوْا تفعّل سے چمٹنا (ن ض ك) چمٹنا، روکنا، متعلق ہونا۔ عَضُّوْا (س) دانت سے پکڑنا، کاٹنا۔ با اور علیٰ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ النَّوَاجِذُ نَاجِذَةٌ کی جمع ڈاڑھ، اخیر کی ڈاڑھ، کچلی عَضَّ عَلٰى نَاجِذِهٖ ای بلغ وکمل عقلہ اسلئے کہ نواجذ بلوغ وکمال عقل کے بعد نکلتی ہے۔ (ض) ڈاڑھوں سے کاٹنا۔ اصرار کرنا۔ خَطَّ (ن) لکھنا، نشان لگانا، لکیر کھینچنا۔ عَلَانِيَةً کھلم کھلا۔ ج عَلَانُوْنَ (ن ض س ك) ظاہر ہونا۔

تشریح (۳۹۲) حضرت عرباض بن ساریہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوکر آپ نے ایک ایسا زبردست اور مؤثر وعظ فرمایا جس سے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور لوگوں کے دل خوف زدہ ہوگئے۔ مشکوٰۃ شریف، ترمذی شریف اور ابن ماجہ شریف وغیرہ میں وَجِلَتِ الْقُلُوْبُ کے بعد یہ بھی ہے:

فَقَالَ رَجُلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا فَقَالَ أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا۔

تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ یہ رخصت کرنیوالے کا سا وعظ ہے۔ لہٰذا ہم کو وصیت فرما دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور سننے کی اور اطاعت کرنیکی اگرچہ (تمہارا مطاع وامیر) حبشی غلام ہی کیوں نہو۔ (آگے ارشاد فرمایا)

کیونکہ تم میں سے میرے بعد جو زندہ رہیگا تو وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا (اس میں اہل بدعت و اہل ہویٰ کے ظہور کی طرف اشارہ ہے) تو ان اختلافات کے وقت فتنوں سے نجات کا ایک ہی طریقہ ہے

کہ تم میرے اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو مضبوطی سے تھام لینا۔ (اور خلفائے راشدین کا مصداق ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ ہیں۔ کیونکہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ میرے بعد خلافت تیس ۳۰ سال رہے گی۔ اَلْخِلَافَةُ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً۔ اور یہ مدت تقریباً حضرت علیؓ کی خلافت پر تمام ہوجاتی ہے)

فوائد (۱) ترمذی وابن ماجہ میں صَلّٰی بِنَا الٰی قولہ بوجھہ مذکور نہیں۔ بلکہ ان میں یہ حدیث وَعَظَنَا سے شروع ہے۔ (۲) ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ کو وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ پر اسلئے مقدم فرمایا گیا کہ یہ بتا دیا جائے کہ اس وعظ کا اثر ظاہر و باطن دونوں پر ہوا۔ اور ظاہر چونکہ دلیلِ باطن ہوتا ہے اسلئے ظاہر کی کیفیت کو اول بیان فرمایا گیا۔ فانّ الظاهر عنوان الباطن ۔ و يستدل بالدمعة على الخشية وان كانت هى موجبة للدمعة۔ والله اعلم۔

(۳) کمال تاثیر کی وجہ سے سائل نے سوال کیا کہ یہ تو ایسا وعظ ہے جیسے کوئی رخصت ہوتے ہوئے وصیت کرتا ہے۔ اور کوئی ضروری بات نہیں چھوڑتا، اور اس کی باتوں کا سننے والوں پر غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ (۴) آپؐ نے وصیت میں تین باتوں کا ذکر فرمایا۔ ایک تقویٰ جو بنیادی چیز ہے۔ خوفِ خدا کے بغیر صلاح و فلاح کا حصول ممکن نہیں ؎

اِذَا اَنْتَ لَمْ تَرْحَلْ بِزَادٍ مِّنَ التُّقٰى ✽ وَلَاقَيْتَ بَعْدَ الْمَوْتِ مَنْ قَدْ تَزَوَّدَا

جب تو نے تقویٰ کا توشہ ساتھ لیکر سفر نہیں کیا ✽ اور تو نے موت کے بعد اس سے ملاقات کی جسکے پاس یہ توشہ تھا

نَدِمْتَ عَلٰى اَنْ لَّا تَكُوْنَ كَمِثْلِهٖ ✽ وَاِنَّكَ لَمْ تَرْصِدْ كَمَا كَانَ اَرْصَدَا

تو تو اس پر نادم ہوگا کہ تو اس کی طرح کیوں نہیں ہے ✽ اور تو نے وہ تیاری کیوں نہیں کی جو اس نے کرلی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ خلیفۂ وقت و امام المسلمین اور اپنے بڑوں کی بات سنو۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان کی بات سنکر مانو۔ اور اسپر عمل درآمد کرو بشرطیکہ وہ جائز بات ہو کیونکہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت ناروا ہے۔ گو ناجائز امر پر اس سے محاربہ بھی جائز نہیں۔ اور بطورِ تاکید ارشاد فرمایا وَاِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا۔ وہ امیر و مطاع اگرچہ حبشی غلام ہی کیوں نہو۔ تب بھی سمع و اطاعت واجب ہے۔ اس کے نسب و حسب پر نظر نہ کرنی چاہیئے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر سمع و طاعت نہ کی گئی تو اختلافات اور فتنوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ اسلئے ادنیٰ اور دنی کی امارت و اطاعت پر صبر سے کام لینا چاہیئے اس تاکید سے مقصد سمع و طاعت میں مبالغہ ہے۔ یا امیر متسلّط کا حکم بیان کرنا ہے۔ ورنہ تو حبشی کو امیر نہ بنایا جائیگا کیونکہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: الائمة من قريش۔ چنانچہ آگے فرمایا گیا کہ جو تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔

(۵) الخلفاء کے ساتھ دو ۲ صفتوں کا ذکر بھی فرمایا گیا۔ الرّاشدين جس سے بتادیا کہ ان کا عمل میرے طریق ہی پر ہوگا۔ اور وہ میری سنت ہی کو اختیار کریں گے۔ المَهْدِيِّيْنَ اى الذين

هَدَاهُمُ اللّٰهُ اِلَی الْحَقِّ۔ کیونکہ جب آدمی خود ہدایت پر نہ ہو تو دوسروں کو وہ کیسے ہدایت دلسکتا ہے۔ بہرحال خلفائے راشدین مہدیین کے اولین مصداق خلفائے اربعہ صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، ذوالنورینؓ۔ اور ابو ترابؓ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہی چاروں باجماعِ اہل السنۃ افضل الامۃ ریاستِ کبریٰ و خلافتِ عظمیٰ کے بجا طور پر لائق و مستحق تھے۔ چنانچہ حضرتِ صدیق اکبرؓ باجماع صحابۂ کرامؓ خلیفۂ اول ہوئے۔ اور دو۲ سال تین ماہ دس دن جلوہ فرمائے مسندِ خلافت رہ کر اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ آپنے دین کی ہلتی ہوئی بنیادوں کو مضبوط فرمایا۔ فتنۂ ارتداد کا قلع قمع کیا۔ قرآنِ مقدس جمع کرایا اور کچھ بلاد فتح کیے۔ پھر آپ کے حکم سے فاروق اعظمؓ نے مسندِ خلافت کو شرف بخشا اور دس سال چھ ماہ دس دن مسندِ خلافت پر جلوہ افروز رہ کر آغوشِ رحمت میں آرام فرما ہوئے۔ آپنے اس عرصۂ امارت و خلافت میں وسیع فتوحات کیں، اور بے مثال عدل و انصاف قائم فرمایا۔ اور اپنی صلابت و شجاعت سے حلقۂ اسلام کو بے پناہ وسعت دی۔ آپنے چھ اہم شخصیتوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جو آپ کے بعد خلیفہ کو منتخب کرے۔ چنانچہ آپ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کو بالاتفاق خلیفہ چنا گیا۔ کیونکہ دورِ فاروقی میں بنو امیہ اہم عہدوں پر فائز تھے۔ اگر حضرت عثمانؓ خلیفہ نہ بنائے جاتے تو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا۔ آپ نے مکمل بارہ سال مساعی جمیلہ کے ساتھ مسندِ خلافت کو مزین فرمایا۔ امتِ مسلمہ کو ایک مصحف پر جمع کیا اور مصحف کی نقلیں تمام بلادِ اسلامیہ میں بھیجکر ایک قرارت پر سب کو متفق و متحد فرما دیا۔ ان کے بعد حضرتِ علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ کیونکہ خلفائے ثلثہ کے بعد امت میں سب سے افضل آپ ہی تھے۔ اور بنی ہاشم کے سردار (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) آپ ہی تھے۔ تقریباً پانچ سال آپ نے خلافت کے امور انجام دیئے۔ چھ ماہ آپ کے صاحبزادہ سید شباب اہل الجنۃ حضرت حسنؓ کا دورِ خلافت رہا۔ اس طرح خلافتِ راشدہ کے وہ تیس۳۰ سال مکمل ہو جاتے ہیں۔ جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ ارشاد فرمایا تھا کہ اَلْخِلَافَةُ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَضُوْضًا (میرے بعد خلافت تیس۳۰ سال رہے گی۔ پھر کٹ کھنی بادشاہت ہو جائے گی)

ولا یخفی ان هٰذا مِن مُعجِزَاتِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ الدَّالُّ علٰی صِدقِ نبوتهٖ لِاَنَّهٗ اسْتَبَدَّ بِذِكرِ هٰذا الغيبِ۔ فلولم تقعِ الخِلَافةُ علَى الترتيب المذكورِ لَحُرِمَ واحد منهم من ذٰلك المنصبِ المشكورِ۔ واللّٰه اعلم

لیکن اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلافتِ راشدہ صرف ان مذکورہ حضرات میں منحصر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بارہ۱۲ خلفاء ہوں گے، سب ہی قریش میں سے ہوں گے۔ (بخاری) چنانچہ بعض حضرات نے فرمایا کہ خلفائے راشدین سے مراد خلفائے اربعہ

اور تمام وہ ائمہ مسلمین اور علمائے مجتہدین ہیں جو ان حضرات کے طریقہ پر چلے۔ کیونکہ سب ہی احیاء حق وارشادِ خلق اور اعلائے دین وحمایتِ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں۔

(۶) نواجذ ناجذۃ کی جمع ہے۔ اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں۔ (الف) بالکل اخیر کی ڈاڑھ کو ناجذہ کہتے ہیں۔ (ب) سن (دانت) کے مرادف وہم معنی ہے۔ (ج) ناب یعنی کچلی کو کہتے ہیں۔ کچلیاں وہ چار دانت ہیں جو ڈاڑھوں اور دانتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ جب انسان کے دانت مکمل ہوجاتے ہیں تو ان کی تعداد بتیس ۳۲ ہوتی ہے۔ جن کو حسبِ ذیل اشعار میں جمع کیا گیا ہے ؎

ہے تعداد دانتوں کی کل تیس اور دو ۲ ثنایا ہیں چار اور رباعی ہیں دو دو
ہیں انیاب چار اور باقی رہے بیس ۲۰ کہ کہتے ہیں قرار اضراس انہیں کو
ضواحک ہیں چار اور طواحن ہیں بارہ ۱۲ نواجذ بھی ہیں ان کے بازو میں دو دو

تو یہ نواجذ بالکل اخیر کی چار ڈاڑھیں ہوئیں۔ اور لفظ عضّوا سے شدّت ملازمت یعنی خوب مضبوطی سے پکڑ لینے سے کنایہ ہے۔ کیونکہ جو کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑتا ہے تو اس کو سارے دانتوں سے پکڑ لیتا ہے مطلب یہ ہے کہ میری اس وصیت کی مضبوطی اور پورے صبر کے ساتھ محافظت کرو۔ اور میری اور میرے خلفاء کی سنت کو نہ چھوڑو۔ خواہ کتنی ہی مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں۔ بعض شراح کا خیال ہے کہ تَمَسَّکُوا اور عَضُّوا دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ اور یہ دونوں خلفائے راشدین کی صفات ہیں یعنی انہوں نے میری سنت کو مضبوطی سے پکڑا اور اس کی پوری پوری حفاظت کی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۷) وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ کا عطف فَعَلَیْکُمْ پر ہے۔ اور کُلَّ بِدْعَۃٍ میں لفظ کل منصوب ہے۔ تو اسمِ اِنَّ کے لفظ پر عطف ہے۔ یا مرفوع ہے تو اس کے محل پر عطف ہے۔

(۳۹۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (کیونکہ مثال سے معنوی چیز محسوس ومشاہد ہوکر جلد سمجھ میں آجاتی ہے اسلئے) بطور مثال آپ نے ایک سیدھا خط کھینچا پھر ارشاد فرمایا کہ (مثلاً) یہ اللہ کا راستہ یعنی صراطِ مستقیم ہے (جو صحیح اعتقادات اور نیک اعمال کا مجموعہ ہے۔ جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط) پھر آپ نے اس خطِ مستقیم کے دائیں جانب اور بائیں جانب کچھ اور ٹیڑھے ترچھے خطوط کھینچے اور ارشاد فرمایا کہ یہ سب شیطانی راستے ہیں۔ (یہ بطور تشبیہ معکوس فرمایا گیا۔ ورنہ تو یہ فرمایا جاتا کہ اللہ کا راستہ اس خط کی طرح سیدھا ہے۔ اور شیطانی راستے ان ٹیڑھے خطوط کی طرح ہیں۔ یعنی مشبہ بہ خطوط تھے۔ اور حدیث میں سُبُل اللہ اور سُبُل الشیطان کو مشبہ بہ قرار دیدیا گیا۔ فافہم) ان شیطانی راستوں میں سے ہر راستہ پر کوئی نہ کوئی (انسی یا جنی) شیطان ہے۔ جو لوگوں کو اپنے اس راستہ کی جانب دعوت دے رہا ہے۔ اور توحید واستقامت کے راستہ (صراطِ مستقیم) سے ہٹا کر ان بدعات وخرافات کے ٹیڑھے راستوں پر چلا کر

جہنم رسید کر دینا چاہتا ہے۔ وقَرَءَ اس کا فاعل یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا راوی حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ہیں۔ والاول اظہر۔ یعنی پھر یہ آیت تلاوت کی۔ وَاَنَّ هٰذَا الخ جس میں صراطِ مستقیم اور سُبُلِ شیاطین کا ذکر ہے۔ پوری آیت شریفہ یہ ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝
(انعام آیت ۱۵۳)

(اور آپ یہ بھی فرما دیں کہ) یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے۔ تو تم اسی راستہ پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

(ف) اس آیت میں لفظ ہٰذا کا اشارہ دینِ اسلام یا قرآن کی طرف ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ سورۂ انعام کی طرف اشارہ ہو جس کی یہ آیت ہے۔ کیونکہ اس سورت میں بھی پورے اصولِ اسلام توحید، رسالت اور اصولِ احکامِ شرعیہ مذکور ہیں۔ اور مستقیمًا صراطی کی صفت ہے جس کو نحوی ترکیب کے اعتبار سے بصورتِ حال ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ استقامت دینِ اسلام کی صفتِ لازمہ ہے۔ اور فَاتَّبِعُوْهُ میں بطور نتیجہ فرمایا کہ جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ دینِ اسلام میرا راستہ ہے۔ اور وہی سیدھا راستہ بھی ہے تو تم کو منزلِ مقصود کا سیدھا راستہ مل گیا ہے۔ جس کی تلاش ہر عاقل کو ہوتی ہے۔ اسلئے تم اب اسی کو اختیار کرو۔ اور اسی پر چلو۔

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ الخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تک رسائی اور اس کی رضا و خوشنودی کا راستہ ایک ہی ہے۔ لیکن لوگوں نے اپنے اپنے خیالات و شیطانی تعلیمات سے مختلف راستے گھڑ لئے ہیں۔ تم ان راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو کیونکہ وہ راستے منزلِ مقصود ذاتِ حق تک نہیں پہونچتے۔ اسلئے جو ان راستوں میں سے کسی راستہ پر چلے گا وہ راہِ خدا سے دور ہو جائیگا اور اس کو کبھی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل نہ ہوگی۔

صاحبِ تفسیرِ مظہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کی بعثت اور کتاب اللہ کے نزول کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات، ارادوں اور تجویزوں کو چھوڑ کر خود کو قرآن و سنت کے سانچہ میں ڈھال لیں۔ لیکن اب یہ ہو رہا ہے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ کو ماننے کے دعویدار قرآن و سنت کو ہی اپنے خیالات و تجویزات کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ جو آیت یا حدیث اپنے منشا و خیال کے خلاف نظر آئی اس کو اپنی خواہش کے مطابق بنا لیا۔ یہیں سے دوسری گمراہی کی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ جو بدعات و شبہات کی (شیطانی) راہیں ہیں۔ انہیں راہوں سے بچنے کے لئے اس آیت شریفہ میں ہدایت کی گئی ہے۔

آیت کے ختم پر بطور تاکید ارشاد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(اللہ تعالیٰ نے تم کو اس کا تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو) جس میں خوفِ خدا کی تلقین بھی تَتَّقُوْنَ
کے لفظ سے فرمائی گئی۔ کیونکہ صرف خوفِ خدا ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنے ذاتی خیالات اور
اپنی خواہشات سے باز رکھنے کا صحیح ذریعہ بن سکتی ہے۔ (از معارف القرآن)

(۲۹۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت
پر ایسا وقت ضرور آئیگا جیسا کہ بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ پر آچکا ہے۔ اتیان کے معنی المجئ
بسہولۃ کے ہیں۔ اور جب یہ متعدی بعلیٰ ہوتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں الغلبۃ المودّیۃ الی الھلاک
کے (ایسا غلبہ جو ہلاکت تک پہونچادے) جیسے باری تعالیٰ کے قول مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْہِ
میں یہی معنی ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ میری امت پر ایسا خطرناک اور ہلاکت خیز دور آنیوالا
ہے جیسا بنی اسرائیل پر آچکا ہے۔ یہاں امت سے مراد یا تو امتِ دعوت ہے جس میں کفار اور مسلمان
سب ہی داخل ہیں۔ یا امتِ اجابت یعنی اہل اسلام مراد ہیں۔ اور یہی ظاہر ہے۔ کیونکہ آپنے امت
کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ اور اس کو یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں ذکر فرمایا ہے۔ اسلئے کفار کا
داخلہ یہاں لفظِ امت میں خلافِ ظاہر ہے۔ کما اتیٰ۔ یا تو منصوب المحل ہے۔ اور معنی یہ ہیں لیاتینّ
علیٰ امتی زمان اتیانًا مثل اتیانہ علیٰ بنی اسرائیل۔ یعنی مفعول مطلق محذوف کی
صفت ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مرفوع المحل ہو اور معنی یہ ہوں لیاتین علیٰ امتی مثل
ما اتیٰ علیٰ بنی اسرائیل۔ حذو النعل بالنعل۔ اس سے مراد تساوی ہے۔ حذو کے معنی
قطع اور تقدیر کے آتے ہیں۔ حَذَوْتُ النَّعْلَ بِالنَّعْلِ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک جوتے کو دوسرے
سے ناپ کر اس کے برابر کاٹ دیا۔ اور یہ بھی منصوب علی المصدریۃ ہے۔ معنی یہ ہیں یحذونھم
حذو النعل بالنعل۔ یعنی میری امت کے لوگ بنی اسرائیل کے ایسے مماثل و مساوی ہوجائیں گے
جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کی برابر ہوتا ہے۔ اور اسی کی تاکید و توضیح کے لئے فرمایا حتی ان
کان منھم کہ اگر ان میں کوئی شخص ہوا ہے کہ جس نے اپنی ماں سے زنا کیا تھا تو میری امت میں بھی
ایسے لوگ ہوں گے جو یہ حرکت کریں گے۔ بظاہر اُم سے مراد اپنی حقیقی ماں ہے۔ اگرچہ بعض نے
اس سے زوجۃ الاب، موطوئۃ الاب، رضاعی ماں اور ساس وغیرہ کو بھی مراد لیا ہے۔ لیکن
ظاہر اوّل معنی ہی ہیں۔ قال علی القاری والاول اظھر لان الغرابۃ والاستبعاد فیہ اکثر۔
(اس جملہ میں حتی ابتدائیہ ہے اور اس کے بعد جملہ شرطیہ۔ اور اس کی جزا لکان الخ ہے۔ یا لکان
قسمِ محذوف کا جواب ہے۔ اور قسم و جوابِ قسم جزا۔ بعض لوگوں نے حتی ان کان کے ان کو
مخففہ من المثقلہ مانا ہے۔ اور ضمیر شان محذوف اس کا اسم۔ اور جملہ شرطیہ جزائیہ کو جزا قرار دیا ہے
وحذف ضمیر الشان فی ان المکسورۃ مختلف فیہ فمنعہ ابن الحاجب وجوزہ ابن المالک)

وانّ بنی اسرائیل تفرّقت الخ قاعدہ کے مطابق وَانّھُمْ بالضمیر ہونا مناسب تھا۔ مگر ضمیر کی بجائے بنی اسرائیل کی بُرائی اور ان کی بدترین حرکت کے ظاہر کرنے کے لئے اسم ظاہر کو لایا گیا۔ لیکن زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اسم ظاہر لاکر ان کے غیر کی طرف ضمیر لوٹنے کا احتمال ختم کردیا گیا۔

تفرّقت علیٰ ثنتین وسبعین ملۃً۔ بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ معاصی سے دل خراب ہوجاتا ہے۔ اور اللہ کی نافرمانی کا وبال اس دنیا میں انسان پر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مصالح دینی ودنیاوی سے غافل ہوجاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ نَسُوا اللہَ فَاَنْسٰہُمْ اَنْفُسَہُمْ (انہوں نے اللہ کو بھلادیا تو اللہ نے خود ان کو اپنے آپ کو بھلادیا) غرض یہ ہیکہ نافرمانیوں کے نتیجہ میں ان کے قلوب خراب ہوگئے۔ ہدایت وعبادت کی توفیق چھن گئی۔ نفس وشیطان کے جال میں پھنس گئے۔ نفس وشیطان نے ان کو خواہشات کا ایسا خوگر بنادیا کہ وہ دین الٰہی سے بیگانے اور آزاد ہوگئے۔ اپنے خیالاتِ فاسدہ کے پابند ہوگئے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی عقلیں اور خیالات جُدا جُدا ہیں۔ اسلئے فرقے پیدا ہوتے اور آپسی اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک ہی قوم بہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ جب امتِ محمدیہ میں گمراہی کے وہ جراثیم اور نافرمانیوں کے وہ حالات پیدا ہوجائیں گے جو بنی اسرائیل میں ہوتے تھے۔ تو یہ اُمت بھی فرقہ بندی کا شکار ہوجائے گی۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل تو بہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے یہ اُمت فرقہ بندی میں ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھکر تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے اپنے انبیاء اور مقتداؤں کو شہید کیا۔ تو ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اس امت میں بھی نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین وخلیفہ برحق حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد اختلاف شروع ہوا اور خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کو شہید کرنے کے بعد عبداللہ بن سبا کی پارٹی نے صحابہؓ کی جماعت کے ٹکڑے کرنے کی نامسعود کوشش کی۔ اور انہیں لوگوں نے حضرت علیؓ وحضرات حسنینؓ وغیرہ کو شہید کیا۔ حبِّ علی کا دم بھر کر خاندانِ علیؓ اور ملتِ مسلمہ کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اس فرقۂ شیعہ کے بعد خوارج پھر معتزلہ اور مرجیہ وغیرہ باطل فرقوں کا ظہور ہوا۔ سشدہ شدہ اُمت کے فرقے یہود ونصاریٰ کے فرقوں سے بڑھ گئے۔ اور نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق تہتّر فرقوں میں اُمتِ اجابت تقسیم ہوگئی۔ جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مُعتزِلہ۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ بندے خود اپنے اَفعال کے خالق ہیں۔ ثواب وعقاب اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہیں۔ اور وہ مرتکب کبیرہ کو اسلام سے خارج اور مخلد فی النار مانتے ہیں اور کلام اللہ کو حادث کہتے ہیں۔ نیز وہ آخرت میں دیدارِ خداوندی کے منکر ہیں۔ اُن کے بیس فرقے ہیں۔

(۲) خوارج۔ جو صحابہ کرامؓ کی خصوصاً حضرت علیؓ وحضرت امیر معاویہؓ کی تکفیر کرتے ہیں۔ اور مرتکب

کبیرہ کو کافر و مخلد فی النار قرار دیتے ہیں۔ ان میں بھی بیس فرقے ہیں۔

(۳) شیعہ۔ جو حبِّ علیؓ میں افراط سے کام لیتے ہیں۔ متعہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور تقیہ یعنی جھوٹ کو افضل ترین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے عقائدِ فاسدہ رکھتے ہیں۔ ان میں بائیس فرقے ہیں۔ اور ان بائیس فرقوں کی شاخیں بھی تہتّر تک پہونچ جاتی ہیں۔)

(۴) مرجیہ۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت مضر نہیں۔ جیساکہ کفر کے ساتھ کوئی طاعت مفید نہیں ہے۔ ان کے پانچ فرقے ہیں۔

(۵) نجاریہ۔ یہ فرقہ خلقِ افعال میں تو اہلِ سنت کا ہمنوا ہے۔ (یعنی یہ کہتا ہے کہ اعمال و افعال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے) لیکن یہ لوگ نفیِ صفاتِ باری اور حدوثِ کلامِ باری کے عقیدہ میں معتزلہ کے ساتھ ہیں۔ ان کے تین فرقے ہیں۔

(۶) جبریہ۔ یہ معتزلہ کے فرقہ قدریہ کا مقابل ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جمادات یعنی ڈھیلوں اور پتھروں کی طرح مجبورِ محض مانتے ہیں۔ یہ سلب الاختیار عن العباد کا قائل فرقہ جبریہ ایک ہے۔

(۷) مشبّہہ۔ یہ فرقہ حق تعالیٰ کو خلق کے مشابہ قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ایک ہی فرقہ ہے۔
یہ بہتّر فرقے ناری ہیں۔ کیونکہ عقائد حقہ سے عاری ہیں۔

(۸) تہتّرواں فرقہ اہل السنّۃ والجماعۃ ہے۔ جو مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِی کا مصداقِ صادق ہے اور ان کے عقائد و اعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد سنیہ و اعمال حسنہ کے موافق ہیں۔ کثّر اللہ سوادھم۔ آمین۔ (مرقاۃ المفاتیح ص ۲۴۸/۱)

فوائد (۱) ان تہتر فرقوں کی تعیین (ان فرقوں کا نام لیکر) کسی حدیث میں وارد نہیں ہوئی۔ ہاں احادیث میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن کی مدد سے ان کی تعیین کی جا سکتی ہے پھر نام لے کر مدح و ذم کرنا ہماری شریعتِ محمدیہ کا دستور بھی نہیں۔ بلکہ پردہ پوشی ہماری شریعت کا خاص شعار و مزاج ہے۔ اگر کسی کی مذمت کہیں وارد ہوئی ہے۔ یا علمائے محدثین نے جرح و تعدیل کی راہ اپنائی ہے تو وہ ضرورت سے اپنائی۔ اور بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کیا ہے۔

(۲) فرقہ باطلہ کو علامات سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کی تین بڑی علامات آیات و احادیث سے معلوم ہوتیں۔ (۱) بغض و نفاق اور عداوت (۲) اتباعِ متشابہات (۳) اتباعِ ہوٰی۔ پہلی علامت کی شناخت ہر شخص کر سکتا ہے۔ دوسری علامت کی شناخت صرف ان علمائے راسخین کا حصہ ہے جو محکمات و متشابہات کے فرق و تفصیلات سے آگاہ ہیں۔ تیسری علامت خود انسان کے اپنے فیصلہ کی بات ہے۔ وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ کہ اسکے باطن میں اتباعِ ہدٰی کا جذبہ ہے یا اتباعِ ہوٰی کا۔

اب اگر آپ کو باطل فرقوں کی شناخت کرنی ہے تو ان علامات سے کر لیجئے۔ مگر ان علامات کے بعد بھی بحث ختم نہیں ہوجاتی۔ اس بحث کو ختم کرنے کا راستہ وہی ہے جو حضرات صحابہؓ نے اختیار فرمایا۔ وہ یہ کہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا جائے کہ فرقۂ ناجیہ کونسا ہے۔ یہ سوال مختصر بھی ہے اور مفیدِ مطلب بھی۔ اور صراطِ مستقیم صاحبِ وحی کے ذریعہ ہی قطعی طور پر معلوم ہوسکتی ہے جس پر چلنے کے ہم مکلف ہیں۔ آپؐ نے حضراتِ صحابہؓ کے سوال پر جواباً ارشاد فرمایا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ۔ بظاہر یہ جواب سوال کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ سوال فرقۂ ناجیہ کے متعلق تھا تو اس کا صاف جواب اَنَا وَاَصْحَابِیْ تھا۔ یعنی وہ جماعت میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں۔ بلاشبہ اس وقت فرقۂ ناجیہ کی یہی جماعت مصداق تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپکے صحابہؓ کا طریق بعینہٖ آپ ہی کا طریق تھا۔ اس کے مستقل طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جواب میں آپ کا اَنَا فرمادینا بھی کافی تھا۔ ان دونوں شبہات کا حل یہ ہے کہ سوال کا منشاء اس زمانہ کی جماعتِ حقہ کی تعیین نہ تھی۔ بلکہ زمانۂ افتراق و دورِ فتن میں جماعتِ حقہ کی تعیین مطلوب تھی۔ اسلئے اگر آپ اَنَا وَاَصْحَابِیْ فرماتے تو دورِ افتراق میں جماعتِ حقہ کی تعیینِ مطلوب حاصل نہوتی۔ اور اگر کتاب وسنت کو معیار گردانتے تو بھی جواب مناسب نہوتا۔ کیونکہ ہر باطل سے باطل فرقہ اس امر کا مدعی ہے کہ وہی کتاب وسنت کا حامل وعامل ہے۔ اسلئے آپنے یہاں وہ فیصلہ کن آئین ارشاد فرمایا جو دورِ فتن کے مناسبِ حال ہو۔ کہ وہ صرف کتاب وسنت نہیں بلکہ ان کی وہ عملی تصویر ہے جو آپنے اپنے صحابہؓ کے سامنے پیش فرمائی تھی۔ اور وہ کتاب و سنت کی زندہ تفسیر تھی۔ جس میں حضراتِ صحابۂ کرامؓ کی زندگی مکمل طور پر ڈھل چکی تھی۔ یعنی حضور علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا صحابۂ کرامؓ کی زندگی مکمل نقشہ تھا۔ پوچھنے والوں کے لئے اس سے زائد مکمل اور صاف بات کیا ہوسکتی تھی۔ کہ پوچھنے والوں کو صراطِ مستقیم آنکھوں سے دکھادی جاتے۔ اور زبان سے سمجھادی جائے۔ کہ وہ صراطِ مستقیم یہ ہے۔ یہاں افراد واشخاص کی بحث کو چھوڑ کر ان اوصاف کو ظاہر فرمادیا گیا جو فرقۂ ناجیہ کی تعیین میں ہمیشہ کے لئے کارآمد اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہوں۔

اب رہی یہ بات کہ صحابۂ کرامؓ کی سنت کو یہاں مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے۔ تو بظاہر ان پر اس کامل اعتماد کا اظہار ہے جو آپ کو اپنے صحابہ کے فہم وعقل اور علم وعمل کی بنا پر حاصل تھا۔ اور یہ اس بات کا اعلان بھی ہے کہ ایمان وعمل اور دین ومذہب میں جس طرح میرا اسوہ معیار ہے میرے صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کا نقشہ بھی ہوبہو وہی اور بلاشبہ معیارِ حق ہے۔ اسی لئے قرآن مقدس کی آیات اور احادیث صحیحہ میں حضرات صحابہؓ کے ایمان وعمل کو تمام عالم کے لئے

معیار قرار دیا گیا ہے۔ جن کو تفصیل سے پیش کرنے کا یہ مقام نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ فرقۂ ناجیہ وہی ہے جو مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِی (یعنی کتاب وسنت کا متبع) ہے۔ بس اہلِ حق ہونے کی علامت یہی ہے کہ وہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو۔ اور نہ صرف یہی بلکہ وہ آپ کے صحابہؓ کے طریق کا احترام کرنے والی بھی ہو۔ اگر کوئی جماعت آپ کے طریق کا احترام تو کرتی ہے۔ لیکن صحابہؓ کے طریق کا احترام نہیں کرتی تو وہ فرقۂ ناجیہ کی حدود سے باہر ہے۔ دورِ حاضر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے درمیان تفریق کا عقیدہ بھی ظاہر ہو چکا ہے۔ اور یہ تفریق درحقیقت انتہائی نادانی وکجروی ہے۔ حبیب اللہ کا رسول اپنی حیات میں انپر مکمل اعتماد کرچکا تو اب انپر بے اعتمادی اللہ کے رسول پر بے اعتمادی کے مُرادف اور کھُلا ہوا کفر ہے۔ پھر صحابۂ کرامؓ امت اور اس کے رسول کے درمیان ایک واسطہ ہیں۔ اگر اس واسطے کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو دین کا اعتبار ہی ختم ہو جاتا ہے۔

کُلُّھُمْ فِی النَّارِ کا مطلب

یہاں اشکال یہ پیش آتا ہے کہ اس امت کی اکثریت اگر دوزخی ہے تو یہ امت "خیر امت" اور امتِ مرحومہ کیسے ہو سکتی ہے۔؟

(۱) اس کا حل یہ ہے کہ یہ فیصلہ قبل از وقت ہے۔ درمیانی مراحل سے گذر کر جنت میں داخل ہونے کے اعتبار سے یہ امت "امت مرحومہ" ہی ہے۔ یہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگی چنانچہ ترمذی کی روایت میں ہے کہ اہلِ جنت کی کل صفیں ایک سو بیس ہوں گی۔ جن میں اسّی اسی امت کی اور بقیہ چالیس سب امتوں کی ہوں گی۔

(۲) خیریت ومرحومیت کے اصل ظہور کا وقت دورِ عروج تھا۔ دورِ زوال وانحطاط اور افتراق وکجروی کے زمانہ میں ان اوصافِ کمالیہ کی تلاش ایسی ہی ہے جیسے حسن وقوتِ شباب کی جستجو بڑھاپے کے وقت۔

(۳) بعض علماء نے کہا کہ کلام اللہ اور کلام الرسول میں محاوراتِ انسانی کی بہت رعایت کیگئی ہے۔ اس حدیث میں کلھم فی النار بھی دراصل ایک محاورہ ہے۔ جو کسی چیز کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے اُردو میں کہتے ہیں، میاں ڈالو چولھے میں "یہاں دوزخی ہونا مراد ہی نہیں۔ مگر یہ جواب تردّد سے خالی نہیں۔ کیونکہ اسی حدیث کے الفاظ دوسرے طریق میں واحدۃ فی الجنۃ" ہیں۔ اس میں لفظ نار اور جنت کا مقابلہ ہے۔ اسلئے بہتّر فرقے یقیناً ناری ہیں۔ اسلئے یہاں اس محاورہ کی گنجائش نہیں۔

(۴) اصل جواب یہ ہے کہ ان تہتر فرقوں میں سے ایک فرقہ جسکے عقائد واعمال ما انا علیہ واصحابی کے موافق ہیں۔ بلا کسی ادنیٰ عذاب کے جنت میں جائے گا۔ باقی بہتّر فرقے معذب فی النار ہوں گے

البتہ جو فرقے کفر و شرک تک نہیں پہونچے وہ سزا بھگت کر دوزخ سے نجات پاکر داخلِ جنت ہو جائیں گے۔ اِلّا یہ کہ حق تعالیٰ مراحمِ خسروانہ سے کسی کو معاف فرمادیں تو وہ اور بات ہے۔ واللہ اعلم

تنبیہ اس حدیث کی مزید تشریحات وتفصیلات ترجمان السنہ کی جلد اول میں مذکور ہیں جس کو شوق ہو وہاں مطالعہ کرے۔ اس مختصر میں طویل مباحث کی گنجائش نہیں۔

وَمِنْ اَكْبَرِهَا عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ

اور سب سے بڑے گناہوں میں سے ماں باپ کی نافرمانی ہے۔

(۳۹۶) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى - وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور آپکے ربّ نے اس کا تاکیدی حکم دیا ہے کہ تم اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کروگے۔ اور

اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کروگے۔ اگر تیرے پاس دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہونچ جائیں تو ان کو

تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ

اُف بھی نہ کہنا۔ اور ان کو نہ جھڑکنا اور ان سے نرم (وعمدہ) بات کہا کرنا۔ اور ان کے لئے محبت

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ

سے تواضع کے بازو کو جھکا دینا۔ اور یہ دعا کرنا اے میرے پروردگار ان پر اسی طرح رحم

صَغِيْرًا۔ (بنی اسرائیل آیت ۲۳)

فرمایئے جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھ کو (پیار سے) پالا پوسا ہے۔

قَالَ الْعَبْدُ الضَّعِيْفُ جَعَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْاِحْسَانَ بِالْوَالِدَيْنِ قَرِيْنًا

بندۂ ناتواں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی عبادت کا قرین (ساتھی)

لِّعِبَادَتِهٖ فَلَا مُحَالَةَ عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ يُقَارِنُ الْكُفْرَ وَالشِّرْكَ

بنایا ہے۔ تو لامحالہ والدین کی نافرمانی کفر و شرک کے قریب کردے گی۔

نَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَالشَّاهِدُ لِهٰذَا الْمَعْنٰى

ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ اور دلیل اس معنیٰ کی وہ ہے

(۳۹۷) مَا رَوٰى اَبُوْ بَكْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

جو ابو بکرہؓ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تم کو

اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ قُلْنَا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ

بڑے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ نہ بتادوں ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور بتادیجئے۔ فرمایا

اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ۔ (بخاری ص۸۸۴)

وہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا ہے۔

(۳۹۷)

تشریح والدین کے حقوق عنوان "برّ الوالدین" کے تحت جلد اوّل میں تفصیل سے گذر چکے ہیں۔ اسی کے ضمن میں والدین کی نافرمانی کے وبال کا بھی ذکر آچکا ہے۔

ان آیتوں میں اوّل توحید و عبادتِ خداوندی کا حکم ہے۔ دوسرا حکم والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ کرنیکا ہے چونکہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی چیز ایمان و توحید ہے۔ اسی لئے پہلا حکم اسی کا ہے۔ جس میں حقوق اللہ سب آجاتے ہیں۔ بندوں کے حقوق میں سب سے اہم والدین کے حقوق ہیں۔ اسلئے نمبر۲ پر ان کو بیان فرمایا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ربِّ حقیقی ہیں اور والدین ربِّ مجازی، اسلئے ربِّ حقیقی کے بعد ربِّ مجازی و ظاہری مربّی کے حقوق قرینِ قیاس ہیں۔ چنانچہ کلامِ الٰہی میں جابجا یہی ترتیب ملے گی۔ کہ اوّل عبادتِ خداوندی کا حکم ہے دوسرے نمبر پر والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے ماں باپ کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی عبادت کے ساتھ ملاکر واجب کیا ہے۔ جیساکہ سورۂ لقمان میں بھی اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ میں والدین کے شکر کو اپنے شکر کے ساتھ ملاکر واجب کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی اطاعت اللہ کی عبادت کے بعد سب سے زیادہ اہم ہے۔ احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ جیساکہ "برّ الوالدین" کے تحت جزءِ اول میں گذر چکا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق والدین سے مقدم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں داخل ہیں۔

ان آیات میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلہ میں چند ہدایات دی گئی ہیں۔

(۱) ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس میں یہ قید نہیں کہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔

(۲) خصوصاً بڑھاپے میں جبکہ ان کو خدمت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی خدمت کرو۔

(۳) بڑھاپے میں عموماً عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ زبان بھی بے قابو ہوجاتی ہے۔ اور تمام قویٰ کمزور ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے ان سے تکلیف دہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ اسلئے خصوصی ہدایت کیگئی کہ بڑھاپے کے وقت میں خصوصاً ان کی خدمت ایسی خندہ پیشانی اور نہایت حلم و بُردباری سے کرنا کہ زبان پر اُف بھی نہ لانا (یہ لفظ (اُف) اکتاہٹ اور اذیت محسوس کرنے کے وقت زبان سے نکلتا ہے۔) اور نہ کسی نازیبا حرکت پر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ہر حال میں ان کا مکمل ادب ملحوظ رکھنا۔

(۴) اپنے آپ کو پورے طور پر ان کی خدمت کے لئے بچھا دینا اور ان کے ساتھ عاجزی و تواضع سے برتاؤ کرنا۔ (۵) ان کے ساتھ مہربانی، نرم دلی اور رحمدلی سے پیش آنا کیونکہ انہوں نے تم کو تیرے بچپن میں محبت، شفقت اور پیار سے پالا تھا۔ (۶) ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء مانگتے رہنا رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ (اے میرے رب ان دونوں پر ایسا رحم فرما جیسا انہوں نے میرے بچپن میں مجھ کو پالا پوسا تھا) ماں باپ بھی بچہ کو بڑی تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ پالتے اور اس کی بیکسی ولاچاری پر مہربانی کرتے ہیں۔

(ف) آیت مذکورہ میں ماں باپ کے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہوئے عِنْدَكَ کا لفظ فرمایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تیری کفالت و نگہداشت میں ہوں۔ اور اگر والدین کی کفالت و نگہداشت کی ذمہ داری اولاد میں سے کسی ایک نے لے لی ہو۔ یا اولاد میں سے کوئی والدین سے دور رہتا ہو۔ تو یہ رعایتیں اور ہدایات اس کے لئے نہ ہوں گی بلکہ اس کے حال اور وسعت کے مطابق حسن سلوک ہی واجب ہوگا۔ یہ سب ہدایات اس کے لئے ہیں جس کے پاس والدین ہیں، یا جسکی کفالت میں ہیں۔

(ق) وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ای وَأَنْ تُحْسِنُوا بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ إِمَّا۔ اِنْ شرطیہ اور مَا زائدہ ہے۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اپنی عبادت کے حکم کیساتھ بیان کیا ہے، تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح توحید و عبادتِ خداوندی نہ کرنا کفر و شرک ہے۔ اسی طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ترک کرنا بھی اسی کے قریب ہے۔ اور یہ بات صرف قیاسی نہیں بلکہ:

(۳۹۷) حضرت ابوبکرہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ میں تم کو کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ نہ بتا دوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا ضرور بتا دیجئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ کبائر میں سب سے بڑا گناہ شرک اور والدین کی نافرمانی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو والدین کی خدمت نہ کریگا وہ اللہ کی عبادت ہی کیا کریگا۔ مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ۔ والدین کے حقوق کی تفصیلات "خلاصۂ تورات" میں ملاحظہ فرمائیں۔

وَمِنْهَا قَطِيعَةُ الرَّحِمِ وَالْبَغْيُ

اور نافرمانیوں میں سے قطع رحمی اور ظلم بھی ہیں۔

(۳۹۸) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور جو لوگ اللہ کا عہد اس کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ

اور ان تعلقات کو قطع کردیتے ہیں جن کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے لوگوں پر لعنت

لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ (الرّعد آیت ۳۹۸)

ہے۔ اور ان کے لئے آخرت کی بربادی ہے۔

(۳۹۹) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ (بخاری ۸۸۵ ج۲ مشکوٰۃ ۴۱۹)

رشتہ ناطہ توڑنے والا جنت میں نہ جائے گا۔

تشریح ۳۹۸ عہد اللہ سے اولاً وہ عہد مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا تھا۔ کفار و مشرکین نے دنیا میں آکر اس عہد کو توڑ ڈالا۔ اور ثانیاً اس میں وہ تمام عہد داخل ہیں جن کی پابندی کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ضمن میں انسان پر لازم ہوتی ہے۔ کیونکہ کلمہ طیبہ دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے۔ جس کے تحت اللہ اور اس کے بتائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور تمام ممنوعات و محرمات سے پرہیز کا عہد آجاتا ہے۔ اسلئے جب کوئی انسان خدا اور رسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ عہد ایمانی کو توڑتا ہے۔ یہ نافرمان بندوں کی ایک صفت ہوئی۔

نافرمان بندوں کی دوسری صفت وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ الخ میں بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگ ان تعلقات کو قطع کردیتے ہیں جن کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا ہے۔ اس میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق بھی داخل ہے۔ اور رشتہ داروں کے وہ تعلقات بھی جنکو قائم رکھنے اور ان کے حقوق کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کے نافرمان بندے اعزّہ کے حقوق و تعلقات کو بھی توڑ ڈالتے ہیں۔ اور وہ ماں باپ بہن، بھائی، پڑوسی اور دوسرے متعلقین کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے۔

نافرمانوں کی تیسری خصلت وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ میں بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگ زمین میں فساد بپا کرتے ہیں۔ یہ تیسری خصلت (فساد فی الارض) درحقیقت پہلی دونوں خصلتوں کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ حقوق اللہ و حقوق العباد اور ان کے تعلقات کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کے اعمال و افعال سے بندگانِ خدا کو مضرتیں اور ایذائیں پہونچتی ہیں۔ اور یہی تمام جھگڑوں کی بنیاد ہے۔

اس آیت میں نافرمانوں کی تین خصلتیں بتانے کے بعد ان کا انجام اور ان کی سزا کو بیان کیا گیا اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ یعنی ان کے لئے لعنت اور برا ٹھکانہ ہے۔

لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے محروم اور دُور ہونے کے ہیں۔ جو سب سے بڑا عذاب اور سب سے بڑی مصیبت ہے۔
اس آیت سے چند مسائل ثابت ہوئے۔ (۱) معاہدہ کی پابندی فرض اور خلاف ورزی حرام ہے۔
خواہ وہ معاہدہ اللہ اور اس کے رسول سے ہوا ہو، یا مخلوقات میں سے کسی سے ہو۔ خواہ مسلمان سے ہو یا کافر سے (بشرطیکہ خلافِ شرع نہ ہو) عہد شکنی بہرحال حرام ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیم راہبانہ انداز کی نہیں۔ جس میں ترکِ تعلقات ضروری ہے بلکہ اسلام نے ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اعزہ و اقارب اور پڑوسیوں کے حقوق کو نظر انداز کر کے نفلی عبادات یا دینی خدمات میں لگ جانا بھی جائز نہیں تو دوسرے دنیوی کاموں میں لگ کر ان کو بھلا دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔
صلہ رحمی اور رشتہ داری کے تعلق کی رعایت و خبر گیری اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں بہت سی آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ وارد ہوئی ہیں۔ صلہ رحمی اور ایفائے عہد کے سلسلہ میں کافی تشریح جزءِ اول میں آ چکی ہے۔

(۳۹۹) حضرت جبیر بن مطعمؓ کی بعینہٖ یہی روایت معہ تشریح مرآۃ الانوار کے جزءِ اول میں نمبر (۶۸) پر گذر چکی ہے۔

شَهَادَةُ الزُّوْرِ

جھوٹی شہادت

(۴۰۰) عَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ
اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ قُلْنَا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ
کیا میں تم کو بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ نہ بتا دوں، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور بتا دیجئے آپ نے فرمایا
اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَجَلَسَ وَقَالَ
وہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا ہے۔ اور ماں باپ کی نافرمانی ہے۔ اور آپ تکیہ لگائے ہوئے تھے تو آپ بیٹھ گئے اور
اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ مَرَّتَيْنِ فَمَا زَالَ يَقُوْلُهَا
فرمایا یاد رکھو اور جھوٹی بات ہے اور جھوٹی گواہی ہے (راوی نے یہ دو بار کہا) پھر آپ اس کو فرماتے ہی رہے۔
حَتّٰى قُلْتُ لَا يَسْكُتُ۔ (بخاری ص ۸۸۴)
یہاں تک کہ میں نے (دل میں) کہا کہ آپ خاموش نہ ہوں گے۔

تشریح اس روایت کے دو جزء اشراک باللہ اور عقوقِ والدین تو نمبر (۳۹۷) میں گذر چکے ہیں۔ یہاں تیسرا جزء (قولِ زور) بھی مذکور ہے۔ کہ یہ بھی اکبر الکبائر میں شمار ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ آپ تکیہ سے اٹھ کر سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ اور جوش میں بار بار فرمایا الا وقول الزور و شہادۃ الزور راوی نے ان کلمات کو دو مرتبہ ذکر کیا (مرتین کا مطلب یہی ہے) اور کہا کہ آپ ان کلمات کو بار بار ارشاد فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے دل میں سوچا کہ اب تو آپ یہ کلمات فرماتے ہی رہیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں نے کہا کہ آپ خاموش نہیں ہوتے۔ آپ بار بار فرمانے کی زحمت گوارا فرما رہے ہیں یعنی کاش آپ خاموش ہوجائیں اور آپ اتنی زحمت نہ فرمائیں۔ یہ مطلب ہی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ فَمَا زَالَ یُکَرِّرُھَا حَتّٰی قُلْنَا لَیْتَهٗ سَکَتَ۔ (بخاری شریف ص۳۶۲/۱)

دراصل جھوٹ یعنی خلافِ واقعہ اور باطل بات ہے ہی بڑا بھاری جرم، جس کا اہم فرد شہادتِ زور ہے۔ کہ اس سے بندوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے بعد کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا کہ:

عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَرَءَ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۸)

جھوٹی شہادت اشراک باللہ کے برابر قرار دیدی گئی۔ یہ تین بار فرما کر یہ آیت پڑھی۔ تم گندگی یعنی بتوں سے بچتے رہو۔ اور قولِ زور سے بچتے رہو۔ اللہ کو ایک ماننے والے بنجاؤ۔ مشرک نہ بنو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن تمام عادتوں میں ڈھل سکتا ہے۔ ہاں اس میں دو عادتیں خیانت اور جھوٹ نہیں ہوسکتیں۔ آپ سے پوچھا گیا: مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ پوچھا گیا: مؤمن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں ہوسکتا ہے۔ پوچھا گیا؟ کیا مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا نہیں (مشکوٰۃ ص۴۱۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ عمل کیا ہے جس سے آدمی دوزخ میں جاتے۔ فرمایا وہ عمل جھوٹ ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی مؤمن کامل اسوقت تک نہیں ہوسکتا جبتک جھوٹ کو بالکل نہ چھوڑ دے۔ ایک حدیث میں ہے جھوٹ انسان کے رزق کو گھٹا دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن وحدیث میں جھوٹ بولنے پر سخت وعیدیں اور مذمتیں وارد ہوئی ہیں۔ قرآنِ پاک میں جا بجا کاذب پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں۔

(معارف ص۳۰۴/۳۲)

قَتْلُ الْاَوْلَادِ وَوَأْدُ الْبَنَاتِ

اولاد کا قتل کرنا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

(۴۰۱) قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْأً کَبِیْرًا۝ (بنی اسرائیل آیت ۳۱)

اللہ تعالٰی نے فرمایا۔ اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو۔ ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔ بیشک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

(۴۰۲) عَنِ الْمُغِیْرَۃِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَمَنْعًا وَّھَاتِ وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ۔ (بخاری ص۸۸۴، مشکوٰۃ ص۴۱۹)

حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہ بیشک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ تعالٰی نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو اور لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کو اور بخل و سوال کو حرام کردیا ہے۔ اور تمہارے لئے بیہودہ گفتگو کرنے اور زیادہ سوال کرنے اور مال کو برباد کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔

تشریح (ز۔م) زمانۂ جاہلیت میں بہت سے لوگ وقتِ ولادت اپنی اولاد کو خصوصًا لڑکیوں کو اس خوف سے قتل کرڈالتے تھے کہ ان کے مصارف کا بار ہم پر پڑیگا۔ اس آیت شریفہ میں حق تعالٰی نے ان کی جہالت و حماقت کی تردید و مذمت فرمائی ہے کہ روزی دینے والے تم نہیں ہو۔ ان کو بھی اور تم کو بھی روزی ہم دیتے ہیں۔ بلکہ اس آیت میں اولاد کو رزق دینے کا ذکر پہلے کرکے اس طرف اشارہ فرما دیا گیا کہ حق تعالٰی جس بندہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اہل و عیال، کمزوروں، غریبوں اور محتاجوں کی کفالت کر رہا ہے۔ تو اس کو وہ اسی حساب سے عطاء فرماتے ہیں۔ کہ سب کو کافی ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ (یعنی تمہارے کمزور طبقہ کی وجہ سے اللہ تعالٰی تمہاری مدد فرماتے اور تم کو رزق عطاء فرماتے ہیں)

مسئلہ قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملہ پر بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آج کی دنیا گرفتار ہے۔ کہ کثرتِ آبادی کے خوف سے ضبط تولید و منصوبہ بندی کو رواج دے رہی ہے۔ اس کی بنیاد بھی جاہلانہ فلسفہ اور کفر و بے ایمانی پر ہے۔ کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ ضبطِ تولید قتلِ اولاد کی برابر نہ سہی مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

(خلاصۂ تورات)

قتلِ اولاد سنگین جرم ہے

جس طرح اولاد کا والدین کے ساتھ بدسلوکی و نافرمانی کرنا سنگین جرم ہے۔ اسی طرح اولاد کو قتل کرنا بھی سخت ترین قطع رحمی و سنگدلی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بے رحمی کی یہ بدترین رسم تھی کہ وہ سنگدل اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کو اسلئے قتل کردیتے تھے کہ ان کو ضروریاتِ زندگی مہیّا کرنے کی مشکلات پیش آئیں گی۔ خاص طور پر لڑکیوں کو وہ اسلئے بھی زندہ درگور کرتے تھے کہ وہ کسی کو اپنا داماد بنانا اپنے لئے عار سمجھتے تھے۔ اور وہ احمق یہ نہ سوچتے تھے کہ ہم بھی تو کسی کی اولاد اور کسی کے داماد ہیں۔ قرآنِ مقدس نے بڑی شدّت سے اس رسمِ بد کو مٹا کر ان کے اس بدترین ذہنی مرض کا علاج کیا۔ اور بتایا کہ کھلانے پلانے اور روزی پہونچانے کے اصل ذمہ دار حق تعالیٰ ہیں تم نہیں ہو۔ تم خود بھی اپنے رزق میں اسی کے محتاج ہو۔ چنانچہ:۔

(۱۰۴) اس آیتِ گرامی میں ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشہ سے قتل نہ کرو۔ ان کو رزق ہم دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ یاد رکھو ان کا قتل کرنا بڑا سنگین جرم ہے۔

اولاد کو نافرمان بنانا بھی اس کا قتل ہے

قتلِ اولاد کا جرم و گناہ ہونا جو اس آیت میں مذکور ہے ظاہر ہے۔ اور ذرا غور کیا جائے تو اولاد کو تعلیم و تربیت نہ دینا جس کے نتیجہ میں وہ حق و باطل میں تمیز کرنے سے محروم اور اپنے مالک و معبود کی معرفت سے بے بہرہ رہ جائے اور آخرت سے غافل رہ کر بداخلاقیوں، بے حیائیوں اور بداعمالیوں میں گرفتار ہوکر جہنم رسید ہوجائے تو یہ بھی قتلِ اولاد کے جرم سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر جرمِ عظیم ہے۔ کیونکہ جسمانی موت سے روحانی موت زیادہ سخت حادثہ ہے۔ قرآنِ پاک نے اس شخص کو مردہ قرار دیا ہے جس کو ایمان و معرفت حاصل نہو۔ چنانچہ فرمایا ہے اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ۔ (پ۸ ع ۲) جو لوگ اپنی اولاد کے اعمال و اخلاق درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے، ان کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں، یا ایسی غلط تعلیم دلاتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اسلامی اخلاق و اقدار سے بیگانے اور دینِ برحق سے غافل و بے خبر ہوکر دنیا کے دیوانے بنجاتے ہیں وہ لوگ ان کو ظاہری و جسمانی قتل کے ذریعہ دنیوی چند روزہ زندگی ہی سے محروم نہیں کرتے بلکہ ان کی اُخروی دائمی اور روحانی زندگی کو تباہ و برباد کرکے ان کو ہمیشہ کی موت ماردیتے ہیں۔

چار ماہ کے بعد اسقاطِ حمل بھی قتل کے حکم میں ہے۔

مسئلہ:۔ یہ تو معلوم ہوچکا کہ بچوں کو زندہ دفن کردینا یا قتل کردینا سخت جہالت، گناہ کبیرہ اور جرمِ عظیم ہے۔ واضح رہے کہ چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرادینا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ کیونکہ چوتھے مہینے حمل میں روح پڑجاتی ہے۔ اور وہ حمل زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے۔

اسی طرح جو شخص کسی ایسی حاملہ کے پیٹ پر مار دے اور اس سے بچہ گر جائے تو باجماع امت مارنے والے پر اس کی دیت میں غرّہ یعنی ایک غلام یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے۔ اور اگر پیٹ سے باہر آنے کے وقت وہ زندہ تھا پھر مرگیا تو پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے۔

مسئلہ (۲):- چار ماہ سے پہلے بھی اسقاطِ حمل اضطراری حالات کے بغیر حرام ہے۔ مگر پہلی صورت کی بہ نسبت اس میں گناہ کم ہے۔ کیونکہ اس میں زندہ انسان کا قتل صریح نہیں ہے۔

مسئلہ (۳):- کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے۔ جیسے آجکل دنیا میں ضبطِ تولید کے نام سے اس کی سیکڑوں صورتیں رائج ہوگئی ہیں۔ اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وأدِ خفی فرمایا ہے۔ یعنی یہ خفیہ طور پر بچہ کو زندہ درگور کرنا ہے۔ اور بعض دوسری روایات میں عزل یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سکوت یا عدم مخالفت منقول ہے۔ وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لئے قطعِ نسل کی صورت نہ بنے آجکل ضبطِ تولید کے نام سے جو دوائیں یا معالجات کئے جاتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ہمیشہ کیلئے سلسلۂ نسل ختم ہوجاتا ہے اس کی شرعاً کسی حال میں اجازت نہیں۔ واللہ اعلم

(معارف القرآن ص ۲۸۳/۸)

(۴۲) عقوق عَقّ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی قطع و شق کے ہیں۔ اور مراد اس سے ایسا قول یا فعل ہے جو عرفاً والدین کے ساتھ نازیبا ہے۔ اور والدین اس سے اذیت محسوس کرتے ہیں۔ امہات کو حدیث میں اسلئے خاص کیا گیا ہے کہ ان کے حقوق زائد اور ان کا معاملہ زیادہ اہم ہے۔ اور وہ کمزور بھی ہوتی ہیں اسلئے اولاد زیادہ نافرمانی والدہ ہی کی کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اکتفاء بذکر احد الشیئین من الآخر کے قبیل سے ہو یعنی ایک شئی کا حکم ذکر کردیا جاتا ہے تاکہ دوسری شئی کا حکم اس سے خود بخود سمجھ میں آجائے۔ یہاں عقوقِ امہات کو ذکر کردیا گیا۔ عقوق الآباء اس سے خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ کقولہ تعالیٰ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ ای والبرد- وقال الخطابی لم یخص الامہات بالعقوق فان عقوق الآباء محرم ایضا ولکن نبہ باحدھما عن الآخر فان بر الام مقدم علی بر الاب الا ان لعقوق الامہات مزیۃ فی القبح وحق الاب مقدم فی الطاعۃ وحسن المتابعۃ لرأیہ والنفوذ لامرہ وقبول الادب منہ- (مرقاۃ)

ووأد البنات- وأد بسکون الھمزۃ ہے۔ اور اس کو الف سے بھی بدل دیتے ہیں جس کے معنی زندہ درگور کرنے کے ہیں۔ امہات چونکہ اصل ہیں اسلئے ان کے حقوق کو مقدم کیا۔ اور بنات فروع ہیں۔ اسلئے ان کے حقوق کو مؤخر کیا گیا۔

عرب میں چونکہ لڑکیوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا اسلئے بنات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ وأد البنین

کا بھی یہی حکم ہے۔ قطعِ نسل کیونکہ عالم کی ویرانی کا سبب ہے۔ اسلئے قتلِ اولاد کو احادیث میں اکبر الکبائر میں شمار کیا گیا۔

ومنع بسکون النون وبفتح النون اول صورت میں مصدر، دوسری صورت میں مصدر یا صیغہ ماضی ہے۔ یہاں مذکور روایت میں ومنعًا بالتنوین ہے۔ ھَاتِ بکسر التاء اسم فعل بمعنی أَعْطِ ہے۔ ان دونوں لفظوں (منع وھات) سے بخل وسُوال کو تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی آپ نے کنجوسی سے اور دوسروں سے سُوال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ نہایہ میں ہے حَرَّمَ عَلَيْكُمْ مَنْعَ مَا عَلَيْكُمْ وَطَلَبَ مَا لَيْسَ لَكُمْ أَخْذُهُ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر اس چیز سے منع کرنے کو حرام کردیا ہے جس کا دینا تمہارے ذِمّہ ضروری ہے۔ اور اس چیز کے طلب کرنے کو جس کا لینا تمہارے لئے جائز نہیں) بعض حضرات نے اس کو اس طرح تعبیر کیا ہے کہ جو حقوق اموال واقوال وافعال اور اخلاق کے اعتبار سے انسان پر واجب ولازم ہوتے ہیں انکے منع کرنے سے اور جو حقوق اس کے دوسروں پر واجب نہیں اُن کو اُن سے مانگنے سے ممانعت مقصود ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر چار چیزوں کو حرام فرمادیا ہے۔ (۱) والدین خصوصًا ماؤں سے بدسلوکی کو (۲) قتلِ اولاد خصوصًا لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کو۔ (۳) کنجوسی کرنے یعنی حقوقِ واجبہ نہ ادا کرنے کو (۴) دوسروں سے ناحق سوال کرنے کو۔ آگے فرمایا وَكَرِهَ لَكُمْ الخ یعنی تین چیزوں کو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا ہے۔ کَرِہَ بروزن سَمِعَ ہے۔ جس کے معنی ناپسند کیا، ہوں گے۔ بعض نسخوں میں کَرَّہَ باب تفعیل سے صیغہ ماضی ہے جس کے معنی ہوں گے "مکروہ قرار دیا، ناپسندیدہ کردیا"

(۱) قیل وقال جس میں لایعنی گفتگو، کثرتِ کلام، بدگوئی، غیبت، چغل خوری، بیجا بحث ومُباحثہ وغیرہ سب داخل ہیں۔ (۲) کثرتِ سُوال۔ اس میں لوگوں کے متعلق فضول معلومات۔ لوگوں سے اُن کے مالوں کا ناحق سُوال، علمی سُوالات کی کثرت، لوگوں کا امتحان کرنے یا اپنی قابلیت جتانے کے لئے بلاضرورت علماء سے علمی سُوالات کرنا، یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر ضروری سوالات کرنا مراد ہے۔ جن کے بارے میں آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ نازل ہوئی۔

(۳) مال کو ضائع کرنا جس میں اِسراف وتبذیر، غیر اطاعت خداوندی میں خرچ کرنا وغیرہ سب داخل ہیں۔

(ف) قیل وقال ماضی کے صیغے ہیں جو دو اسموں کی طرح مستعمل ہیں۔ اسی لئے ان کو الف لام کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً یعرف القال من القیل۔ اور ان میں ضمیر کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کو مصدر مان لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ اسم مصدر بمعنی قول ہیں۔

اَلْمُوْبِقَاتُ

ہلاک کرنے والی چیزیں

(۴۰۳۱) قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ آپ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر

تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ

حرام فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔ اور اپنی

مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ

اولاد کو افلاس کے سبب نہ مار ڈالو۔ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔ اور تم بے حیائی کے کاموں

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا

کے پاس نہ جاؤ جو ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ ہیں۔ اور تم اس شخص کو ناحق قتل نہ کرو جس کا خون کرنا اللہ نے حرام کر دیا

بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ

ہے۔ ان سب کا اللہ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھ لو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ۔

الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا

مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہونچ جائے۔ اور ناپ اور تول کو

الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ

انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو۔ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ اور جب تم بات

فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ

کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان چیزوں کا اللہ تعالیٰ

بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (انعام آیت ۱۵۱ و ۱۵۲)

نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

تشریح (۴۰۳۱) ان دونوں آیتوں میں ان نو چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے۔ وہ نو چیزیں یہ ہیں (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا (۲) والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرنا (۳) فقر و افلاس کے اندیشہ سے اولاد کو قتل کرنا (۴) بے حیائی کے کام کرنا (۵) کسی کو ناحق قتل کرنا (۶) یتیم کا مال ناحق کھانا (۷) ناپ تول میں کمی کرنا (۸) شہادت، فیصلے یا اور کسی کلام میں ناانصافی کرنا (۹) اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا۔

ان آیات میں اصل مقصود حرام چیزوں کا بیان کرنا ہے جس کا مقتضا یہ تھا کہ ان سب کو نہی کے صیغوں سے بیان کیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم نے اپنے خاص حکیمانہ اسلوب کے تحت ان میں سے چند چیزوں کو بانداز ایجاب بصیغۂ امر بیان فرمایا ہے۔ اور مُراد یہ ہے کہ اس کے خلاف کرنا حرام ہے۔ اور بعض کو بصیغۂ نہی ذکر فرمایا ہے۔

ان آیات کی ابتداء اس طرح کی گئی ہے قُلْ تَعَالَوْا۔ تَعَالَوْا کے معنی ہیں "آجاؤ" دراصل یہ کلمہ ایسے وقت بولا جاتا ہے جب کوئی بلانے والا بلند جگہ پر کھڑا ہوکر نیچے والوں کو اپنے پاس بلائے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس دعوت کو قبول کرنے میں تمہارے لئے برتری و بلندی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا کہ آپ لوگوں سے یہ کہدیجئے کہ آجاؤ تاکہ میں تم کو وہ چیزیں پڑھکر سُنادوں جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہیں۔ یعنی یہ پیغام بلاواسطہ اللہ کی جانب سے آیا ہوا ہے۔ اس میں کسی کے ظن وقیاس کا دخل نہیں ہے۔ تاکہ تم ان سے بچنے کا پورا پورا اہتمام کرو۔ اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو اپنی طرف سے حلال کرنے کی جرأت نہ کرو۔

یہ خطاب اگرچہ مشرکین مکہ کو ہے۔ مگر مضمونِ خطاب عام اور تمام انسانوں کو شامل ہے۔ خواہ وہ اہل ایمان ہوں یا کفار، اہل عرب ہوں یا اہل عجم، آیت کے نزول کے وقت موجود ہوں یا آئندہ آنیوالے ہوں۔

پہلا گناہ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا۔ شَيْئًا مفعول بہ ہے یا مصدر محذوف شِرْكًا کی صفت ہے۔ شرک اور اس کی اقسام کا بیان اسی جزء کے شروع میں تفصیل سے آچکا ہے۔

دوسرا گناہ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور جائز کاموں میں ان کی نافرمانی نہ کرو۔ مگر حکیمانہ انداز میں مثبت پہلو کو بیان فرمایا گیا جس سے اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ والدین کے حق میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ان کی نافرمانی نہ کی جائے، اور ان کو ایذاء نہ دی جائے۔ بلکہ حسنِ سلوک اور نیازمندانہ برتاؤ سے بھی ان کو راضی رکھنا فرض ہے۔ والدین کے حقوق اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تفصیلات جزء اوّل میں "برالوالدین" کے تحت اور اسی جزء ثالث میں "ومن اکبرھا عقوق الوالدین" کے تحت گذر چکی ہیں۔

تیسرا گناہ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ الخ اس جُرم کی تفصیل قریب ہی میں "قتل الاولاد ووادالبنات" میں گذر چکی ہے۔ وہاں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت تھی اور یہاں سورۂ انعام کی، مضمون دونوں کا ایک ہی ہے۔ یہاں "مِنْ اِمْلَاقٍ" ہے اور بنی اسرائیل کی آیت میں خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ہے اور یہاں نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ہے۔ اور بنی اسرائیل میں اس کے برعکس نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ہے۔ مطلب میں کوئی فرق نہیں۔

چوتھا گناہ

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ یعنی بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ الفاظ الفواحش

فَاحِشَۃٌ کی جمع ہے۔ فُحْشٌ، فَحْشَآءٌ اور فَاحِشَۃٌ مصادر ہیں۔ جن کا ترجمہ بے حیائی کیا جاتا ہے اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے بڑے کام کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جسکے بڑے اثرات دور رس ہوں۔ امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں اور ابن کثیر نے نہایہ میں یہی معنی بیان کیے ہیں۔ فحش اور فحشاء کے اس عام مفہوم میں تمام بڑے گناہ داخل ہو جاتے ہیں۔ خواہ انکا تعلق اقوال سے ہو یا افعال سے۔ وہ ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے۔ اسی لئے یہ لفظ بدکاری کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس صورت میں ماظہر سے مراد وہ گناہ ہوں گے جو زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سے سرزد ہوں۔ اور ما بطن سے وہ گناہ مراد ہوں گے جن کا تعلق قلب سے ہے۔ مثلاً حسد، کینہ، حرص، ناشکری، بے صبری وغیرہ۔ فحش کے دوسرے معنی عرفی بے حیائی کے ہیں۔ تو اس میں وہ گناہ داخل ہونگے جن کا تعلق عرفی حیا سے ہے۔ جیسے زنا، لواطت وغیرہ (اگرچہ حقیقت میں ہر گناہ بے حیائی کا ہی نتیجہ ہے) اس تفسیر کی بنا پر مَا ظَهَرَ سے مراد کھلی ہوئی بدکاری اور اس کے دواعی و اسباب ہوں گے۔ اور مَا بَطَنَ سے بدنیتی، بدکاری کی تدابیر کی فکر اور خیالات فاسدہ مراد ہوں گے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ظاہری فواحش سے وہ گناہ مراد ہیں عام طور پر جن کا گناہ ہونا سب کو معلوم ہے۔ اور باطنی فواحش سے وہ گناہ مراد ہیں جن کا گناہ ہونا عوام کو معلوم نہیں۔

بعض کہتے ہیں مَا ظَهَرَ سے مراد وہ گناہ ہیں جو منظرِ عام پر آگئے اور سب کو معلوم ہو گئے ہوں۔ اور مَا بَطَنَ سے مراد وہ گناہ ہیں جن کا علم دوسروں کو نہیں ہوا۔ جیسے چپکے سے بیوی کو تین طلاق دیکر پھر بیوی بنا کر رکھ لیا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مَا ظَهَرَ میں وہ سب ہی گناہ داخل ہیں جن کا کسی اعتبار سے بھی ظہور ہوا ہو۔ اور مَا بَطَنَ میں تمام وہ گناہ داخل ہیں جن میں کسی اعتبار سے بھی پوشیدگی ہو۔ الفاظ میں اطلاق و عموم ہے۔ بلا وجہ ان میں تخصیص و تقیید مناسب نہیں ہے۔ باری تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان ظاہری و باطنی گناہوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ قریب نہ جانے کا حکم دیگر گناہوں سے رک جانے کے حکم کی تاکید و اہتمام مقصود ہے۔ یعنی ایسی مجالس و مقامات و اسباب و خطرات سے بھی پرہیز کرو جو گناہوں تک پہونچادیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ،

مَنْ حَامَ حَوْلَ الْحِمٰى اَوْشَكَ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ۔	جو شخص کسی ممنوع چیز کے گرد گھومتا ہے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔

پانچواں گناہ

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (یعنی اللہ نے جس کا خون حرام کر دیا ہے اس کو قتل نہ کرو)

قتلِ ناحق کا جرم عظیم ہونا دنیا کے تمام مذہبوں، جماعتوں، فرقوں اور تمام عقلمندوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک اس سے ہلکی ہے کہ کسی ایک ایماندار آدمی کو قتل کر دیا جائے۔ بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے باشندے کسی مؤمن کے قتلِ ناحق میں شریک ہو جائیں تو ان سب کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کر دیں گے۔ (رواہ ابن ماجۃ بسند حسن) احادیث میں اس کے علاوہ بیشمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

اِلَّا بِالْحَقِّ کی تفصیل بخاری و مسلم کی حدیث میں اس طرح ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین صورتوں میں۔ (۱) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے (تو سنگسار کر کے اس کو مار ڈالا جائیگا) (۲) اس نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہو۔ (تو مقتول کا وارث اس کو بدلہ میں قتل کرا سکتا ہے) (۳) اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا ہو (تو اسکی سزا بھی قتل ہے) حضرت عثمان غنیؓ جسوقت باغیوں کے نرغہ میں محصور تھے اور وہ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے تو اسوقت حضرت عثمانؓ نے ان کو یہ حدیث سنا کر فرمایا بحمد اللہ میں ان تینوں جرموں سے بری ہوں۔ میں نے زمانۂ اسلام میں تو کیا زمانۂ جاہلیت میں بھی کبھی زنا نہیں کیا۔ اور نہ میں نے کسی کو ناحق قتل کیا۔ اور نہ کبھی میرے دل میں اسلام چھوڑ دینے کا وسوسہ آیا، پھر تم مجھ کو کس وجہ سے قتل کرنا چاہتے ہو۔

اور بے وجہ جس طرح مسلمان کا قتل کرنا حرام ہے۔ اسی طرح اس غیر مسلم کا قتل کرنا بھی حرام ہے جو کسی اسلامی ملک میں ملک کے قانون کا پابند ہو کر رہتا ہے۔ یا جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے۔ ترمذی، وابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی ذمی کو قتل کر دے اس نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا۔ اور جو شخص اللہ کے عہد کو توڑ دے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیگا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ذمی لوگ اپنا مال اسلئے خرچ کرتے ہیں کہ ان کے مال ہمارے مالوں کی طرح اور ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح محفوظ ہو جائیں (مال سے مراد وہ مال ہے جو مال معاہدہ میں طے ہوا ہے۔ کہ اتنا مال بطور جزیہ دیا کریں گے جو ان کی حفاظت وغیرہ ہی پر خرچ ہو جاتا ہے)

چھٹا گناہ

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ الخ (یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر بہتر طریقہ سے یہانتک کہ وہ سنِ بلوغ (جوانی) کو پہونچ جائے) اس میں یتیم کے ولی و مربی کو خطاب ہے کہ وہ لوگ یتیموں کے مال کو کھا اڑا کر ختم نہ کر دیں۔ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ ان کے مالوں کو محفوظ رکھیں، بڑھائیں۔ جب جوان ہو جائیں اور ان کے

ہوش وحواس درست ہوں تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دیں۔ بہتر یہ ہے کہ حوالہ کرتے وقت باقاعدہ گواہ بنالیں۔ البتہ ان کو کھانے پینے میں اس طرح شریک کر سکتے ہیں کہ ان کی ضرورت کے موافق ان کا خرچہ ان کے مالوں میں سے لے لیں۔ اسی طرح اگر کوئی غریب آدمی یتیم کے مال کی حفاظت اور کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ اور گذران کی دوسری کوئی صورت نہیں ہے تو بقدرِ ضرورت عرف کے موافق اپنے ضروری اخراجات کے لئے یتیم کے مال میں سے لے سکتا ہے۔

حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ۔ میں یتیموں کے مال کی حفاظت کرنے کی حد کا بیان ہے۔ اشد کے معنی قوت کے ہیں۔ اور اس کی ابتداء جمہور علماء کے نزدیک بالغ ہونے سے ہو جاتی ہے۔ جس وقت بچہ میں بلوغ کے آثار پائے جائیں یا پندرہ ۱۵ سال کی عمر ہو جائے تو اس کو شرعاً بالغ قرار دیا جائیگا۔ البتہ بلوغ کے بعد یہ دیکھا جائیگا کہ اس کو مالی تصرفات کا شعور اور صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو بالغ ہوتے ہی مال اس کے حوالہ کر دیا جائیگا۔ ورنہ تو پچیس ۲۵ سال کی عمر تک مال کی حفاظت ولی کے ذمہ ہوگی۔ اس درمیان میں اس میں جس وقت بھی مال کی حفاظت اور کاروبار کی لیاقت پیدا ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور اگر پچیس ۲۵ سال تک بھی اس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو تو پھر امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک بہرحال اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ یہ عدم صلاحیت دیوانگی اور جنون کی حد تک پہونچی ہوئی نہ ہو۔ اور بعض ائمہ کے نزدیک اسوقت بھی مال اس کو سپرد نہ کیا جائیگا۔ بلکہ شرعی قاضی اس کے مال کی حفاظت کسی ذمہ دار آدمی کے سپرد کر دیگا۔

یتیموں کے متعلق چند احادیث معہ تشریحات جزء اول میں عنوان " الیتامٰی " کے تحت گذر چکی ہیں۔ مزید تفصیلات ومسائل اور یتامٰی کے متعلق آیات کی تفسیرات ہماری کتاب " خلاصۂ تورات " میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ساتواں گناہ

وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ۔ (اور ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو) یعنی دینے والا دوسرے فریق کے حق میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور لینے والا اپنے حق سے زیادہ نہ لے۔ حاصل یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ کہ یہ حرام اور گناہ ہے۔ اس کی تفصیلات مرآۃ کے جزء ثانی میں (۱۶۶ و ۱۶۷) کے تحت گذر چکی ہیں۔ نیز درسی تفسیر پ۳۰ سورۂ تطفیف میں اور " خلاصۂ تورات " میں اس بحث کی تفصیلات مذکور ہیں۔ بہرکیف ساتواں گناہ ناپ تول میں کمی کرنا ہے جس کو بانداز حکیمانہ صیغۂ امر سے بیان فرمایا گیا کہ ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ یعنی ان میں کمی نہ کرو۔

اس حکم میں یہ بھی فرمایا لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے) بعض روایاتِ حدیث میں اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے۔

کہ جو شخص اپنے حد اختیار تک ناپ تول کا پورا پورا حق ادا کرے۔ اسکے باوجود اگر غیر اختیاری طور پر کوئی معمولی کمی بیشی ہو جائے تو وہ معاف ہے۔ کیونکہ وہ اس کی قدرت وطاقت اور اختیار سے باہر ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ اس جملہ کا اضافہ کرکے اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ ادائے حق کے وقت احتیاط اس میں ہے کہ کچھ زیادہ دیدیا جائے۔ تاکہ کمی کا شبہ نہ رہے۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل کا ثمن ادا کرتے وقت وزن کرنیوالے سے فرمایا زِنْ وَاَرْجِحْ (تولو اور جھکتا تولو) جیساکہ (۱۵۸) میں گذرا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہی تھی کہ حق سے زائد ادا فرمانے کو پسند فرماتے تھے۔ اور بخاری شریف میں حضرت جابرؓ کی روایت مذکور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو بیچتے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے اور خریدتے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے بلکہ کچھ معمولی کمی بھی ہو تو راضی ہو جائے۔"

مگر یہ حکم اخلاقی ہے قانونی چیز نہیں کہ آدمی ایسا کرنے پر مجبور ہو۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ "ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ چیز کا حکم نہیں دیتے" یعنی دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق میں کمی پر راضی ہو جانا کوئی جبری حکم نہیں۔ کیونکہ عام لوگوں کو ایسا کرنا آسان نہیں۔ واللہ اعلم

آٹھواں گناہ عدل وانصاف نہ کرنا آٹھواں گناہ ہے جسکو ایجابی انداز میں ارشاد فرمایا گیا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی (جب بات کہو تو حق اور انصاف کی کہو اگرچہ وہ اپنا رشتہ دار ہی ہو) اس جگہ کسی خاص بات کا ذکر نہیں اسلئے جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ ہر قسم کی بات کو شامل ہے۔ گو وہ بات کسی معاملہ کی گواہی ہو یا حاکم کی طرف سے فیصلہ ہو، یا ان کے علاوہ کوئی اور گفت گو، ہر بات میں حق وانصاف کو ملحوظ رکھنا فرض اور بے انصافی حرام اور گناہ ہے۔ کسی کی دوستی، دشمنی، رشتہ داری اور اجنبیت کی وجہ سے حق وانصاف کے خلاف گواہی یا فیصلہ ظلم ہے۔ تفصیلات مرآۃ جزء ثانی میں عنوان "ومنها الحكم بالقسط والعدل" اور "منها الشهادة بالحق" کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

نواں گناہ عہد شکنی ہے۔ ارشاد فرمایا وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (اللہ کے عہد کو پورا کرو یعنی عہد شکنی نہ کرو) اس عہد سے مراد عہد الست بھی ہو سکتا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں جو امتثال جمیع اوامر واجتناب عن المناہی کا عہد ہوا وہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ قرآن مقدس میں مختلف مواقع پر جو عہود مذکور ہیں وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ جو نیاز، منت وغیرہ کے طور پر بندہ عہد کرتا ہے وہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

اور تمام اقسام کے عہد جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہوتے ہیں بیک وقت مراد ہوں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ واللہ اعلم

عہد کی تعریف اور اس کی اقسام کی تفصیلات مرآۃ جزء اول میں عنوان، وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا، اور نمبر ۱۸۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ان دونوں آیتوں کے بعد تیسری آیت (۱۵۳) وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الآیۃ میں دسواں حکم صراطِ مستقیم پر چلنے کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سیدھے راستہ کو چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار نہ کرو۔ (اس آیت نمبر ۱۵۳ کی وضاحت و تفسیر (۲۹۴) میں گذر چکی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان تین آیات (۱۵۱ و ۱۵۲ و ۱۵۳) میں دس محرمات کو بیان فرمایا ہے۔ بعض کو نہی کے صیغہ کے ساتھ بعض کو جانب مخالف کا امر فرماکر۔ ان تینوں آیات کے مضمون کو بڑے اہتمام سے شروع فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ۔ جس کا مطلب شروع میں بیان ہو چکا۔

ان تین آیات کی خصوصیات

حضرت کعب احبار (جو پہلے تورات کے ماہر عالم تھے پھر مسلمان ہوگئے تھے) فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ آیات جن میں دس حرام چیزوں کا بیان ہے اللہ کی کتاب تورات بسم اللہ کے بعد انہی آیات سے شروع ہوتی ہے (انتہی) اور کہا گیا ہے کہ یہی وہ دس کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ مفسر قرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہی وہ آیات محکمات ہیں جن کا ذکر سورۂ آل عمران میں آیا ہے کہ جن پر آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم تک سب کی شریعتیں متفق رہی ہیں ان میں سے کوئی چیز کسی مذہب و ملت اور شریعت میں منسوخ نہیں ہوئی۔ (بحر محیط)

یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "وصیت نامہ" ہیں۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے تو وہ ان (تینوں) آیات کو پڑھ لے۔ ان میں وہ وصیت موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی امت کو کی ہے۔ اور حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو خطاب کرکے فرمایا:

"کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے" پھر یہی تین آیات تلاوت فرماکر ارشاد فرمایا کہ:

"جو شخص اس بیعت کو پورا کریگا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگیا۔" (معارف القرآن ص ۴۸۴ ج ۳)

(۴۰۴) قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۔ (نساء آیت ۱۰)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ بیشک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

تشریح (۴۰۴) اس آیت میں یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرنیوالوں کے لئے سخت وعید ہے۔ جو شخص یتیموں کا مال ناجائز طریقہ پر کھا رہا ہے درحقیقت وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کے انگارے بھر رہا ہے۔ کیونکہ اس کا انجام آخرت میں یہی ہوگا۔ اگر اسوقت اس کی صورت آگ کی نہیں معلوم ہو رہی ہے۔ جیسے کوئی شخص دیا سلائی کو کہے کہ یہ آگ ہے۔ یا سنکھیا اور زہر کے متعلق کہے کہ یہ قاتل ہے۔ تو ظاہر ہے کہ دیا سلائی کو ہاتھ میں لینے سے ہاتھ نہیں جلتا۔ اور سنکھیا کو ہاتھ میں لینے سے بلکہ منہ میں رکھنے سے بھی کوئی آدمی مر نہیں جاتا۔ البتہ ذرا سی رگڑ سے دیا سلائی کا آگ ہو جانا اور حلق سے اُتار کر سنکھیا کا قاتل ہونا سمجھ میں آجائیگا اور کہنے والے کی سچائی کا مشاہدہ ہو جائیگا۔ بس اسی طرح نیک اعمال جنت کی نعمتیں اور بُرے اعمال دوزخ کے عذاب اور یتیم کے مال میں ناجائز تصرف دوزخ کے انگارے ہیں۔ اگرچہ اسوقت ان اعمال میں ثواب وعذاب ظاہر نہیں ہو رہے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ان قرآنی حقائق کا مشاہدہ ہو جائیگا۔ بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانیوالا قیامت کے دن ایسی حالت میں اٹھایا جائیگا کہ اس کے پیٹ سے آگ کی لپٹیں اس کے منہ، ناک، کانوں اور آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ آگ سے بھڑک رہے ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا الآیۃ (ابن کثیر ص۴۵۶ ج۱) اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں احتیاط کی واضح ہدایات دی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اُحَرِّجُ مَالَ الضَّعِیْفَیْنِ الْمَرْاَۃِ وَالْیَتِیْمِ (حوالۂ بالا) (میں تم کو دو کمزوروں یعنی عورت اور یتیم کے مال سے بچنے کی زبردست تاکید کرتا ہوں)

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں اول سے اخیر تک یتیموں ہی کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ یتیموں کے مالوں کی حفاظت، ان کے مال کو اپنا مال بنا لینے کی ممانعت، میراث میں ان کا مقررہ حصہ دینے کا حکم، بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کے مالوں کو جلدی اڑا دینے اور یتیم لڑکیوں سے نکاح

کرکے ان کے مہر دل میں کمی کرنے اور ان کے مالوں پر قبضہ کرنے کی ممانعت وغیرہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اخیر میں اس آیت مذکورہ میں یتیموں کے مالوں میں ناجائز تصرفات پر جہنم کے انگاروں کی وعید سنائی گئی ہے۔ یاد رہے کہ یَاْکُلُوْنَ سے مراد صرف کھانا نہیں بلکہ ہر تصرف و استعمال مراد ہے۔ محاورہ میں کسی کا مال ناحق کھا لینا تمام استعمالات کو شامل ہوتا ہے۔

---

(۴۰۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ

اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هُنَّ قَالَ الشِّرْكُ
سات ہلاک کرنیوالی چیزوں سے بچو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک

بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ
اور جادو اور اس شخص کو قتل کرنا جس (کے قتل) کو اللہ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ اور

الرِّبٰوا وَاَكْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ
سود خواری اور یتیم کا مال کھانا اور جہاد کے دن پیٹھ پھیر کر واپس ہونا، اور بھولی بھالی

الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ الْغٰفِلٰتِ۔ (بخاری ص۳۸۲ و ص۱۰۱۱ مشکوٰۃ ص۱۷)
پاک دامن مومن عورتوں پر تہمت لگانا۔

(۴۰۶) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
حضرت سمرۃ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے

رَاَیْتُ اللَّیْلَةَ رَجُلَیْنِ اَتَیَانِیْ فَاَخْرَجَانِیْ اِلٰی اَرْضٍ مُّقَدَّسَةٍ
رات دو شخصوں کو دیکھا کہ وہ میرے پاس آئے اور مجھ کو ایک مقدس زمین کی طرف لے گئے

فَانْطَلَقْنَا اِلٰی نَقْبٍ مِّثْلِ التَّنُّوْرِ اَعْلَاهُ ضَیِّقٌ وَّاَسْفَلُهٗ وَاسِعٌ
تو ہم ایک سوراخ پر پہونچے جو تنور کی طرح تھا یعنی اوپر سے تنگ اور اس کا نچلا حصہ کشادہ تھا

تَتَوَقَّدُ تَحْتَهٗ نَارٌ فَاِذَا اقْتَرَبَ ارْتَفَعُوْا حَتّٰی كَادُوْا یَخْرُجُوْنَ
اس کے نیچے آگ جل رہی تھی تو جب آگ (اوپر کو) قریب آتی تو وہ لوگ (جو اس میں تھے) اوپر آجاتے اور

فَاِذَا خَمَدَتْ رَجَعُوْا فِیْهَا رِجَالٌ وَّنِسَآءٌ عُرَاةٌ قُلْتُ مَا هٰذَا
نکلنے کے قریب ہوجاتے پھر جب وہ آگ نیچے کو دب جاتی تو وہ لوگ بھی (نیچے کو) واپس ہوجاتے، اس میں بہت سے ننگے

قَالَ هُمُ الزُّنَاةُ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰی اَتَیْنَا عَلٰی نَهَرٍ مِّنْ دَمٍ فِیْهِ
مرد اور ننگی عورتیں تھیں، میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ زناکار ہیں۔ پھر ہم چلے یہاں تک کہ ہم ایک نہر پر

رَجُلٌ قَائِمٌ وَعَلٰى شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ بَيْنَ يَدَيْهِ حِجَارَةٌ فَاَقْبَلَ

پہونچے جس میں خون تھا اور اس میں ایک شخص کھڑا تھا اور نہر کے کنارے پر ایک آدمی تھا جس کے سامنے پتھر پڑے تھے

الرَّجُلُ الَّذِیْ فِی النَّهْرِ فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَّخْرُجَ رَمَاهُ الرَّجُلُ بِحَجَرٍ

توجو شخص نہر میں تھا وہ آیا اور جب نکلنے کا ارادہ کیا تو اس شخص نے اس کے منہ میں ایک پتھر مارا

فِیْ فِيْهِ فَرَدَّهٗ حَيْثُ كَانَ فَجَعَلَ كُلَّمَا جَاءَ لِيَخْرُجَ رَمٰى فِیْ فِيْهِ بِحَجَرٍ

اور اس کو وہیں واپس کردیا جہاں وہ تھا تو وہ مسلسل اسی طرح کرتا تھا کہ جب وہ نکلنے کے لئے آتا تو یہ اس کے منہ میں

فَيَرْجِعُ كَمَا كَانَ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالَ اٰكِلُ الرِّبٰوا۔ (بخاری ص۱۸۵ مشکوٰة ص۲۹۵)

پتھر مار کر وہیں واپس کر دیتا جہاں وہ تھا میں نے کہا یہ کون ہے؟ کہا یہ سود خوار ہے۔

(٤٠٧) عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ

حضرت جابرؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے کھانے والے اور سود کے

الرِّبٰوا وَمُوْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَشَاهِدَهٗ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ۔ (مسلم ج۲ ص۲۷ مشکوٰة ص۲۴۴)

کھلانیوالے اور سود کے لکھنے والے اور اسکے گواہ پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ سب لوگ (گناہ میں) برابر ہیں۔

تشریح

(٤٠٥) حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا اجتنبوا السّبع الموبقات تم لوگ (ہلاک کرنیوالی سات چیزوں سے بچتے رہو) یہ اجمال ہے۔ آگے ان ساتوں کی تفصیل ہے۔ کسی بات کو اولاً اجمال سے پھر تفصیل سے بیان کرنے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں وہ بات اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اسلئے کہ اس میں تکرار ہوجاتا ہے واذا تکرر الکلام علی السمع تقرر فی القلب۔ دوسرے مخاطب کے دل میں اجمال سے اس کی تفصیل کا انتظار واشتیاق پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی کو طلب سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اور طلب سے جو بات حاصل ہوتی ہے وہ محفوظ ہوجاتی ہے سبق سے پہلے مطالعہ سے بھی قلب میں ان امور کی طلب پیدا ہوجاتی ہے۔ جو مطالعہ کے وقت سمجھ میں نہیں آئے۔ اور جب اُستاذ ان امور کی تقریر و وضاحت کرتا ہے تو وہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ اور جو حصہ مطالعہ میں سمجھ میں آگیا تھا وہ بھی اسلئے یاد ہوجاتا ہے کہ وہ دوبارہ واضح ہوکر سامنے آگیا۔

(۱) ان ساتوں میں سے ایک شرک ہے جس کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔

(۲) جادو اور اسکے اقسام

دوسری چیز سحر ہے۔ لفظ سحر کے معنی باب فتح سے دھوکہ دینا، جادو کرنا، فریفتہ کرنا۔ بصلہ عن پھیرنا، دور کرنا۔ آتے ہیں۔ السحر مص وہ چیز جس کا ماخذ لطیف و دقیق ہو۔ باطل کو حق کی صورت میں ظاہر کرنا، جادو، دھوکہ،

حیلہ، فساد، ہر وہ چیز جس کے حاصل کرنے میں شیطانی تقرب کی ضرورت ہو۔ ج اَسْحَارٌ و سُحُوْرٌ۔
مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں کہ:
سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو۔ (قاموس) خواہ وہ سبب معنوی ہو۔ جیسے خاص خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو جیسے جنات اور شیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم و سیارات کا اثر۔
اسلئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرفِ عام میں عموماً جادو اُن چیزوں کو کہا جاتا ہے جنہیں جنات و شیاطین کے عمل کا دخل ہو۔ یا قوتِ خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ کلمات و الفاظ کا۔ کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی، اور قدیم و جدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں۔ کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یا ایسے تاثرات جو انسانی بالوں یا ناخنوں یا استعمال شدہ کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کرکے پیدا کیے جاتے ہیں۔ جن کو عرفِ عام میں ٹونا ٹوٹکا کہا جاتا ہے اور ان کو جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔
لیکن اصطلاحِ قرآن و سنت میں سحر ہر ایسے امرِ عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو۔ پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔
(۱) ایسا منتر پڑھنا جس میں کلماتِ کفر و شرک اور شیاطین کی مدح ہو۔ (۲) کواکب کی عبادت کرنا (۳) دیگر ایسے اعمال کرنا جو شیطان کو پسند ہیں۔ مثلاً کسی کو ناحق قتل کرنا، جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا اور پاکیزگی سے دور رہنا وغیرہ۔ اسی لئے ایسے ہی لوگوں کا سحر کامیاب ہوتا ہے۔ جو ظاہری و باطنی گندگیوں میں ملوث رہتے ہیں۔ حائضہ عورتیں بھی یہ کام کرتی ہیں تو ان کا عمل گندگی کی وجہ سے مؤثر ہوتا ہے۔ اور شعبدوں، ٹوٹکوں، ہاتھ کی صفائی اور مسمریزم وغیرہ کو مجازاً سحر کہدیا جاتا ہے۔
امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ سحر کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم تو محض تخییل اور نظر بندی ہوتی ہے۔ جس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی۔ جیسے بعض شعبدہ باز ہاتھ کی صفائی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام نگاہیں ان کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ غیر واقعی چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ کبھی یہ کام شیطانی اثر سے بھی ہو سکتا ہے کہ مسحور ایک غیر واقعی

چیز کو حقیقت سمجھنے لگے۔ فرعونی ساحروں کے بارے میں ارشاد باری ہے کہ:

سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ۔	(انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا)

اور فرمایا کہ:

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى	(ان کے سحر سے موسیٰ کو یہ خیال ہونے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں)

لفظ یُخَیَّلُ سے یہ بتا دیا کہ جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں نہ سانپ بنیں اور نہ انہوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرتِ موسیٰؑ کی قوتِ متخیلہ متأثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔ یہ تخییل و نظر بندی تھی۔

اور شیاطین کے اثر سے جو تخییل و نظر بندی ہوتی ہے اسکے متعلق ارشاد ہے کہ:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ	(میں تم کو بتاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیاطین اترتے ہیں ہر بہتان باندھنے والے بدکار پر اترتے ہیں)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ	(یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھانے لگے)

سحر کی تیسری قسم یہ ہے کہ اس کے ذریعہ شئی کی حقیقت ہی بدل جائے۔ جیسے کسی جاندار کو پتھر یا انسان کو حیوان بنا دیں۔ معتزلہ، امام راغب اصفہانی اور امام ابوبکر جصاص وغیرہ نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعہ کسی شئی کی حقیقت بدل سکتی ہے۔ مگر جمہور علمائے اہلِ سنت اس کے قائل ہیں اور اس میں کوئی عقلی یا شرعی استحالہ بھی نہیں۔ جمہور کے دلائل میں سے ایک دلیل کعب احبار کی روایت بھی ہے۔ جو مؤطا امام مالک میں قعقاع بن حکیم سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

لَوْلَا كَلِمَاتٌ اَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِي الْيَهُوْدُ حِمَارًا۔	(اگر یہ کلمات نہ ہوتے جن کو میں پڑھتا ہوں تو یہود مجھ کو گدھا بنا دیتے)

حمار کے مجازی معنی گو احمق و بے وقوف کے بھی ہیں۔ لیکن بے ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں اسلئے یہاں لفظِ حمار کے حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) سحر کے ذریعہ انسان کو گدھا بنا دینا ممکن ہے (۲) ان کلمات کی تاثیر جو کعبِ احبار پڑھتے تھے یہ ہے کہ ان کے پڑھنے والے پر کوئی جادو اثر نہیں کرتا۔ اور وہ کلمات یہ ہیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ	(میں اس عظمت والے اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے

أَعُوْذُ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَآءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَأَ وَذَرَأَ۔ (مشکوٰۃ ص۲۱۸)

بڑا کوئی نہیں اور اس کے کلمات تامات کی جہت سے کوئی نیک بد انسان آگے نہیں نکل سکتا۔ اور اسکے تمام اسمائے حسنیٰ کی جنکو میں جانتا ہوں اور جنکو میں نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اور وجود دیا اور پھیلایا ہے۔

سحر اور معجزہ میں فرق

معجزہ و کرامت اور سحر سے ایسے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں جو عادت کے خلاف ہوتے ہیں یعنی خرقِ عادت (عادت کے خلاف ہونے) میں تینوں مشترک ہوتے ہیں۔ اسلئے جاہلوں کو ان میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ اور بعض جاہل جادو کو کرامت سمجھ کر جادوگروں کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں۔ اسلئے ان کے درمیان چند عام فہم فرق بیان کر دینے ضروری ہیں۔

(۱) ایک فرق تو حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ وہ یہ کہ سحر میں دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ گو وہ اسباب خفی اور پوشیدہ ہوں۔ اسلئے جس شئ کے اسباب ظاہر ہوتے ہیں اس کو اسباب کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اور اسپر تعجب بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر اسباب خفی ہوتے ہیں تو اس کو اسباب کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ اور وہ حیرت و تعجب کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ اور معجزہ بلا واسطۂ اسباب اللہ کا فعل ہوتا ہے، جو مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح کرامت بھی اللہ کا فعل ہوتا ہے، جو کسی متبع نبی (ولی) کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اسبابِ طبعیہ کو ان میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (آپ نے کنکریوں کی مٹھی جو پھینکی وہ آپنے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے) مطلب یہ ہے کہ ایک مٹھی کنکریاں سارے مجمع کی آنکھوں میں پہونچ جانا آپ کے بس کی بات نہ تھی، یہ حق تعالیٰ شانہٗ ہی کا فعل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ معجزہ و کرامت بلا واسطۂ اسبابِ طبعیہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ اور سحر اسبابِ طبعیہ خفیہ کا اثر ہوتا ہے۔ مگر یہ فرق عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

(۲) معجزہ مدعی نبوت سے اور کرامت متبع نبی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور سحر ان کے علاوہ دوسری قسم کے انسان کرتے ہیں۔ اور دونوں قسم کی شخصیتوں میں کھلا ہوا فرق ہوتا ہے۔

(۳) معجزہ یا کرامت کا ظہور جن حضرات سے ہوتا ہے ان میں تقویٰ و طہارت، پرہیزگاری و شرافت اور اچھے اخلاق و اعمال ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جادو کا اثر ایسے لوگوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو ناپاک، گندے اور ذکر و عبادت سے دور رہتے ہیں۔

(۴) اگر جادوگر معجزہ یا نبوت کا دعویٰ کر دے تو اس کا جادو نہیں چل سکتا یعنی اس دعوے کے چل جاتا ہے

مؤخر الذکر تینوں علامات آنکھوں سے دیکھ کر پہچانی جاسکتی ہیں۔

کیا نبیوں پر بھی جادو کا اثر ہوسکتا ہے؟

یہ معلوم ہوچکا ہے کہ سحر اسباب طبعیہ میں سے ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اسباب طبعیہ کے اثر سے متأثر ہوتے ہیں۔ یہ تأثر شانِ نبوت کے خلاف نہیں۔ جیسے ان کا بھوک، پیاس، بیماری میں مبتلا ہونا، شفاء پانا وغیرہ شانِ نبوت کے منافی نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کے سحر کا اثر ہوا۔ اور اسی سلسلہ میں معوذتین کا نزول ہوا (اس کی تفصیل درسی تفسیر پ۳۰ میں ملاحظہ فرمائیں)

حضرت موسیٰ علیہ السلام سحر سے متأثر ہوئے۔ جیسا کہ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ۝ اور فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ وغیرہ آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

سحر کے احکام

(۱) امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ سحر کا وجود اہلِ سنت کے نزدیک ثابت ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنا کفر ہے۔ شیخ ابو منصورؒ فرماتے ہیں کہ مطلقاً سحر کو کفر قرار دیدینا صحیح نہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر اس کے اندر کوئی ایسی بات ہو جس سے کسی شرعی بات کی تردید ہوتی ہو تو سحر کفر ہے ورنہ نہیں۔ تاہم سحر کی اکثر اقسام میں گناہِ کبیرہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ جو فسق ہے۔

(۲) جب یہ معلوم ہوگیا کہ سحر کفر یا فسق ہے۔ تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہے۔ اور اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوگا۔ البتہ اگر مسلمانوں سے دفعِ ضرر کے لئے بقدرِ ضرورت سیکھا جائے (بشرطیکہ کفریہ کلمات نہ ہوں) تو بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ (شامی وعالمگیری)

(۳) مدارک میں ہے کہ جو سحر کفر ہے اس کو اگر کوئی مرد سیکھے تو اس کو (مرتد ہونے کی وجہ سے) حنفیہ کے نزدیک قتل کردیا جائے۔ اور اگر عورت سیکھے تو (گو وہ مرتد ہوگئی مگر) قتل نہ کیجائے۔ جیسا کہ مرتد اور مرتدہ کے بارے میں یہی حکم ہے۔ اور جو سحر کفر نہیں، لیکن ایسا ہے کہ اس سے کسی کو ہلاک کیا جاسکتا ہے تو ایسا سحر سیکھنے والے قطاع الطریق (ڈاکوؤں) کے حکم میں ہیں۔ اس میں مرد وعورت دونوں برابر ہیں یعنی دونوں کو وہی سزا دیجائے گی جو ڈاکوؤں کو دی جاتی ہے۔ (کما فی قولہ تعالیٰ أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا الآیۃ)

(۴) اگر ساحر توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہوگی خواہ اس کا سحر کفر ہو یا فسق۔ جس نے ساحر کی توبہ غیر مقبول قرار دی وہ صحیح نہیں۔ چنانچہ فرعون کے ساحروں کی توبہ قبول ہوئی۔ حالانکہ وہ کفار تھے۔ اور ان کا سحر کلیم اللہ کے معجزہ کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے کفر تھا۔

(۵) تعویذ، گنڈے جو عامل لوگ کرتے ہیں، اگر کفریہ کلمات یا غیر معلوم المعنیٰ الفاظ نہ ہوں اور

شیاطین وغیرہ سے استمداد واستغاثہ بھی نہ کیا جائے تو جائز ہیں۔ اگر شیاطین واصنام اور غیر اللہ سے اِستمداد و اِستغاثہ کا احتمال بھی ہو تو حرام ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ دورِ حاضر کے عاملین اس میں نہایت غیر محتاط ہیں۔

(۶) اگر اسمائے الٰہیہ، قرآنی آیات، حدیثی کلمات یا ایسی عبارت والفاظ سے عمل کیا جائے جن کے معنیٰ معلوم ہوں، اور اُن سے کفر وشرک بھی لازم نہیں آتا، لیکن ناجائز مقاصد کے لئے وہ عمل کیا جائے تب بھی جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) موبقات کی تیسری قسم قتلِ ناحق ہے۔ اس کی تفصیل قریب میں گذر چکی۔

(۴) چوتھا گناہ سود خوری ہے۔ ابن عربیؒ نے احکام القران میں فرمایا الرِّبٰوا فی اللُّغَۃِ الزِّیَادَۃُ وَالْمُرَادُ بِہٖ فِی الْاٰیَۃِ کُلُّ زِیَادَۃٍ لَا یُقَابِلُھَا عِوَضٌ۔ (ص۲۴۲)

یعنی ربا کے معنیٰ اصل لغت میں زیادتی کے ہیں۔ اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو۔ امام جصاص نے احکام القرآن میں ربوٰا کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں کہ:

ھُوَ الْقَرْضُ الْمَشْرُوْطُ فِیْہِ الْاَجَلُ وَ زِیَادَۃُ مَالٍ عَلَی الْمُسْتَقْرِضِ۔

(ربوٰا وہ قرض ہے جس میں کسی مدت کیلئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرضدار اس کو اصل مال پر کچھ زائد رقم ادا کردے گا)

حدیث میں ہے:

کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَھُوَ رِبَاءٌ۔

(جو قرض کچھ نفع کھینچ لے وہ ربا ہے)

حاصل یہ ہے کہ اُدھار دیکر اُس پر نفع لینے کا نام رِبا (اور سود) ہے۔ جو زمانۂ جاہلیت میں عرب میں معروف ومروج تھا جس کو قرآن پاک نے حرام قرار دیا۔ اور صحابۂ کرامؓ نے حرمتِ ربوٰا کا حکم نازل ہوتے ہی رباء کا کاروبار چھوڑ دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رباء کے مفہوم میں بیع وشراء کی ایسی چند صورتوں کو مزید شامل فرما دیا جن کو اہلِ عرب ربوٰا نہ سمجھتے تھے۔ مثلاً چھ چیزوں کی بیع وشراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر سرابر اور دست بدست ہونا چاہیئے۔ اس میں کمی بیشی یا اُدھار بھی ربوٰا شمار ہوگا۔ وہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوںؔ، جوؔ، کھجورؔ اور انگورؔ ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرمایا کہ ایک ربوٰا حقیقی ہے اور ایک وہ ہے جو بحکمِ ربوٰا ہے۔ حقیقی ربوٰا تو قرض اُدھار پر زیادتی لینے کا نام ہے۔ اور بحکم ربوٰا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا ہے۔ اور بعض خاص چیزوں میں زیادتی لینے کو ربوٰا فرمایا گیا ہے۔

اور ایک حدیث میں جو آیا ہے لَا رِبٰوا اِلَّا فِی النَّسِیْئَۃِ (بخاری) یعنی ربوٰا صرف اُدھار میں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ حقیقی اور اصلی ربوٰا جس کو عام طور پر ربوٰا سمجھا جاتا تھا وہ اُدھا

پر نفع لینے کا نام ہے۔ اس کے سوا جتنی اقسام ہیں وہ اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں۔ اور وہ سب حکماً ربٰوا ہیں۔

ربٰوا کو اس حدیث میں اور دوسری احادیث میں ہلاکت خیز گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ آیات و احادیث میں اس پر سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ "سود" قابلِ دید ہے۔

(۵) پانچواں مہلک گناہ یتیم کا مال ناحق کھانا ہے۔ جس کی تفصیلات قریب ہی میں (۴۰۳) کے تحت آپ کے سامنے آچکیں۔

(۶) چھٹا خطرناک گناہ میدانِ جہاد سے بھاگنا ہے۔ الزَّحف (ف) آہستہ آہستہ چلنا، زانو یا سُرین پر گھسٹنا، چلنا۔ الزحف وہ بڑا لشکر جو دشمن کی طرف جائے۔ ج زُحُوف۔ یوم الزحف جنگ کا دن۔ شروعِ اسلام میں یہ حکم تھا کہ اگر مقابلہ میں دشمن دس حصہ زائد ہو تو بھاگنا جائز نہ تھا۔ مثلاً سو آدمی ہزار کے مقابلہ سے نہیں بھاگ سکتے تھے۔

قال تعالیٰ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

(اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو دشمنوں پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے۔

پھر اس ابتدائی حکم کو منسوخ کرکے اس کی جگہ پر قیامت تک کے لئے دوسرا حکم دیدیا گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ:

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

(اگر تم میں سے سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ خدا کے حکم سے دو ہزار پر غالب آجائیں گے۔

لہٰذا اگر کفار دوگنے ہوں تو ان کے مقابلہ سے بھاگنا حکمِ خداوندی کی صریح مخالفت اور گناہ کبیرہ ہے۔

ہاں اگر کفار دوگنے سے زائد ہوں تو ایسی صورت میں مقابلہ سے بھاگنا گناہِ کبیرہ نہیں۔

(۷) ساتواں مہلک گناہ کسی پاکدامن، بھولی، سیدھی ایمان والی عورت پر الزام لگانا ہے۔

(۱) کافرات پر تہمت لگانا کبیرہ گناہ نہیں ہے۔ ہاں ذمیہ پر تہمت لگانا گناہِ صغیرہ ہے۔ اور اس سے حدِ قذف واجب نہ ہوگی۔ (۲) ہاں مسلمان باندی پر تہمت لگانا گناہ ہے۔ لیکن حدِ قذف واجب نہ ہوگی۔ البتہ قاذف پر تعزیر کی جائے گی۔ (۳) فاسقہ مُعلنہ پر بھی تہمت لگانے سے حدِ قذف واجب نہ ہوگی۔ جو حکم نساء کا ہے وہی حکم رجال کا بھی ہے۔ لیکن اس حدیث میں مؤمنات کی تخصیص آیتِ

قرآنی کی رعایت سے کی گئی ہے۔ کیونکہ سورۂ نور میں ایک خاص واقعہ (افک) کی وجہ سے اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ میں مؤمنات ہی کا ذکر وارد ہوا ہے۔ گو مؤمنین و مؤمنات سب کا ایک ہی حکم ہے۔ البتہ یہاں حدیث میں آیت کے برخلاف لفظ الْمُؤْمِنَاتِ لفظ الْغٰفِلٰتِ سے مقدم ہے۔ اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بر ترتیب آیت بھی وارد ہے۔

(۴۰۶) یہ روایت کتب حدیث میں بہت طویل مذکور ہے۔ اس میں سے یہاں اس کا تھوڑا سا حصہ بیان کیا گیا ہے جس میں زانیوں اور سود خواروں کے عذاب کا ذکر ہے۔ مطلب ظاہر ہے۔ زانیوں کی حالت، ان کی بے حیائی اور شہوت کی آگ کی مظہر ہے۔ اور سود خواروں نے دنیا میں لوگوں کا خون چوسا تھا تو ان کی سزا بھی اسی انداز کی دی جا رہی ہے۔ جرم و سزا میں مناسبت بالکل ظاہر ہے۔

(۴۰۷) اٰکِلَ الرِّبٰوا ای اٰخِذَہٗ وَاِنْ لَّمْ یَاْکُلْ وَاِنَّمَا خُصَّ بِالْاَکْلِ لِاَنَّہٗ اَعْظَمُ اَنْوَاعِ الْاِنْتِفَاعِ وَکَذَا الْاِطْلَاقُ فِی الْمُحَاوَرَاتِ۔ وَمُوْکِلَہٗ ای معطیہ لمن یاخذہٗ وان لم یاکلہٗ۔ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ آکل و مُوکل دونوں کو برابر اس لئے کیا گیا کہ سود کا سلسلہ دونوں کی معاونت سے جاری ہوتا ہے۔ اسی لئے دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ گو لینے والے کا فائدہ ہوتا ہے اور دینے والے کا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حُدود و احکام کی ہر حال میں محافظت خواہ تنگی ہو یا فراخی، نفع ہو یا نقصان دونوں کا فرض تھا، مگر دونوں خدا کا حکم توڑنے میں برابر ہیں۔ اسلئے گناہ میں بھی دونوں برابر کے شریک ہیں۔

وَکَاتِبَہٗ وَشَاهِدَہٗ۔ اور کاتب و شاہد بھی چونکہ وہ سود خوار کے مُعین ہیں۔ اسلئے ان پر بھی لعنت کی گئی۔ اور گناہ میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ربوٰا کا لین دین حرام ہے اسی طرح اس کی کتابت اور اس پر شہادت بھی حرام ہے۔ لانہٗ اعانۃ علی الحرام والاعانۃ علی الحرام حرام۔

اَلْمَنْهِيَّاتُ

ممنوعات

(۴۰۸) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے ایمان والو! مرد مردوں کا مذاق نہ اڑائیں ہو سکتا ہے

عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ

کہ جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے

خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط بِئْسَ

کہ جن عورتوں کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ مذاق اڑانیوالیوں سے بہتر ہوں۔ اور اپنے آپ کو عیب نہ لگاؤ۔ اور ایک

الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام بھی برا ہے۔ اور جو توبہ نہ کریں گے تو وہ ظالم

الظّٰلِمُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ط

ہیں۔ اے ایمان والو زیادہ گمان سے بچتے رہو کیونکہ بعض گمان

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط

گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ نہ لگاؤ اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کرے۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا

کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اس سے تو تم

اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ○ (حجرات آیت ۱۱ و ۱۲)

گھن کروگے ہی۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول فرمانے والے بڑے مہربان ہیں۔

تشریح یہ سورۂ حجرات کی دو آیات ہیں۔ اس پوری سورت میں بیشتر آداب معاشرت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اور ایمان والوں کو بڑی بیش بہا ہدایات سے نوازا گیا ہے۔ ان سب کو ہم نے ایک مستقل رسالہ (آداب حیات) میں بیان کردیا ہے۔ ان دونوں آیات میں چھ عظیم الشان ہدایات ہیں جن کو بڑے اہتمام سے اہل ایمان کو خطاب فرماکر باندازِ نہی ذکر فرمایا ہے۔

(۱) مسلمان مرد اور عورتیں کسی کا استہزاء نہ کریں۔ (۲) کوئی کسی کو عیب نہ لگائے۔ (۳) ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔ (۴) لوگوں کے عیوب نہ ٹٹولو۔ (۵) بدگمانیوں سے بچو۔ (۶) کسی کی غیبت نہ کرو۔ ان چھ چیزوں کی پوری وضاحت ہم نے اپنے ایک رسالہ (قرآنی چھ باتیں) میں کردی ہے۔ تاکہ ان اہم ہدایات سے تمام مسلمان فائدہ اٹھائیں۔ آپسی تعلقات کو ہموار رکھیں۔ اور خطرناک گناہوں سے بچکر دارین میں کامیاب ہوں۔ حضرتِ مؤلف نے ان ہدایات کو اہتمام کیوجہ سے الگ الگ عنوانات میں بیان فرمایا ہے۔ اسلئے ہم بھی ان عنوانات کے تحت ہی مزید تشریحات پیش کریں گے (انشاء اللہ) مؤلف نے ان ہدایات کی وضاحت کرتے ہوئے چند مناسب عنوانات کا بھی اضافہ فرمادیا ہے۔ کما سیاتی۔

العبد
نسیم احمد غازی مظاہری

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ

لوگ دوسروں کا مذاق نہ بنائیں

(۴۰۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًى

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ (کے خطبہ) میں ارشاد فرمایا

أَتَدْرُوْنَ أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّ هٰذَا يَوْمٌ

کہ تم جانتے ہو یہ کونسا دن ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول ہی خوب جانتے ہیں فرمایا کہ یہ

حَرَامٌ أَفَتَدْرُوْنَ أَيُّ بَلَدٍ هٰذَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ قَالَ بَلَدٌ

محترم دن ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کونسا شہر ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول ہی خوب جانتے ہیں فرمایا

حَرَامٌ قَالَ أَتَدْرُوْنَ أَيُّ شَهْرٍ هٰذَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ قَالَ

کہ یہ محترم شہر ہے۔ فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ یہ کونسا مہینہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول زیادہ جاننے

شَهْرٌ حَرَامٌ قَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ

والے ہیں۔ فرمایا کہ یہ محترم مہینہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے تم پر تمہارے خونوں اور تمہارے مالوں اور تمہاری آبروؤں

كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا۔ (بخاری ص۲۳ مشکوٰۃ ص۲۳۳ بمعناہ عن ابی بکرۃ)

کو اسی طرح حرام فرما دیا ہے جیسے کہ یہ چیزیں تمہارے اس دن میں تمہارے اس مہینہ میں اور تمہارے اس شہر میں حرام ہیں۔

(۴۱۰) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَمْعَةَؓ قَالَ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عبداللہ بن زمعہؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ

أَنْ يَضْحَكَ رَجُلٌ مِمَّا يَخْرُجُ مِنَ الْأَنْفُسِ۔ (بخاری ص۸۹۳)

کوئی شخص اس چیز سے ہنسے جو آدمیوں میں سے نکلتی ہے۔

(۴۱۱) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کو صفیہ کی

مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا تَعْنِيْ قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً

ایسی ایسی صفت کافی ہے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ وہ ٹھگنی ہیں آپنے فرمایا کہ تم نے ایسی بات کہی کہ اگر اس کو

لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ۔ (ابوداؤد ص۳۲۲ مشکوٰۃ ص۴۱۲ ترمذی ص۲۲)

سمندر میں ملا دیا جائے تو وہ سڑ جائے۔

(۴۱۲) عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ الْمُجَاشِعِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عیاض بن حمار مجاشعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اَوْحٰی اِلَیَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰی لَا یَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ
کہ اللہ تعالیٰ نے میرے پاس یہ وحی بھیجی ہے کہ تم تواضع کیا کرو۔ اور کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی
وَلَا یَبْغِیْ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ۔ (ابوداؤد ص۳۲۳ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۷)
کسی پر ظلم کرے۔

(۳۱۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاهِلِیَّۃِ وَفَخْرَهَا بِالْاٰبَاءِ
اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت والی نخوت اور جاہلیت والا باپ دادوں پر فخر کرنا دور کر دیا ہے۔
اِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ اَوْ فَاجِرٌ شَقِیٌّ اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَ
اب تو بس متقی مؤمن ہے یا شقی بدکار ہے۔ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں ۔ اور آدم
اٰدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ۔ (ابوداؤد ص۳۵۰ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۸)
مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔

لغات

یَسْخَرُ (س) ہنسی کرنا، ٹھٹھا کرنا، (ف) بیگار لینا، ذلیل کرنا، مغلوب کرنا۔ فَخَرَ (ن) ملانا۔ بصلۂ علیٰ اُبھارنا، متغیر کرنا، لَا یَفْخَرُ (ف) فخر کرنا، بڑا بننا، (س) ننگ سمجھنا، عار کرنا، ناک چڑھانا، تکبر کرنا، بڑائی ظاہر کرنا۔ اَلْفَخْرُ فضیلت، بڑائی۔ عُبِّیَّۃ نخوت، فخر، غرور، تکبر۔ عَبَّ عَبًّا (ن) تغیر کے بعد چہرے کا خوبصورت ہونا، جانوروں کی طرح منہ لگا کر پانی پینا۔ بلند ہونا۔

تشریح

علامہ قرطبیؒ نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سُخریہ اور تمسخر اور استہزاء کہتے ہیں۔ اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے اسی طرح ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اُس کی نقل اُتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ اور اس طرح بھی کہ اس کا کلام سُنکر بطور تحقیر ہنسی اُڑائی جائے۔ بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ کسی شخص کا خود اس کے سامنے ایسی طرح ذکر کرنا کہ اس سے لوگ ہنس پڑیں۔ سُخریہ اور تمسخر کہلاتا ہے۔ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ الخ میں اسی کی ممانعت کی گئی ہے۔ تمسخر کی ممانعت کا قرآنِ پاک نے اتنا اہتمام فرمایا کہ اس میں مردوں کو الگ مخاطب فرمایا اور عورتوں کو الگ۔ مردوں کو لفظ قوم سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ دراصل یہ لفظ مردوں ہی کے لئے

وضع کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجازاً و توسعاً عورتوں کو بھی اکثر شامل ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کریم نے لفظِ قوم عموماً مردوں، عورتوں دونوں ہی کے لئے استعمال کیا ہے۔ مگر یہاں لفظِ قوم خاص طور پر مردوں کیلئے ہے کیونکہ مقابلہ میں عورتوں کا ذکر لفظِ نساء سے فرمایا گیا ہے۔ اور مستقل طریقہ پر دونوں کو ہدایت فرمائی کہ مردوں کو مردوں پر نہ ہنسنا چاہیئے۔ کیونکہ جو مرد کسی دوسرے مرد پر ہنس رہا ہے اس کو کیا معلوم کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک اس استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو۔ اسی طرح عورتوں کو دوسری عورتوں پر نہ ہنسنا چاہیئے۔ ہنسنے والی کو کیا خبر ہے کہ میں جس پر ہنس رہی ہوں اللہ کے نزدیک شاید وہ مجھ سے زائد مقبول و محبوب اور بہتر ہو۔ اس آیت میں مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کیساتھ استہزاء و تمسخر کرنے کی ممانعت تو معلوم ہو گئی۔ حالانکہ کسی مرد کا عورت کے ساتھ اور کسی عورت کا مرد کے ساتھ استہزاء کرنا بھی اسی ممانعت و حرمت میں داخل ہے۔ مگر ان دونوں صورتوں کا صراحۃً ذکر نہ کر کے اس طرف اشارہ فرما دیا گیا کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً مذموم و ممنوع ہے۔ چہ جائیکہ استہزاء و تمسخر کی نوبت آئے۔ یعنی یہ دو صورتیں استہزاء کی اہلِ ایمان میں ہو نہیں سکتیں۔ کیونکہ اس کی بنیاد (اختلاط) ہی سرے سے ختم کر دی گئی ہے۔ پھر ان مذکورہ دو صورتوں سے غیر مذکورہ دونوں صورتوں کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔ کہ جب مردوں کا آپس میں استہزاء اور عورتوں کا آپس میں استہزاء حرام ہوا تو کوئی مرد کسی عورت سے استہزاء و تمسخر کرے تو یہ حرام ہونے کے علاوہ شرافت سے بھی گری ہوئی حرکت ہے۔ اسی طرح کسی عورت کا کسی مرد سے استہزاء کرنا پست حرکت کے علاوہ بے حیائی کی بات بھی ہے۔ بہرحال کیونکہ صاحبِ ایمان کا اکرام و احترام واجب ہے۔ اور استہزاء و تمسخر اکرامِ مؤمن کے خلاف اور اس کی تحقیر و توہین اور تذلیل ہے۔ اسلئے وہ حرام ہے۔ خواہ استہزاء کرنے والا مرد ہو یا عورت ہو۔ اور استہزاء خواہ مرد کا کیا جائے یا عورت کا۔

استہزاء و تمسخر اکرامِ مؤمن کے خلاف ہونے کے علاوہ استہزاء و تمسخر کرنے والے کے تکبّر و غرور کی دلیل و علامت بھی ہے۔ کہ وہ خود کو اپنے مؤمن بھائی سے بہتر سمجھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے قلب میں ذرّہ برابر تکبّر ہو گا وہ جنت میں نہ جائے گا۔ پھر اس حرکت سے معاشرہ خراب ہوتا ہے، آپس کی محبت ختم ہو جاتی اور باہمی نفرت و عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض مرتبہ تمسخر و استہزاء ایسے فساد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جان و مال اور آبرو کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ بظاہر تمسخر معمولی سی حرکت ہے مگر دین و دنیا کی تباہی کے لئے یہ حرکت ہی بہت کافی ہے۔

اس آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ الخ کو سُنکر سلفِ صالحین کا یہ حال ہو گیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں

اور اسپر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں۔
صحیح مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی صورتوں اور ان کے مال و دولت پر نظر نہیں فرماتے، بلکہ وہ ان کے قلوب و اعمال کو دیکھتے ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث سے ایک ضابطہ معلوم ہوا کہ کسی شخص کے معاملہ میں اس کے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگا دینا درست نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری اعمال و افعال کو ہم اچھا سمجھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ جو اسکے باطنی حالات و قلبی کیفیات سے خوب باخبر ہے وہ اس کے نزدیک برا ہو۔ اور جس کے ظاہری احوال و اعمال برے ہوں ہوسکتا ہے کہ باطنی و قلبی اچھے حالات و کیفیات اسکے ظاہری اعمال بد کا کفارہ بن جائیں۔ اسلئے جس کو برے حالات یا برے اعمال میں مبتلا دیکھو تو اسکے ان برے حالات کو تو برا سمجھو مگر اس شخص کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔ پھر اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے۔ اور اس کا علم کسی کو نہیں کہ کس کا خاتمہ کیسا ہوگا۔ تو اس دنیا میں کسی کے متعلق کیا خبر کہ وہ انجام کے اعتبار سے اچھا ہے یا برا ہے۔

(۴۰۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر منیٰ میں جو خطبہ دیا اس میں اسپر خاص تنبیہ فرمائی چنانچہ صحابہؓ سے سوالات فرمائے کہ یہ کونسا دن ہے۔ یہ کونسا مہینہ ہے۔ اور یہ کونسا شہر ہے۔ صحابہؓ نے ہر سوال پر خیال کیا کہ شاید آپ آج کے دن کا، اس ماہ کا، یا شہر مکہ کا نام بدل دینا چاہتے ہیں اسی لئے ہر سوال کے جواب میں عرض کیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ لیکن آپنے ان تینوں کی عظمت و فضیلت اور اہمیت کا اظہار فرما کر صحابہؓ کے اذہان میں اس کا استحضار کرایا اور فرمایا کہ جس طرح آج کے اس مبارک دن، عظمت والے مہینے اور امن و امان والے شہر مکہ میں تمہاری جانوں تمہارے مالوں اور تمہاری آبروؤں کی حرمت ہے، اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ نے ہمیشہ کے لئے ان چیزوں کو تمہارے اوپر حرام فرما دیا ہے۔

(۴۱۰) امام بخاریؒ نے یہ حدیث باب قول اللہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ میں ذکر فرمائی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جو چیز انسانوں کے بدن سے خارج ہوتی ہے اسپر نہ ہنسو۔ کیونکہ اس میں سب ہی یکساں ہیں۔ مثلاً کسی کی ریح خارج ہو جائے تو اسپر نہ ہنسا جائے۔ کیونکہ وہ تو سب ہی سے سرزد ہوتی ہے۔ مَا يَخْرُجُ مِنَ الْأَنْفُسِ کے الفاظ ہر خارج ہونے والی چیز کو عام ہیں خواہ وہ ناک یا منہ سے خارج ہو یا پیشاب پائخانہ کے مقام سے۔ کیونکہ اس ہنسنے میں استہزاء و تمسخر اور اپنے بھائی کی تحقیر ہے۔ اسلئے اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

(۴۱۱) مشکوٰۃ شریف کے تمام نسخوں میں یہی الفاظ ہیں۔ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا۔

لیکن صحیح حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ اَنَّهَا كَذَا وَكَذَا ، ہے۔ ترمذی میں ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ حَكَيْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا فَقَالَ مَا يَسُرُّنِي اَنِّي حَكَيْتُ رَجُلًا وَاَنَّ لِي كَذَا وَكَذَا قَالَتْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَفِيَّةُ امْرَاَةٌ وَقَالَتْ بِيَدِهَا هٰكَذَا كَاَنَّهَا تَعْنِي قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ مَزَجْتِ بِكَلِمَةٍ لَوْ مُزِجَ بِهَا مَاءُ الْبَحْرِ لَمُزِجَ۔ (ص ۲۴)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے کسی شخص کی بات نقل کی تو آپنے فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں کسی شخص کی بات نقل کروں یا نقل اتاروں اگرچہ مجھے دنیا کی اتنی اتنی دولت مل جائے فرماتی ہیں کہ پھر میں نے کہا یا رسول اللہ صفیہ ایک ایسی عورت ہیں اور ہاتھ سے اشارہ کر دیا یعنی وہ ٹھنگنی ہیں۔ تو آپنے فرمایا کہ تم نے یہ ایسی بات کہی کہ اگر سمندر کے پانی میں اسکو ملا دیا جائے تو وہ بھی متغیر (وفاسد) ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ بات غیبت ہوئی۔ اور غیبت اتنی خراب گندی اور قابل نفرت چیز ہے کہ اگر اس کو پانی میں ملایا جا سکتا اور سمندر کے پانی میں اس کو ملا دیا جاتا تو سمندر میں پانی کی کثرت کے باوجود سمندر کا سارا پانی سڑ جاتا۔

حضرتِ عائشہؓ کے قول میں بھی حضرتِ صفیہؓ کی تحقیر و توہین اور ان کا تمسخر تھا۔ اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول کی مذمت فرمائی۔ اور اماں جان کو زبردست تاکید و تنبیہ فرمائی۔ اور بتا دیا کہ تم تو اس کو معمولی بات سمجھ رہی ہو مگر واقعۃً اس میں بہت ہی بُرائی ہے۔ اور کہتے وقت حضرتِ عائشہؓ کی توجہ اس طرف نہ پہونچی تھی اسلئے ایسا کلمہ فرما دیا تھا۔ اس تنبیہ کے بعد پھر کبھی ایسی بات نہیں فرمائی۔

(۴۱۲) حضرتِ عیاض بن حمارؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرانے دوست تھے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے میرے پاس وحی کے ذریعہ یہ حکم بھیجا ہے کہ تم تواضع اختیار کرو یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر نہ سمجھو۔ اور کوئی کسی پر فخر نہ کرے والفخر ادعاء العظمۃ والکبر والشرف لنفسہ (یعنی فخر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے لئے بڑائی اور بلندی کا دعویٰ کرے) اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ فخر و بغی دونوں چیزیں تکبر کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ متکبر ہی اپنے آپ کو سب کے مقابلہ میں بلند کرتا ہے۔ اور کسی کی اطاعت کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور تواضع اس مرض کبر کا علاج بالضد ہے۔ یعنی خود کو چھوٹا اور دوسروں کو اپنے آپ سے بڑا اور بہتر سمجھے۔ اس روایت کی پوری تفصیل جزءِ ثانی میں عنوان "ومنها التواضع" کے تحت نمبر (۲۹۱) کی تشریح میں گذر چکی ہے۔

(۴۱۳) یہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ:

لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ يَفْتَخِرُوْنَ بِآبَائِهِمْ — لوگ اپنے باپ دادوں پر فخر کرنے سے بالکل باز آجائیں

اَلَّذِیْنَ مَاتُوْا اِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِّنْ جَهَنَّمَ اَوْ لَيَكُوْنَنَّ اَهْوَنَ عَلَى اللهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِيْ يُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِاَنْفِهٖ اِنَّ اللهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْاٰبَاءِ اِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ اَوْ فَاجِرٌ شَقِيٌّ اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْا اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔

(رواه الترمذی وابوداؤد مشکوٰۃ ص۴۱۸)

جو مر گئے ہیں۔ کیونکہ وہ تو جہنم کا کوئلہ ہو گئے ہیں۔ ورنہ وہ پاخانہ کے اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے جو اپنی ناک سے غلاظت لڑھکاتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور زمانۂ جاہلیت کے باپ دادوں پر فخر کو دور کر دیا ہے۔ اب آدمی دو ہی قسم کے ہیں، یا تو ایماندار پرہیزگار یا بدکار، بدنصیب سارے انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدمؑ مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔

باپ دادوں پر گھمنڈ اور نسب پر جو ایک غیر اختیاری چیز ہے غرور عقلاً و شرعاً انتہائی مذموم ہے خصوصاً جبکہ باپ دادا کفار و نابکار ہوں۔ پھر تو ان پر مؤمن کو فخر کرنا انتہائی گھناؤنی حرکت ہے۔ مسند احمد میں ابو ریحانہؓ سے مرفوع روایت ہے:

مَنِ انْتَسَبَ اِلٰى تِسْعَةِ اٰبَاءٍ كُفَّارٍ يُرِيْدُ بِهِمْ عِزًّا اَوْ كَرَمًا كَانَ عَاشِرَهُمْ فِي النَّارِ۔

(جو شخص نو کافر باپ دادوں کی طرف اپنی نسبت عزت و کرم کی بنیاد پر کرتا ہے تو وہ خود دسواں دوزخی ہے)

اَوْ لَيَكُوْنَنَّ الخ اور اگر فخر بالآباء سے باز نہ آئیں گے تو اللہ کے نزدیک وہ گوہ کے کیڑے کی طرح ذلیل و حقیر ہو جائیں گے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی آباء و اجداد پر فخر کرنیوالوں کو جُعل (گوہ کے کیڑے) سے تشبیہ دی ہے۔ اور ان کفار آباء کو غلاظت و گندگی سے، اور ان پر فخر کرنے کو ناک سے غلاظت ڈھکیلنے سے۔ حاصل یہ ہوا کہ دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی۔ یا تو فخر بالآباء سے باز آجائیں یا اللہ کے نزدیک جعل کی طرح ذلیل و خوار ہو جائیں (جُعل بضم الجیم وفتح العین ایک سیاہ رنگ کا کیڑا ہوتا ہے جو غلاظت کی گولیاں بنا کر اپنی تھوتڑی سے ڈھکیلتا ہے۔ اس کو خنفسار بھی کہتے ہیں۔ اَلْخِرَاء گندگی، غلاظت، نجاست، اس کی خاء پر ضمہ، فتحہ اور کسرہ تینوں طرح اور اسکی راء کو مقصورہ وممدودہ دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں)

اِنَّ اللهَ الخ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ افتخار بالآباء سے باز آنے کا حکم کیوں ہے؟ تو آپنے فرمایا کہ یہ عادت زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کی ہے جس کی بنیاد جہالت تھی۔ اب اسلام آچکا اور جاہلیت کی رسوم اور جہالت کی تاریکیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اور اس نے جاہلانہ غرور کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔

(عُبِّيَّة بضم العین وکسرها وکسر الباء وتشدید الباء والیاء عند المحدثین کما فی الذرية وهو ماخوذ من العبء بمعنى الحمل الثقيل قاله ابوعبيدة الهروی وقال الازهری هو ماخوذ

من العبءُ وهو النور والضياء يقال هٰذا عبءُ الشمس واصلهٗ عبءُ الشمس وصاحب القاموس والجوهری ادخلاه فی باب المضاعف معناه الفخر والنخوة والكبر)

اِنَّمَا هُوَ یعنی وہ آبار پر فخر کرنے والا دو حال سے خالی نہیں، یا تو مومن تقی ہے۔ اور فخر و غرور اسکی شان کے خلاف ہے۔ پھر متقی کون ہے۔ اس کا اصل علم اللہ کو ہے قال تعالیٰ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی۔ یا وہ بدکار (کافر منافق یا فاسق) ہے جس کو سعادت میسّر نہیں۔ تو وہ اللہ کے نزدیک خود ذلیل و خوار ہے۔ اور جو خود ذلیل ہے اس کو تکبّر کرنا بے جا اور غیر مناسب ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مخلوق کو کسی حال میں تکبّر کا حق نہیں۔ کبر تو خالقِ کائنات ہی کے لائق ہے۔ جیساکہ حدیثِ قدسی میں ہے اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ (یعنی کبر و عظمت میری مخصوص صفات ہیں جو ان میں چھینا جھپٹی کریگا تو میں اُس کو ہلاک کر دونگا)

اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ الخ یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر و غرور کے مذموم ہونے کی دوسری علّت بیان فرمائی کہ سارے انسان ایک باپ (آدم) کی اولاد ہیں۔ تو سب برابر ہوئے۔ ایک باپ کی اولاد کا ایک دوسرے کو حقیر و ذلیل سمجھنا عقلاً و عرفاً بھی معیوب ہے۔ پھر ذوات میں سب ایکدوسرے کے برابر اور بھائی ہیں۔ اور صفات عارضی چیزیں ہیں۔ انجام کا علم نہیں۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَهِیَ مَخْفِيَّةٌ فَالْخَوْفُ اَوْلٰی لِلسَّالِكِ مِنَ الْاِشْتِغَالِ بِهٰذِهِ الْمَسَالِكِ۔ اور حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا کیئے گئے ہیں۔ اور مٹی کے مزاج میں سرافگندگی و تواضع ہے۔ لہٰذا جو خاک کے پتلہ سے پیدا ہوئے اُن میں بھی تواضع ہونی چاہیئے۔ کہ یہی ان کی فطرت کا تقاضا ہے ؎

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءُ	اَبُوْهُمْ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ
سارے انسان صورت میں برابر ہیں۔	ان کے باپ آدم اور ماں حوا ہیں
فَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمْ فِیْ اَصْلِهِمْ شَرَفٌ	يُفَاخِرُوْنَ بِهٖ فَالطِّيْنُ وَالْمَاءُ
پھر ان کی اصل میں کوئی ایسا شرف ہے جس پر	وہ فخر کریں تو سوچ لو کہ وہ مٹی اور پانی ہے

لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ

اور اپنے آپ کو عیب نہ لگاؤ

(۱۴۱) عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ اعْتَلَّ بَعِيْرٌ لِّصَفِيَّةَ وَعِنْدَ زَيْنَبَ

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت صفیہ کا اونٹ بیمار ہوگیا اور حضرت زینب کے

فَضْلُ ظَهْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِزَيْنَبَ

پاس فالتو سواری تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے فرمایا

اَعْطِيهَا بَعِيْرًا فَقَالَتْ اَنَا اُعْطِي تِلْكَ الْيَهُوْدِيَّةَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

کہ صفیہ کو ایک اونٹ دیدو۔ انہوں نے کہا (ہاں) میں دوں گی اس یہودیہ کو۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَجَرَهَا ذَا الْحِجَّةِ وَالْمُحَرَّمَ وَبَعْضَ صَفَرٍ۔

ناراض ہوگئے۔ پھر اُن کو ذی الحجہ محرم اور صفر کے بعض حصے میں (دو ماہ سے زائد) چھوڑا۔ (مشکوٰۃ ۴۲۹)

(۴۱۵) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت سعید بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اِنَّ اَرْبَى الرِّبٰوا الْاِسْتِطَالَةُ فِي عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ (ابوداود ۳۳/۲۷ مشکوٰۃ ۴۲۹)

بدترین سود مسلمان کی آبرو میں ناحق زبان درازی کرنا ہے۔

تشریح لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ لفظ لمز کے معنی (دن حق) عیب لگانا۔ آنکھ سے اشارہ کرنا۔ طعنہ زنی کرنا ہیں۔ یہ جملہ لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہے لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو) دونوں جگہ مطلب یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کے عیب ظاہر نہ کرو۔ اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ اس انداز سے فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا ایک طرح پر اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مقتول کے حمایتی قاتل کو قتل کر ہی دیتے ہیں۔ اور اسلامی حکومت میں تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے۔ تو قاتل اپنے قتل کا خود سبب بنا۔ اسلئے گویا اس نے دوسرے کو قتل کرکے خود کو قتل کیا۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی صورت نہو تو دراصل مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا اپنے آپ کو قتل کرنا اور خود کو بے سہارا اور بے دست و پا بنانا ہے۔ اسی طرح اس آیت لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ کے معنی یہ ہیں کہ تم دوسروں کے عیب ظاہر کروگے اور ان کو طعنے دوگے تو جواباً تمہارے عیوب بھی ظاہر کیئے جائیں گے اور تم مطعون ہوگے۔ تو گویا خود اپنے عیبوں کے اظہار اور مطعون ہونے کا ذریعہ بننے کی وجہ سے تم خود اپنے آپ کو عیب لگانے والے قرار پائے۔ اور اگر اس شخص نے صبر کرلیا جس کو عیب لگایا، طعنہ دیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی توہین و تذلیل اور بدنامی خود اپنی ہی بے عزتی ہے۔ حکماء کا مقولہ ہے ابصر الناس من کان بعیبہ بصیرًا وعن عیب غیرہ ضریرًا (سب سے بڑا عاقل وہ ہے جس کے سامنے اپنے عیوب ہوں اور دوسروں کے عیوب نہوں)

ہندوستان کے آخری تاجدار شاہ ظفر نے فرمایا ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنے عیبوں پہ جب نظر، تو جہاں میں کوئی بُرا نہ رہا

(۴۱۴) اِعْتَلَّ بتشدید اللام ای مرض۔ فضل ظهر ای مرکب فاضل عن حاجتها۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب کا اونٹ بیمار ہوگیا ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش کے پاس ایک اونٹ اُن کی ضرورت سے زائد تھا۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے فرمایا کہ صفیہؓ کو اونٹ کی ضرورت ہے تم اپنا اونٹ ان کو سواری کیلئے دیدو۔ تو حضرت زینبؓ نے اس غیرت کی بنا پر جو ایک سوکن کو دوسری سے ہوتی ہے فرمایا انا اعطی تلك الیهودیة (بتقدیر همزة الاستفهام الانکاری ولعل حذف المفعول لافادة العموم مبالغة فی النفی ای انا لا اعطیها شیئًا) یعنی ہاں میں دوں گی اس یہودیہ کو۔ اور ان کو یہودیہ اسلئے فرمایا کہ وہ حضرت ہارونؑ کی نسل میں سے تھیں۔ اور حضرت زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان عالیشان کی تھیں۔ آپ کی پھوپھی اُمیہ بنت عبد المطلب کی صاحبزادی تھیں تو اس قول کے وقت غیرت کے علاوہ اپنی عالی نسبی بھی پیش نظر تھی۔ پھر حضرت زید بن حارثہؓ کے ان کو طلاق دینے کے بعد ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح عرش پر ہوا۔ حق تعالےٰ شانہٗ خود ہی ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنے والے ہیں۔ ان سب وجوہات وخصوصیات کی بنا پر فرمادیا۔

انا اعطی تلك الیهودیة۔ مگر اس میں غیر شعوری طور پر اپنی برتری اور دوسری مؤمنہ کی عیب جوئی اور تحقیر تھی۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے ناراض ہوگئے، اور ڈُوماہ سے زائد انکو چھوڑے رکھا۔ یہ ناراضگی اونٹ نہ دینے کی وجہ سے نہ تھی۔ اگرچہ آپ کے ارشاد کے بعد انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ تاہم ناراضگی کی وجہ ان کا یہ قول ہی ہے۔ جس سے حضرت صفیہ کی تحقیر اور ان کی عیب جوئی لازم آرہی تھی۔ اب رہا یہ اشکال کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کو تین دن سے زائد چھوڑنے کی یعنی اس سے اَن بَن کی اجازت نہیں دی۔ ارشاد ہے لا یحل لمسلم ان یهجر اخاه فوق ثلٰث فمن هجر فوق ثلٰث فمات دخل النار۔ (مشکوٰۃ ص۴۲۸) (کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زائد چھوٹ چھٹاؤ رکھے۔ اور جو تین دن سے زائد اَن بَن رکھے پھر مرجائے تو وہ دوزخ میں جائے گا)

اس کا حل یہ ہے کہ وعید اس چھوٹ چھٹاؤ پر ہے جو نفسانیت اور بغض وکینہ کی وجہ سے ہو۔ لیکن اگر زجر و تادیب اور اصلاح کے لئے ہو جیساکہ اس مذکورہ واقعہ میں ہے تو کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح اگر للّٰہیت سے ہو، مثلاً کسی کی بددینی وغیرہ کی وجہ سے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ کسی سے ناراضگی اور چھوٹ چھٹاؤ شرعاً ضروری بھی ہوجاتا ہے۔

(۴۱۵) اَرْبَی الرِّبٰوا سود کی قسموں میں سب سے زیادہ وبال اور گناہ والی قسم یعنی سود جیسی لعنت والی چیز سے بدترین چیز کسی مسلمان کی ناحق آبروریزی کے لئے زبان درازی کرنا ہے۔ مناسبت دونوں میں یہ ہے

کہ انسان کے پاس عزیز ترین نعمتیں دو ہیں۔ ایک مال دوسرے آبرو۔ اور آبرو مال سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ سود میں آدمی کا مال ناحق لیا جاتا اور برباد کیا جاتا ہے۔ اور انسان کی توہین و تحقیر کے لئے ناحق زبان درازی سے اس کی آبرو کو جو مال سے بھی عزیز ترین ہے ضائع کیا جاتا ہے، اسلئے یہ حرکت سود سے بھی بدترین ہوگی۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ سود خوار دوسرے سے مال کو ناحق لیکر اپنا مال بڑھاتا ہے، اسی طرح آبرو ریزی کرنے والا دوسروں کو ذلیل کرکے اپنی عزت بڑھانا چاہتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عرض (عزت و آبرو) شرعًا اور عقلاً مال سے زیادہ عزیز اور عظیم القدر ہے۔ اسی لئے شریعت نے آبرو ریزی اور ہتک عزت کی سزائیں سخت رکھی ہیں۔ یہاں تک کہ ہتک عزت کی ایک سزا رجم یعنی سنگسار کرکے مار ڈالنا بھی ہے (جبکہ بحالت احصان زنا کا صدور ہو) اور مال کے چرانے کی سزا قطعِ ید ہے۔ اور ڈکیتی کی ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹنا ہے۔ اس سے آگے قتل تک نوبت نہیں پہنچی۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے ؎

اصون عرضی بمالی لا ادنسہ ❊ لا بارك الله بعد العرض فی المال

(میں اپنی عزت اپنے مال کیذریعہ محفوظ رکھتا ہوں اور اسکو خاک میں نہیں ملاتا آبرو چلے جانے کے بعد خدا مال میں برکت نہ دے۔)

حدیث میں بغیر حق کی قید احترازی ہے۔ بعض اوقات ہتک عزت مباح یا ضروری بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً ظالم کے ظلم کو بیان کرنا اور مجرم کو سزا دینا وغیرہ۔ یہ ہتکِ عزت اور آبرو ریزی ہے مگر ناحق نہیں۔

اُمّ المؤمنین حضرتِ صفیہؓ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ، حیی بن اخطب یہودی کی بیٹی کنانہ بن ابی الحقیق کی بیوی، اللہ کے نبی موسٰی علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کی نسل میں سے تھیں۔ ۷ھ میں خیبر کے دن ان کا شوہر کنانہ قتل ہوگیا تھا۔ اور حضرتِ صفیہ گرفتار شدہ لوگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے لئے منتخب فرمایا۔ ایک قول کے مطابق مجاہدین کے درمیان جب مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو حضرت صفیہؓ حضرت دحیۃ الکلبی صحابی کے حصہ میں آگئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان سے سات اروس میں خرید لیا اور آزاد فرما کر ان سے نکاح کرلیا تھا اور ان کا عتق ہی ان کا مہر قرار پایا تھا۔ ۵۰ھ میں وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔ رضی اللہ عنہا حضرت انسؓ و حضرتِ ابن عمرؓ وغیرہ نے ان سے احادیث نقل کیں۔

(حیی بضم الحاء المهملة وفتح الياء المشددة۔ واخطب بفتح الهمزة وسكون الخاء وفتح الطاء والباء الموحدة)

(الاکمال)

اُمّ المؤمنین حضرتِ زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا

اُمّ المؤمنین حضرتِ زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کی والدہ اُمیمہ بنت عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّلاً ان کا نکاح اپنے مولیٰ و متبنّیٰ حضرتِ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کرا دیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرتِ زید نے ان کو طلاق دیدی۔ تو ۵ھ میں ان کا نکاح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ ان کا اصل نام برّہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر ان کا نام زینب رکھدیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ازواجِ مطہرات میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی۔ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے بارے میں فرمایا کہ:

لم تکن امرأۃ خیرًا منھا فی الدّین واتقیٰ لِلّٰہِ واصدق حدیثًا واوصل للرّحم و اعظم صدقۃً واشد تبذّلًا لنفسھا فی العمل الّذی یتصدق بہ ویتقرب الی اللہ تعالیٰ۔

(دین میں ان سے زیادہ بہتر، اللہ سے زیادہ ڈرنیوالی بات میں زیادہ سچی، صلہ رحمی زیادہ کرنیوالی، زیادہ صدقہ دینے والی، اور صدقہ دینے اور اللہ کی نزدیکی و ثواب حاصل کرنیکے کام میں زیادہ محنت کرنیوالی ان سے بڑھکر کوئی عورت نہ تھی)

تریپن ۵۳ برس کی عمر پاکر ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ان سے اُمّ المؤمنین حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا و اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا وغیرہ نے احادیث روایت کی ہیں۔ خلاصہ میں ہے کہ ان سے گیارہ احادیث منقول ہیں۔ ان کی دو حدیثیں امام بخاری رحمہ اللہ و امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیں (اور باقی دیگر محدثین نے)۔

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ

اور ایک دوسرے کو بُرے القاب سے نہ پکارا کرو۔

(۴۱۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرَ فَنَادٰی بِصَوْتٍ رَّفِیْعٍ یَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یُفْضِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِہٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تُعَیِّرُوْھُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنْ یَّتَّبِعْ عَوْرَۃَ اَخِیْہِ الْمُسْلِمِ یَتَّبِعِ اللّٰہُ

حضرتِ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکار کر فرمایا اے ان لوگوں کی جماعت جو صرف اپنی زبان سے اطاعت کا اظہار کر رہے ہیں اور ان کے قلب تک ایمان نہیں پہونچا تم مسلمانوں کو اذیت نہ پہونچاؤ اور ان کو شرم نہ دلاؤ۔ اور ان کے عیبوں کے پیچھے نہ پڑو۔ کیونکہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیبوں کے پیچھے پڑیگا تو اللہ تعالیٰ بھی

عَوْرَتَهُ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يُفْضِحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهِ -

اسکے عیب کے پیچھے پڑ جائیگا اور اللہ تعالیٰ جسکے عیب کے پیچھے پڑ گیا تو اس کو رسوا کردیگا چاہے وہ اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہو۔

قَالَ وَنَظَرَ ابْنُ عُمَرَ يَوْمًا اِلَى الْبَيْتِ اَوْ اِلَى الْكَعْبَةِ فَقَالَ اَعْظَمَكِ

راوی (نافع) نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دن کعبہ شریف کو دیکھ کر فرمایا تو کتنی عظمت والا ہے۔ تیری عزت

وَاَعْظَمَ حُرْمَتَكِ وَالْمُؤْمِنُ اَعْظَمُ حُرْمَةً عِنْدَ اللّٰهِ مِنْكِ -

کس قدر عظیم ہے۔ اور مومن کی عزت اللہ کے نزدیک تجھ سے بڑھ کر ہے۔ (ترمذی ص۲۴ج۲ و مشکوٰۃ ص۴۲۹ الی جوف رحلہ فقط)

تشریح

آیت شریفہ کا تیسرا جزء وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ہے۔ تَنَابُزُ نبز سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں بُرا لقب، عیب اور کینہ عادت کے۔ مجرد میں باب ضرب سے بمعنی بُرا لقب دینا۔ عیب لگانا۔ تَنَابَزَ تفاعل سے ایک دوسرے کو بُرا لقب دینا، ایک دوسرے کو عار دلانا۔ اس میں کسی کو ایسے لقب سے پکارنے کی ممانعت کی گئی ہے جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ جیسے کسی کو لنگڑا، گنجا یا اندھا کہکر پکارنا۔ یا ایسے نام سے پکارنا جو اس کی تحقیر کیلئے استعمال کیا جاتا ہو۔ حضرت ابوجبیرہ انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ہم میں سے اکثر آدمیوں کے دو دو اور تین تین نام مشہور تھے۔ اور ان میں سے بعض نام ایسے تھے جو لوگوں نے عار دلانے اور توہین و تحقیر کیلئے مشہور کر دیئے تھے۔ آپ کو یہ معلوم نہ تھا۔ اسلئے بعض اوقات وہی چڑ والا نام لیکر آپ کسی کو پکارتے تو صحابہؓ عرض کرتے یا رسول اللہ یہ تو اس کی چڑ ہے۔ اس نام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اس میں ایسے نام رکھنے اور ایسے ناموں سے پکارنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تَنَابُزْ بِالْاَلْقَابِ سے مراد یہ ہے کہ کسی نے کوئی گناہ یا کوئی بُرا عمل کیا اور پھر وہ اس سے تائب ہوگیا اس کے بعد بھی اسکو اُس بُرے عمل کے نام سے پکارا جائے مثلاً کسی کو چور، شرابی، زانی وغیرہ کہہ کر پکارا جائے جبکہ اُس نے اِن گناہوں سے توبہ کرلی ہو۔ توبہ کے بعد پچھلے گناہوں پر عار دلانا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس سے اس نے توبہ کرلی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمّہ لیا ہے کہ اس کو اسی گناہ میں مبتلا کرکے دنیا و آخرت میں رسوا کریگا۔ (معارف القرآن ص۱۱۱ج۸)

بعض القاب کا استثناء

بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہوجاتے ہیں جو بُرے ہیں۔ مگر وہ اس کے بغیر پہچانا ہی نہیں جاتا۔ تو ایسے شخص کو اس بُرے نام سے پکارنا باتفاق علماء جائز ہے۔ بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اسکی تحقیر و تذلیل

کا نہو۔ جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب وغیرہ مشہور ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو جن کے ہاتھ کچھ لمبے تھے ذوالیدین کے نام سے تعبیر فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا گیا کہ اسانید حدیث میں بعض ناموں کے ساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں جیسے حمید الطویل، سلیمان الاعمش، مروان الاصفر وغیرہ تو کیا ان حضرات کو ان القاب کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے؟ فرمایا کہ جب تمہارا قصد عیب بیان کرنے کا نہو، بلکہ اس کی پہچان پوری کرانے کا ارادہ ہو تو جائز ہے

اچھے القاب سے پکارنا سنت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک مومن کا حق دوسرے مومن پر یہ بھی ہے کہ اس کو ایسے نام اور لقب سے پکارا جائے جو اس کو زیادہ پسند ہو۔ اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا ہے۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کو القاب دیئے ہیں۔ مثلاً حضرتِ ابوبکر کو صدیق اور عتیق، حضرت عمر کو فاروق حضرت حمزہ کو اسد اللہ، حضرت خالد بن ولید کو سیف اللہ فرمایا ہے۔ (معارف ص۱۱۸/۸۷)

(۲۱۶) اس حدیثِ پاک میں ایسی تمام چیزوں پر ہمہ گیر تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ کہ جس سے مسلمانوں کو اذیت پہونچے وہ کام نہ کیا جائے، ان کی عیب جوئی نہ کی جائے۔ جو دوسروں کی عیب جوئی کریگا خُدا اسکو گھر بیٹھے رُسوا کر دے گا۔ اور اس حرکت کو ان لوگوں کی عادت قرار دیا جو صرف زبان سے اِسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ان کے قلب میں ایمان نہیں ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ایذا دینا اور ان کے عیوب تلاش کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ بلکہ منافقوں، فاسقوں اور بے ایمانوں کا کام ہے۔ آپنے اس امر پر تنبیہ کرنے کا ایسا زبردست اہتمام فرمایا کہ منبر پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے اس بات کو فرمایا تاکہ سب لوگ اس کو اچھی طرح سُن لیں اور خوب سمجھ لیں۔

ولم یفض الی قلبہ سے مراد منافقین ہیں۔ اور بظاہر فاسقین بھی اس میں داخل ہیں۔ کیونکہ انکے قلوب کمالِ ایمان سے محروم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں اُخوۃ کا لفظ مذکور ہے۔ اور اُخوت مسلم و منافق کے درمیان نہیں ہوتی۔ اسلئے اسکے مفہوم میں فاسق کو داخل ماننا بہتر ہے۔ گو ظاہری اُخوت ان سب لوگوں میں ثابت ہے۔ جو ایمان کے مدعی ہیں۔ خواہ وہ مخلص ہوں یا منافق۔ واللہ اعلم۔

لا تؤذوا المسلمین میں المسلمین سے کامل الایمان مسلمان مراد ہیں۔ جو زبان و دل سے مسلمان اور مومن ہیں۔ کیونکہ فاسقین کو ظہور توبہ سے پہلے ایذا و عار دلائی جائے گی۔ اور ان پر بعض گناہوں کی بنا پر تعزیر وحد بھی جاری کی جائے گی۔ فی جوف رحلہ ای فی وسط منزلہ۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (سورۃ نور آیت ۱۹)	(بیشک جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے)

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تجسس و تتبع (عیب جوئی اور دوسروں کے عیوب کے پیچھے پڑنا) مسلمان سے بدگمانی کا نتیجہ ہے۔ پھر انسان کا قلب صرف گمان پر قناعت نہیں کرتا بلکہ تحقیق کا طلب گار ہوتا ہے۔ اور تحقیق پردہ دری تک پہونچا دیتی ہے۔

تجسس اور عیب جوئی کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ انبیائے معصومین علیہم السلام کے علاوہ عیوب سے کون خالی ہے۔؟ خود عیب جوئی کرنے والا بھی عیب دار ہے۔ اور مسلمان کو حق تعالیٰ نے بڑی عزت و عظمت دی ہے۔ کسی گناہ و قصور کی وجہ سے جبکہ وہ پوشیدہ بھی ہو اس کو فضیحت اور ذلیل کرنا اور اس کی عظیم الشان عزت کو خاک میں ملا دینا ظلم ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیت اللہ پر نظر فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے کعبۃ اللہ تجھ کو حق تعالیٰ نے بڑی عزت و عظمت عطاء فرمائی ہے لیکن ایک مومن کی عزت تجھ سے زیادہ ہے۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ روایت حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کے واسطے سے مرفوعاً بھی منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا تھا۔ جو عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔

بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ

ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا ہی برا ہے۔

(۴۱۷) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِيْهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا۔ (بخاری ص۹۰۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے اور حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنے بھائی کو کافر کہے تو ان دونوں میں ایک ضرور اس کلمۂ کفر کے ساتھ لوٹا۔ (مشکوۃ ص۴۱۱ عن الشیخین)

(۴۱۸) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ مَالُهٗ وَعِرْضُهٗ وَدَمُهٗ حَسْبُ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ يَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ۔ (ابو داؤد ص۳۲۱ ج۲، مشکوۃ ص۴۲۲)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر پورے کا پورا حرام ہے۔ یعنی اس کا مال اور اس کی آبرو اور اسکی جان (سب کچھ حرام ہے) آدمی کے برا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

تشریح آیت شریفہ مذکورہ کے اخیر میں فرمایا بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ۔ ایمان لانے کے بعد کسی مسلمان پر گناہ کا نام لگنا ہی بُرا ہے۔ یعنی مؤمن کے لئے گناہ کے کام زیبا نہیں خصوصًا مذکورہ گناہ تمہاری شان کے بالکل خلاف ہیں۔ اور ان کے ارتکاب کیوجہ سے تمہارے بارے میں یہ کہا جائے کہ تم خدا کی نافرمانی کرتے ہو۔ یہ بہت نازیبا ہے۔ یعنی تمسخر اور مذاق اڑانا، طعنہ دینا، بُرے القاب سے پکارنا یہ سب فسق ونافرمانی ہے۔ ان میں مبتلا ہوجانے سے تم پر فسق کا الزام آجائے گا۔

وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ الخ اور جس نے مذاق بنانے، طنز کرنے اور بُرے القاب سے کسی کو پکارنے سے توبہ نہ کی تو وہ ظالم ہے۔ ظلم کے معنی ہیں وضع الشئ فی غیر محلہ کے۔ توجو ان امور کا مرتکب ہے اس نے طاعت کی جگہ چونکہ معصیت کو رکھدیا اسلئے ایسے لوگوں کو قرآن پاک نے ظالم قرار دیا ہے۔

(۴۱۷) جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا، تو یہ کلمہ دونوں میں سے ایک کی طرف لوٹے گا۔ اگر کہنے والے نے غلط کہا ہے تو خود وہی کافر ہوجائیگا۔ اور اگر صحیح کہا ہے تو جس کو کہا وہی کافر ہے۔ اس میں لفظ کافرُ بضم الراء منادیٰ ہونے کی وجہ سے مبنی علیٰ ما یرفع بہ" ہے۔ اور حرفِ نداء محذوف ہے۔ ای یاکافر چنانچہ بعض روایات میں الفاظ میں حرف نداء موجود ہے۔ اور بعض میں مرفوع بالتنوین ہے۔ اس صورت میں مبتدا محذوف انتَ یا ھوَ کی خبر ہوگا۔

فَقَدْ بَاءَ بِھَا ای رجع باثم تلك المقالۃ۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں بتذکیر الضمیر (باء بہ) ہے ای باء بالکفر اور معنی یہ ہیں رجع باثم ذلك القول المفھوم من لفظ قال) احدھما اما القائل ان اعتقد تکفیر المسلم بذنب او الآخر ان صدق القائل۔

امام نووی رحؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث ان میں سے ایک ہے جنکو علماء نے مشکلات میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ اس کے ظاہری معنی تو مراد ہو نہیں سکتے۔ اسلئے کہ اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان کو کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوجانے کی وجہ سے کافر نہیں کہہ سکتے۔ اور وہ دین اسلام کو برحق جانتا ہے۔ اور اپنے مسلمان بھائی کو کسی گناہ کی بنا پر کافر کہہ رہا ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا بھی گناہ ہی ہے، تو اصولاً نہ وہ کافر ہوا جس کو کہا گیا اور نہ کہنے والا، اسلئے حدیث کی توجیہ ضروری ہوئی۔ پھر اس کی توجیہ وتاویل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) یہ محمول ہے استحلال پر یعنی وہ مسلمان کو کافر کہنے کو حلال سمجھ رہا ہے۔ اور گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے۔ اسلئے اگر وہ کافر نہیں ہے جس کو کافر کہا ہے تو کہنے والا گناہ کو حلال سمجھنے کی وجہ سے خود کافر ہوجائیگا۔

(۲) باء بِہَا کا مطلب ہے تکفیر کی معصیت اس قائل کی طرف لوٹے گی یعنی کافر کہنے والا گنہگار ہوگا۔
(۳) بعض نے اس کو خوارج پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر کی تھی۔ حالانکہ وہ خود مبتلائے کفر تھے۔ لیکن یہ جواب ضعیف ہے۔ کیونکہ جمہور کے نزدیک خوارج کا حکم بھی وہی ہے جو دیگر مبتدعین کا ہے کہ ان کی تکفیر میں احتیاط کی جاتی ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں روافض اس اصول سے خارج ہیں۔ کیونکہ وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ اکثر صحابہ کی بھی تکفیر کرتے ہیں (اور تکفیر صحابہ سے قرآنی آیات وحدیثی روایات کا انکار لازم آتا ہے) اسلئے وہ باتفاقِ علماء کافر ہیں۔ متقدمین سے آجتک ان کے کافر ہونے پر سلف وخلف کا اجماع بلانزاع قائم ہے۔)
(۴) مطلب یہ ہے کہ اس کی تکفیر قائل ہی کی طرف لوٹے گی۔ یعنی اسپر ہی الزام کفر عائد ہوگا۔ کیونکہ جو کافر نہیں اس کو تو وہی کافر کہہ سکتا ہے جو خود کافر ہو۔ اور بطلانِ اسلام کا عقیدہ رکھتا ہو۔ گو وہ حقیقۃً کافر نہوگا اگر بطلانِ اسلام کا معتقد نہیں۔
(۵) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنے بھائی کو یا کافر، کہا اگر قائل سچا ہے تو وہ بھائی کافر ہے۔ اور یہ کلمۂ کفر اسی کی طرف لوٹا۔ اور اگر قائل جھوٹا ہے۔ اور اسلام کے باطل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے (اسلئے مسلمان کو کافر کہتا ہے) تو یہ تکفیر قائل کی طرف لوٹے گی۔
(۴۱۸) اس روایت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ مسلمان کی جان، مال اور آبرو سب چیزیں محترم ہیں۔ ان کی حفاظت ضروری اور اضاعت ناحق حرام ہے۔ اور وہ انسان خود بُرا ہے جو کسی مسلمان کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے۔ اس روایت کا مضمون عنوان "منها التعاون بالبرّ والتقوىٰ" کے تحت (۲۲۱) میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔ جزء ثانی میں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

بیشک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں

(۴۱۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِیَّاكُمْ
حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم گمان سے بچو
وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِیْثِ۔ (بخاری ص۸۹۷ مشکوٰۃ ص۴۲۷)
کیونکہ گمان بہت جھوٹی بات ہوتی ہے۔

(۴۲۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے

اَسَاءَ بِاَخِيْهِ الظَّنَّ فَقَدْ اَسَاءَ بِرَبِّهٖ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ اِجْتَنِبُوْا
اپنے بھائی سے بدگمانی کی اس نے اپنے رب کے ساتھ برائی کی، بیشک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم بہت
كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۔ (الدر المنثور فی تفسیر سورۃ الحجرات)
گمان کرنے سے بچتے رہو۔

(۴۲۱) عَنْ حَارِثَةَ بْنِ النُّعْمَانِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت حارثہ بن نعمانؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
ثَلٰثٌ لَازِمَاتٌ لِاُمَّتِي الطِّيَرَةُ وَالْحَسَدُ وَسُوْءُ الظَّنِّ فَقَالَ رَجُلٌ
کہ میری امت کو تین چیزیں (پیش آنی) ضروری ہیں بدفالی اور حسد اور بدگمانی، تو ایک شخص نے پوچھا
مَا يُذْهِبُهُنَّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِمَّنْ هُنَّ فِيْهِ قَالَ اِذَا حَسَدْتَ
یا رسول اللہ جسمیں یہ چیزیں موجود ہوں تو ان کو کیا چیز دور کرسکتی ہے فرمایا جب تو حسد کرے تو اللہ سے
فَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ وَاِذَا ظَنَنْتَ فَلَا تُحَقِّقْ وَاِذَا تَطَيَّرْتَ فَامْضِ ۔ (حوالہ بالا)
استغفار کر اور جب تو گمان کرے تو تحقیق نہ کر اور جب بدشگونی لے تو (مقصد پر) چلا جا۔

تشریح يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ یہ مذکورہ دو آیتوں میں سے دوسری آیت ہے۔ صاحب مظہریؒ نے اس کے شانِ نزول میں امام بغویؒ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جہاد وغیرہ کے سفر میں تشریف لے جاتے تو ایک ایک غریب آدمی کو دو دو مالداروں کی خدمت پر مقرر فرمادیتے۔ اور دو مالداروں کے ساتھ تیسرے غریب کو کردیتے تھے۔ (اس طرح طرفین ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے اور سفر بسہولت پورا کرتے تھے) غریب خادم آگے جاکر مالداروں کے لئے پڑاؤ اور کھانے پینے کا انتظام کرتے (اور مالدار غریبوں کے مصارف برداشت کرتے) اسی عادت کے مطابق ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ کو دو آدمیوں کے کام پر مامور فرمایا۔ سلمان فارسیؓ لشکر سے آگے بڑھ کر کسی جگہ جاکر سوگئے۔ اور دونوں ساتھیوں کے لئے کھانے پینے کا بندوبست نہ کیا۔ جب ان دونوں ساتھیوں نے ان سے دریافت کیا کہ کھانے وغیرہ کا کیا بندوبست ہے تو جواب دیا کہ مجھے نیند آگئی تھی۔ کوئی انتظام نہیں ہو پایا۔ ان دونوں نے کہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاؤ اور آپ سے درخواست کرکے ہمارے لئے کھانا لاؤ۔ سلمان نے جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانا مانگا۔ آپ نے فرمایا کہ اُسامہ بن زید سے کہو اگر کچھ کھانا ان کے پاس بچا ہوا ہو تو وہ دیدیں گے۔ (حضرت اسامہ آپ کے خازن بھی تھے اور پڑاؤ کے منتظم بھی) حضرت سلمانؓ نے

اسامہؓ سے کہا تو انہوں نے کہا کہ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ حضرت سلمانؓ نے واپس آکر ساتھیوں کو حضرت اسامہؓ کے قول کی اطلاع دیدی۔ ساتھیوں نے کہا کہ اسامہؓ کے پاس کھانا تو تھا مگر انہوں نے بخل کیا۔ اس کے بعد حضرت سلمانؓ کو صحابہ کی ایک جماعت کے پاس بھیجا گیا لیکن وہاں بھی کچھ نہ ملا۔ سلمان ناکام لوٹ آئے تو ساتھیوں نے کہا کہ تم کو اگر پانی سے بھرے ہوئے کنوئیں پر بھیجدیں تو وہ بھی خشک ہو جائیگا۔ پھر یہ لوگ اسامہؓ کے پاس اسلئے پہونچے کہ واقعی ان کے پاس روٹی لتن ختم ہو گیا تھا، یا انہوں نے کنجوسی سے کام لیا؟ چنانچہ جب یہ لوگ اس ارادہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچے تو آپنے فرمایا! کیا بات ہے تمہارے مونہوں سے گوشت کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ دونوں نے کہا یارسول اللہ خدا کی قسم ہمنے تو آج گوشت ہی نہیں کھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم غلط کہتے ہو۔ تم آج سلمان و اسامہ کا گوشت کھاتے رہے ہو (اس واقعہ میں بدگمانی بھی ہے تجسس بھی اور غیبت بھی) اس واقعہ پر اس آیت کا نزول ہوا۔ (جس میں ان تینوں چیزوں کو ممنوع قرار دیا گیا تینوں چیزیں ایسی حق تلفیوں اور معاشرت کو خراب کرنے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں) بہرحال اس آیت میں تین چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ (۱) ظن (۲) تجسس (۳) غیبت۔ ان میں سے پہلی چیز (ظن) کو اس عنوان میں بیان فرمایا گیا ہے۔ جس کی بقدر ضرورت تفصیلات ذیل میں مندرج ہیں۔

ظن کی تفصیلات

ظن کے معنی غالب گمان کے ہیں۔ جس کے متعلق ارشاد ہے اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ (بہت سے گمانوں سے بچا کرو) پھر اس کی وجہ یہ بیان فرمائی اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گمان گناہ نہیں ہوتا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا کہ ہر گمان گناہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض گمان گناہ ہیں۔ تو اسکی تحقیق واجب ہوگئی کہ کونسے گمان گناہ ہوتے ہیں جن سے بچیں۔ اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہو جائے اس سے احتیاط رکھیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس جگہ ظن سے مراد تہمت ہے۔ یعنی کسی شخص پر کسی قوی دلیل کے بغیر کوئی الزام، عیب یا گناہ کا لگانا۔ امام ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں اس کی ایک جامع تفصیل لکھی ہے۔ کہ ظن کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) حرام (۲) واجب (۳) مستحب (۴) مباح۔ ظن حرام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے، کہ وہ مجھے عذاب ہی دیں گے۔ مصیبت ہی میں رکھیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت سے ناامید ہو جائے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لَا يَمُوْتَنَّ اَحَدُكُمْ اِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ تم میں سے کسی کو اس کے بغیر موت نہ آئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا گمان اچھا ہو۔

مشہور حدیث قدسی میں ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ (یعنی میں اپنے بندہ کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ

کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے) اب اس کو اختیار ہے کہ وہ میرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔
اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ اچھا گمان رکھنا فرض اور بدگمانی حرام ہے۔ اسی طرح وہ مسلمان جو ظاہری حالات میں نیک معلوم ہوتے ہیں ان کے متعلق بھی قوی دلیل کے بغیر بدگمانی حرام ہے۔
جیساکہ حدیث مذکور اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ میں اسی پر تنبیہ فرمائی گئی ہے۔
یہاں ظن سے مُراد بالاتفاق کسی نیک مسلمان کے ساتھ قوی دلیل کے بغیر بدگمانی کرنا ہے۔ اور جو کام ایسے ہیں کہ ان میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعًا ضروری ہے، اور اس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ جیسے باہمی منازعات ومقدمات کے فیصلہ میں ثقہ اور معتبر گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا۔ کیونکہ اس حاکم پر جس کی عدالت میں مقدمہ دائر ہے فیصلہ دینا واجب ہے۔ اور اس خاص معاملہ ومقدمہ کے متعلق قرآن وحدیث کی کوئی نص صریح موجود نہیں ہے، تو معتبر گواہوں کی گواہی پر عمل کرنا اس کے لئے واجب ہے۔ اگرچہ گواہوں کے ثقہ ہونے کے باوجود کذب کا امکان واحتمال موجود ہے۔ ان کا سچا ہونا صرف ظنِ غالب کے اعتبار سے ہے۔ اور اس کے علاوہ معاملہ کی حقیقت تک رسائی کا کوئی راستہ نہیں اسلئے انہی گواہوں کی گواہی پر عمل اور فیصلہ واجب ہوگا۔ اسی طرح جہاں سمتِ قبلہ معلوم نہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہو جس سے معلوم کی جاسکے وہاں اپنے ظنِ غالب پر عمل واجب ہے۔ اسی طرح جس شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہوا تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں جس کا ضمان واجب ہوا ظنِ غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہوگا۔
اور ظنِ مباح کی مثال یہ ہے کہ نماز کی رکعتوں میں شک ہوجائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار۔ تو یہاں اپنے ظنِ غالب پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ ظنِ غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعات قرار دیکر چوتھی پڑھ لے تو یہ (بناء علی الاقل) بھی جائز ہے۔ اور ظنِ مستحب ومندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھے۔ کہ اسپر ثواب ملتا ہے۔ (جصاص ملخصًا)
امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِہِمْ خَیْرًا۔ اس آیت میں اہل ایمان کے ساتھ حسنِ ظن کی تاکید ہے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ اِنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءُ الظَّنِّ یعنی بدگمانی رکھنا احتیاط کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ کہ بغیر قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو چور سمجھے اور ان کی تحقیر کرے۔ شیخ سعدیؒ کے اس شعر کا بھی مطلب صرف احتیاط ہی ہے ؎

نگہ دارد آں شوخ درکیسہ دُر ٭ کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

(وہ چالاک آدمی جیب میں موتی محفوظ رکھ سکتا ہے جو سب کو جیب تراش سمجھے)

(۴۱۹) اس حدیث میں جس گمان کو سب سے بڑا جھوٹ قرار دیا گیا ہے وہ ان امور کے بارے میں ہے، جہاں قوی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا صرف گمان وخیال سے ایسی بات کرنا مراد ہے جس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ یا کذب کا گمان ہونے کے باوجود کوئی بات کہنا مراد ہے۔ یہ پوری حدیث لَا تَجَسَّسُوْا میں (۴۲۲) میں آرہی ہے۔

(۴۲۰) اَسَاءَ بِرَبِّهٖ کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ کیونکہ اس نے بدگمانی سے منع فرمایا۔ اسی لئے باری تعالیٰ نے فرمایا اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ۔ جس میں زیادہ گمان کرنے پر روک لگائی ہے۔ کیونکہ زیادہ گمان کرنے کی عادت سے بدگمانیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔

(۴۲۱) ثَلٰثٌ لَازِمَاتٌ کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین چیزیں ضرور واقع ہوں گی۔ ایک شخص نے ان تینوں خطرناک بیماریوں کا علاج بھی آپ سے دریافت کرلیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ حسد دل میں اگر پیدا ہوجائے اور ارادے سے اس حسد کے تقاضے پر عمل ہوجائے تو یہ گناہ ہے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار اس کا علاج ہے۔ بشرطیکہ محسود کو نقصان نہ پہونچایا ہو۔ اور اگر حاسد نے محسود کو کوئی نقصان بھی پہونچادیا ہو تو اس سے معافی وتلافی بھی تکمیلِ توبہ کیلئے ضروری ہوگی۔ جیساکہ توبہ کا اصول ہے۔ لفظ حَسَدْتَ سے ارادہ وعمل کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اگر دل میں حسد پیدا ہوگیا اور اسکے ارادے کو اس میں دخل نہیں۔ اور اسکے مقتضا پر عمل نہیں کیا تو یہ گناہ نہیں ہوا۔ بلکہ حسد کے تقاضے پر عمل نہ کرنا مجاہدہ اور باعث ثواب ہوگا۔ البتہ حسد چونکہ مرض ہے۔ اسلئے اسکے ازالہ کی فکر ضروری ہے۔ اور اس کے ازالہ کا طریقہ اللہ سے دُعاء اور اللہ کی تقسیم پر رضا کی کوشش کرنا ہے۔ حسد کا بیان آگے آرہا ہے۔ دوسرے مرض بدگمانی کا علاج یہ ہے کہ اگر دل میں کسی کی طرف سے بدگمانی ہو تو اس کے پیچھے نہ پڑے۔ اور اس معاملہ کی تحقیق وتفتیش نہ کرے۔ نیز اپنے عیبوں کی طرف متوجہ ہوجائے۔ اور بدشگونی دل میں آجائے تو اسکے تقاضہ پر عمل کرکے مقصد سے نہ رک جائے۔ بلکہ اللہ کے بھروسہ پر اپنے مقصد کیجانب چلاجائے۔ اور اپنے کام پر متوجہ رہے۔ عنوان الطیرۃ کے تحت اس کی تفصیل گذرچکی ہے۔

لَاتَجَسَّسُوْا

ٹوہ نہ لگاؤ

(۴۲۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ وَلَا تَحَسَّسُوا وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا

کہ تم (برے) گمان سے بچتے رہو۔ کیونکہ گمان (بد) سب سے زیادہ جھوٹی بات ہوتی ہے۔ اور نہ کن سوئیاں لو۔ اور تم ٹوہ نہ لگاؤ۔

تَحَاسَدُوا وَلَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا۔

اور ایک دوسرے پر حسد نہ کرو۔ اور ایکدوسرے سے بغض نہ رکھو اور ایکدوسرے سے دشمنی نہ کرو۔ اور اے اللہ کے

بندو تم بھائی بھائی ہوجاؤ۔ (بخاری ص ۸۹۶ مشکوٰۃ ص ۴۲۷)

(۴۲۳) عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت معاویہؓ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے

يَقُولُ إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَّهُمْ

ہوئے سنا کہ اگر تو لوگوں کے عیبوں کے پیچھے پڑیگا تو تو ان کو خراب کر دے گا۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۳۳۰ مشکوٰۃ ص ۴۲۹)

(۴۲۴) أُتِيَ ابْنُ مَسْعُودٍ فَقِيلَ هٰذَا فُلَانٌ تَقْطُرُ لِحْيَتُهُ خَمْرًا

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس کسی کو لایا گیا اور کہا گیا کہ یہ فلاں شخص ہے جس کی داڑھی شراب ٹپکاتی

فَقَالَ عَبْدُ اللهِ إِنَّا قَدْ نُهِينَا عَنِ التَّجَسُّسِ وَلٰكِنْ إِنْ يَظْهَرْ

ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہم کو کھود کرید سے منع کیا گیا ہے لیکن اگر ہمارے سامنے کوئی

لَنَا شَيْءٌ نَأْخُذْ بِهِ۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۳۳۰)

جرم ظاہر ہوگا تو اس پر ہم مواخذہ کریں گے۔

لغات وَلَا تَحَسَّسُوا تفعل سے سننا، دیکھنا، معلوم کرنیکی کوشش کرنا، حواس سے پہچاننا۔ حقیقتِ حال معلوم کرنا (ن) قتل کرنا وغیرہ (ض) معلوم کرنا (س ض) یقین کرنا، نرم دل ہونا۔ جاسوس جاسوس وَلَا تَجَسَّسُوا تفتیش کرنا (ن) معلوم کرنے کے لئے ہاتھ سے چھونا۔ جَاسُوس برائی کی نیت سے خبروں کی تفتیش کرنے والا۔ ج جَوَاسِيس۔ وَلَا تَدَابَرُوا باہم دشمنی کرنا، اختلاف کرنا۔ قطع تعلق کرنا۔ دَبْرًا دُبُورًا (ن) مرنا، ختم ہونا، پشت پھیرنا۔ بوڑھا ہونا (س) زخمی پیٹھ والا ہونا۔ تفعیل سے انجام میں غور کرنا۔ انتظام کرنا۔ عَوْرَاتٌ عَوْرَةٌ کی جمع، خلل، شگاف، عیب، ہر امر جس سے شرم کیجائے۔ انسان کے وہ اعضاء جن کو حیاء کی وجہ سے چھپایا جاتا ہے۔

تشریح (۴۲۲) إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ کی تشریح آچکی ہے۔ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ میں قیاس کا تقاضا ضمیر لانا یعنی فَإِنَّهُ فرمانا تھا لیکن اس کی جگہ میں اسم ظاہر لاکر

فَاِنَّ الظَّنَّ فرمایا گیا تاکہ سننے والوں کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور ظن سے بچنے کا خوب اہتمام کیا جائے۔

• لَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا۔ اوّل میں حاء ہے دوسرے میں جیم۔ اور دونوں قریب المعنی ہیں بعض شراحِ حدیث نے بیان کیا کہ ان دونوں جملوں کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی خیر کی بھی ٹوہ نہ لگاؤ۔ کہ اس سے تم حسد میں مبتلا ہو سکتے ہو۔ اور کسی کی شر کا بھی تجسّس نہ کرو۔ کہ تم اس کی عیب جوئی اور رسوائی میں نہ لگ جاؤ۔ وقد ورد طُوبٰی لِمَنْ شَغَلَهٗ عَیْبُهٗ عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے دونوں میں اس طرح فرق کیا ہے کہ تحسس بالحاء لوگوں کی پوشیدہ باتوں کے سننے کے لئے کان لگاتا ہے۔ (اور اسی کو اردو میں کن سوئیاں لینا کہا جاتا ہے) اور اکثر تحسس کا اطلاق شر میں ہوتا ہے۔ اور بالجیم التفتیش عن بواطن الامور مطلقاً۔ بعض کہتے ہیں کہ دونوں لفظ متحد المعنیٰ ہیں ای طلب معرفۃ الاخبار والاحوال الغائبۃ۔ ملا علی قاریؒ نے اسی کو پسند فرمایا ہے اور کہا ہے کہ الاخبار والاحوال التی تفضی الی سوء الظّن کی قید مناسب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تحسس و تجسس سے بدگمانی تک نوبت نہ پہونچے تو وہ ممنوع نہیں ہے۔ وقیل بالجیم التفتیش عن بواطن الامور بتلطف ومنہ الجاسوس وبالحاء تطلب الشئ بالحاسۃ کاستراق السمع وابصار الشئ خفیۃ وقیل الاول التفحص عن عورات النّاس وبواطن امورھم بنفسہٖ اوغیرہٖ والثانی بنفسہٖ وقیل الاول مخصوص بالشرّ والثانی اعم۔ واللہ تعالیٰ اعلم

وَلَا تَنَاجَشُوْا۔ مشکوٰۃ ص۴۲۷ میں صحیحین کی روایت میں یہ جملہ (وَلَا تَنَاجَشُوْا بھی ہے۔ تناجش نجش سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی بعض حضرات نے طلب الترفع والعلو علی الناس بیان کیے ہیں یعنی لوگوں کے مقابلہ میں بلندی و برتری طلب کرنا۔ اور یہاں یہی معنی سابق ولاحق کے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی ہیں شر اور خصومت پر اُبھارنا۔ تو معنی یہ ہوں گے برائی اور جھگڑے پر نہ اُبھارو (اور یہ تجسّس کا نتیجہ ہوتا ہے) لیکن فقہاء کے یہاں اس کے مشہور معنی یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص جو خود مال خریدنے کا ارادہ نہیں رکھتا مال کو پسند کرتا اور اسکے دام بڑھاتا ہے، تاکہ دوسرے لوگ اس کی طرف رغبت کریں اور خرید لیں۔ اس طرح خریداروں کو دھوکہ دیتا ہے۔ تاکہ اس کے رفیق کا یا جس سے کچھ لین دین کا معاملہ کر لیا ہے اس کا مال فروخت ہو جائے ظاہر ہے کہ یہ دھوکہ ہے جو حرام ہے۔ اور تاجر لوگ ایک دوسرے کا مال فروخت کرانے کے لئے یہ تدبیریں کرتے ہیں۔ یہاں باب تفاعُل کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جس کی خاصیت مشارکت ہے۔ بہرحال اس معنی کے اعتبار سے نجش بمعنی رفع الثمن ہوگا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ نجش کے معنی تنفیر کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ لا ینفر بعضکم بعضاً یعنی تم میں سے کوئی کسی کو نفرت نہ دلائے۔ یا تم آپس میں

نفرت پیدا نہ کرو۔ اس طرح سے کہ کوئی قابلِ نفرت بات سُناؤ یا کوئی ایسا کام کرو جس سے دوسرں کو نفرت ہو۔ حاصل یہ ہے کہ ایسے اقوال وافعال سے بچو جن سے آپس میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ معنی بھی یہاں کے مناسب ہیں۔

وَلَا تَحَاسَدُوْا ای لا یتمنی بعضکم زوال نعمۃ بعض سواء ارادھا لنفسہ اولا (ایکدوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا نہ کرو۔ یہ ہی حسد کی حقیقت ہے اور حسد ناجائز ہے۔ ہاں اگر تمنائے زوال نعمتِ غیر نہو بلکہ تمنائے حصولِ مثلِ نعمتِ غیر ہو تو یہ محمود ہے۔ اور اس کا نام شریعت میں غبطہ ہے۔ قرآنِ پاک میں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ میں حسد سے منع فرمایا ہے۔ اور وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ میں غبطہ اور رشک کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگلا عنوان حسد ہی سے متعلق مستقل آرہا ہے۔

وَلَا تَبَاغَضُوْا۔ ایکدوسرے سے بغض نہ رکھو۔ طریقِ مستقیم وسنت نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم پر گامزن ہونا محبت وانس کا ضامن ہے۔ ہاں اتباعِ ہوٰی اور بدعت وضلالت کے ارتکاب سے آپس میں بغض وعداوت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اور لَا تَبَاغَضُوْا کا منشار تحابب (یعنی آپس میں ایک دوسرے سے محبّت کرنے) کی تاکید ہے۔ کیونکہ تحابب میں ہی ایمان کی بقار وارتقار کی ضمانت ہے۔ کیونکہ تحابب سببِ اجتماع ہے۔ اور تباغض سببِ افتراق ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ لَا تَبَاغَضُوْا کا مطلب یہ ہے کہ تم اسبابِ بغض پیدا نہ کرو۔ وجہ یہ ہے کہ عداوت ومحبت غیر اختیاری چیزیں ہیں۔ چنانچہ بغض کی حقیقت طبیعت کا کسی ناپسندیدہ چیز سے متنفر ہونا ہے۔ اس کا ابتدائی درجہ کراہت، درمیانی درجہ نفرت اور انتہائی درجہ عداوت ہوتا ہے۔ اسی طرح محبت ہے انجذاب النفس الی ما یرغب فیہ (نفس کا مائل ومتوجہ ہوجانا کسی پسندیدہ چیز کی طرف) اس کا ابتدائی درجہ میل النفس، اوسط درجہ ارادت اور آخری درجہ محبت ومودّت ہوتا ہے۔ حُبّ وبغض کی تفصیلات جزء ثانی میں بیان ہوچکیں۔

وَلَا تَدَابَرُوْا۔ یعنی آپسی تعلقات کو قطع نہ کرو۔ اور اپنے مسلمان بھائیوں سے اعراض نہ کرو۔ پیٹھ نہ پھیرو۔ یہ ماخوذ ہے لفظ دُبُر سے لان کلًا مِنَ المتقاطعین یولّی دبرہ صاحبہٗ۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ لَا تغتابوا کیا ہے۔ یعنی پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی نہ کرو۔ اور غیبت سے احتیاط رکھو۔

تنبیہ اس حدیث میں نہی کے چھ صیغے مذکور ہوئے ہیں۔ ان سب میں ایک تار کو حذف کردیا گیا۔ جیساکہ بابِ تفاعل کا قاعدہ ہے کہ مضارع ونہی میں دو تاؤں کے اجتماع پر ایک

کو حذف کر دیتے ہیں۔

وَکُونُوا عِبَادَ اللہِ اِخْوَانًا۔ لفظ اِخْوَانًا، کُونُوا کی خبر ثانی ہے۔ یا عِبَادَ اللہِ سے بدل ہے۔ یا اِخْوَانًا خبر ہے اور عِبَادَ اللہِ منصوب علی الاختصاص ہے۔ وقال الطیبی وھذا الوجه اوقع اور ایک روایت میں کُونُوا عِبَادَ اللہِ اِخْوَانًا بھی وارد ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ یعنی تم ایک اللہ کے بندے ہونے میں برابر اور بھائی بھائی ہو۔ اور تحاسد، تباغض اور تقاطع وغیرہ تمہاری شان کے خلاف ہے۔ بلکہ تمہاری شان کے لائق تو نصیحت، محبت معاونت اور بھائی چارگی کا معاملہ ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اَخ نسبی کی جمع اِخْوَةٌ آتی ہے۔ اور اَخ مجازی کی جمع اِخْوَانٌ آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ فَاِنْ کَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ وقال تعالیٰ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ۔ ہاں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ میں اِخْوَانٌ کی جگہ اِخْوَةٌ مجازاً بطور مبالغہ وتاکید لایا گیا ہے۔ لیکن صاحبِ قاموس فرماتے ہیں کہ اخوان واخوۃ دونوں لفظ اَخ کی جمع ہیں۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض روایات میں نہی کے ان چھ مذکورہ صیغوں کے علاوہ ساتواں صیغہ وَلَا تَنَافَسُوْا بھی وارد ہوا ہے۔ جس کا محل بظاہر وَلَا تَحَاسَدُوْا کے بعد ہے۔ اور تحاسد وتنافس معنوی اعتبار سے تقریباً متحد ہیں۔ لیکن تنافس میں قدرے مبالغہ ہے۔ کہ اس میں منازعت کے معنی بھی موجود ہیں۔ لہٰذا معنی یہ ہوجائیں گے ولا تحاسدوا ولا تنازعوا ای فی الامور الخسیسة الدنیویة بل ینبغی ان یکون تنافسکم فی الاشیاء النفیسة الاخرویة المرضیة قال تعالیٰ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

جامع صغیر میں اس روایت کے اخیر میں وَلَا یَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ حَتّٰی یَنْکِحَ اَوْ یَتْرُکَ بھی ہے۔ (مرقات ص ۱۸/۴۷)

(۴۲۳) اِتَّبَعْتَ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں اِبْتَغَیْتَ ہے۔ جس کے معنی ہیں طَلَبْتَ۔ مطلب دونوں کا یہ ہے۔ کہ اگر تم لوگوں کے عیب تلاش کروگے۔ اور لوگوں کے عیوب تلاش کر کرکے ان کا اظہار کروگے تو اس سے تم لوگوں کو خراب کردوگے۔ اور یہ خرابی کئی طرح سے ہوسکتی ہے۔

(۱) اظہار عیب آپس میں جنگ وجدال کا سبب بن جائے جس سے دنیا بھی تباہ ہو اور آخرت بھی برباد ہو جائے۔ (۲) جس کے عیوب کو اچھالا جائے وہ شرم وغیرت کی وجہ سے ترک وطن کردے تو اس کی معاش بھی برباد اور اہل وعیال بھی تباہ۔ (۳) جب عیوب ظاہر ہوگئے تو حیا جاتی رہی اور بے حیائی سے پھر لوگ تمام جرائم پر جری ہوں گے۔ اور کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرکے خود بھی اپنی دنیا وآخرت کو برباد کریں گے اور دوسروں کی بھی۔

اِنَّكَ اِنِ اتَّبَعْتَ میں خطاب ہر مخاطب کو عام ہے۔ لیکن سامنے حضرت امیر معاویہؓ موجود تھے۔ اسلئے ان کو مخاطب بنا کر ایک عام اصول بیان فرمایا گیا۔ کہ جو بھی لوگوں کے عیوب کو ظاہر کرے گا تو لوگ جرائم کا ارتکاب کرنے میں جری ہو جائیں گے۔ اسی لئے فرمایا گیا اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (نور آیت ۱۹)

(یعنی جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیل جائے ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا و آخرت میں)

ہو سکتا ہے کہ یہ حکم خاص طور پر امراء کے لئے ہو۔ جیسا کہ ابوداؤد ص $\frac{۳۳۳}{۲۲}$ کی دوسری حدیث میں ہے اِنَّ الْاَمِيْرَ اِذَا ابْتَغَى الرِّيْبَةَ فِي النَّاسِ اَفْسَدَهُمْ (امیر جب لوگوں میں بدگمانی اور تہمت ڈھونڈیگا تو ان کو خراب کردیگا) لیکن اگر یہی مان لیا جائے کہ اس کے مخاطب خاص طور پر حضرت امیر معاویہؓ ہی ہیں، تو آپنے حضرت امیر معاویہ کو یہ خاص نصیحت اسلئے فرمائی کہ مستقبل میں وہ امیر ہونیوالے تھے تو یہ ارشاد ایک خاص اصول پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پیشگوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی ہوگا۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص ۳۲۳ پر حضرت امیر معاویہؓ کی روایت میں ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مُعَاوِيَةُ اِنْ وُلِّيْتَ اَمْرًا فَاتَّقِ اللّٰهَ وَاعْدِلْ قَالَ فَمَا زِلْتُ اَظُنُّ اَنِّيْ مُبْتَلًى بِعَمَلٍ لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى ابْتُلِيْتُ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے معاویہؓ اگر تم کو امر کا ذمہ دار (امیر) بنا دیا جائے تو اللہ سے ڈرنا اور انصاف کرنا۔ حضرت امیر معاویہؓ فرماتے ہیں کہ میں اسکے بعد ہمیشہ اس کا گمان کرتا رہا کہ میں امارت میں مبتلا کیا جاؤنگا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ یہانتک کہ میں مبتلا کر دیا گیا۔

اسی وجہ سے حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا کہ اس ارشاد سے جو حضرت امیر معاویہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اللہ نے ان (معاویہؓ) کو نفع عطاء فرمایا۔ (ابوداؤد ص $\frac{۳۳۳}{۲۲}$) اس کی مزید تشریح وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ کے تحت (۲۱۶) پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۲۲۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا اور یہ عرض کیا گیا کہ یہ فلاں شخص ہے جس کی ڈاڑھی سے شراب ٹپک رہی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہم کو تجسس سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ثبوت شرعی بہم پہونچ جائیگا تو ہم اس کو سزا دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اس شخص کو پکڑ کر پیش کر دیا گیا کہ دیکھ لیجئے اس کی ڈاڑھی سے شراب ٹپک رہی ہے۔ پھر بھی یہ فرمانا کہ ہم کو تجسس سے منع کر دیا گیا ہے کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ یہاں تجسس کی گنجائش ہی نہیں، بلکہ مشاہدہ ہے۔

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ دراصل ایک شخص کو پکڑ کر لایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ اتنی شراب پیتا ہے کہ اسکی ڈاڑھی بھی تر ہوجاتی اور اس سے شراب ٹپکنے لگتی ہے یعنی اس شخص کے حال کی حکایت اور شکایت ہے جس کو پکڑ کر لایا گیا۔ نہ مشاہدہ ہے نہ شہادت جس سے ثبوتِ شرعی فراہم ہوتا۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے شکایت کرنے والے کو ٹال دیا۔ اور فرمایا کہ ہم کو ٹوہ سے منع کیا گیا ہے۔ ثبوتِ شرعی ، اقرار و اعتراف یا شہادت ہی پر ہم اس کو سزا دے سکتے ہیں۔ روایت میں یہ بھی احتمال ہے کہ لفظ تقطر کو خبر کے بجائے حال مانا جائے یعنی اس کو ایسی حالت میں لایا گیا کہ اس کی ڈاڑھی شراب ٹپکا رہی تھی۔ تب بھی شراب پینے پر شہادت نہیں ہوئی جس سے حد لازم آتی۔ ڈاڑھی سے شراب ٹپکنے کی خبر ہے جو علت حد نہیں۔ فافہم۔

اَلْحَسَدُ

حسد

(۴۲۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِیَّاكُمْ وَ
حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپنے ارشاد فرمایا کہ تم حسد سے بچتے
الْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ
رہو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی
الْحَطَبَ۔ (ابوداؤد ص ۳۳۲/۲۲۰ مشکوٰۃ ص ۴۲۸)
ہے۔

(۴۲۶) عَنْ زُبَیْرِ بْنِ الْعَوَّامِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
حضرت زبیر بن عوامؓ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تک
قَالَ دَبَّ اِلَیْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِیَ الْحَالِقَةُ
نامعلوم طریقہ سے پہلی امتوں کی بیماری یعنی حسد اور بغض پہونچ گئی ہے وہ مونڈ دینے والی ہے۔
لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ
میں نہیں کہتا ہوں کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے لیکن ہاں دین کا صفایا کر دیتی ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ
لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا
میں میری جان ہے کہ تم جنت میں نہیں جا سکتے جبتک کہ مؤمن نہ ہو جاؤ۔ اور تم مؤمن نہیں ہو سکتے جبتک تم آپس
اَفَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِمَا یُثَبِّتُ ذٰلِكَ لَكُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ۔
میں محبت نہ کرنے لگو۔ میں تمکو وہ چیز نہ بتادوں جو تمہارے لیے یہ (محبت) ثابت کردے۔ تم آپس میں سلام پھیلاؤ۔
(ترمذی ج۲ مشکوٰۃ نصف اول ص ۴۲۸ و نصف آخر ص ۳۹۷)

تشریح (۲۴۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم حسد سے بچتے رہو۔ کیونکہ حسد نیکیوں کو اسی طرح فنا کر دیتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو فنا کر دیتی ہے۔ معاصی سے حبط اعمال ہوتا ہے یا نہیں۔ اہل السنۃ کے نزدیک گناہوں سے اعمال حبط نہیں ہوتے۔ اور معتزلہ وغیرہ بعض باطل فرقوں کا خیال ہے کہ گناہوں سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ اس حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس میں یہ ہے کہ ایک گناہ (حسد) نیکیوں کو فنا کر دیتا ہے۔

اہل حق کی طرف سے شراح حدیث نے اس استدلال کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ (۱) حسد حاسد کو محسود کی حق تلفی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ کہ وہ محسود کی غیبت کرتا ہے۔ اس کے مال کو تلف کرتا ہے۔ اور اس کی آبرو ریزی کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے حاسد کی حسنات محسود کے پاس چلی جائیں گی، اور حاسد خائب و خاسر اور محروم رہ جائیگا۔ گویا اس کی نیکیاں حبط ہو گئیں۔ کہ اس کے کام ہی نہ آئیں۔ جیساکہ صحاح میں باب الظلم کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور مشکوٰۃ الآثار کی نصوص (۲۶، ۲۸، ۲۹) کی تشریحات میں گذر چکا ہے۔ (۲) علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ اعمال کے تضعیفی ثواب سے حاسد محروم ہو جائیگا۔ کیونکہ اصل ثواب اور اصولی جزاء تو سب کو ملتی ہے۔ اور تضعیفی ثواب جو مشیت خداوندی کے تحت ہے اس سے بندہ بعض گناہوں کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس حدیث میں اسی محرومی کا ذکر ہے۔ (۳) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حاسد کے اعمال مقبول نہیں ہوتے فالحدیث محمول علی نفی الکمال۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ (۴) حاسد سے طاعات کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے۔ جس کو حدیث بالا میں کما تاکل النار الحطب میں بطور تشبیہ بیان فرمایا گیا ہے۔ (۵) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہو کہ حسد محسود کی نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ یعنی محسود کی کسی نیکی کا حاسد پر اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے دل میں اس کی نیکی و طاعت کی کوئی قدر و عظمت نہیں۔ تو حاسد کے لئے محسود کی نیکیاں نہ ہونے کے درجہ میں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ حاسد کے ساتھ احسان غیر نافع، نصیحت غیر مؤثر اور اس کی نزدیکی و تعلق بیکار ہے۔ کیونکہ حسد بدترین دشمنی کا نام ہے ؎

کل العداوۃ قد یرجی ازالتھا ٭ الا عداوۃ من عاداك من حسد

(ہر عداوت کے ختم ہو جانے کی امید کی جا سکتی ہے مگر اسکی دشمنی جو تم سے حسد کی وجہ سے دشمنی رکھتا ہے)

(۲۴۶) دَبَّ کے معنی ہیں رینگتے رینگتے چلنا، یعنی ایسی چال چلنا جس کا پتہ نہ چلے۔ ھِیَ کا مرجع البغضاء ہے۔ کیونکہ وہ قریب ہے۔ اور مؤنث ہے۔ اور حسد بغضاء کی اصل اور مال ہے۔ الحسد والبغضاء دونوں داء سے بدل یا اس کا بیان ہونے کی بنا پر مرفوع ہیں۔ اس حدیث کے نصف اول کا مضمون عنوان منھا اصلاح ذات البین کے تحت (۲۴۷) میں گذر چکا۔ اور نصف ثانی کا مضمون عنوان سے

منها التحیۃ وافشاء السلام کے تحت (۳۰۹) میں ملاحظہ فرمائیں۔

لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا

تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔

(۴۲۷) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا، ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب
لَمَّا عُرِجَ بِيْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ اَظْفَارٌ مِّنْ نُحَاسٍ يَّخْمِشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ
مجھ کو اوپر لیجایا گیا تو میں ایسے لوگوں پر گذرا جن کے ناخن تانبہ کے تھے وہ (ان سے) اپنے چہروں کو اور
وَصُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰٓؤُلَآءِ يَا جِبْرِيْلُ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
اپنے سینوں کو نوچ رہے تھے تو میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں انہوں نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں
يَاْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَيَقَعُوْنَ فِيْ اَعْرَاضِهِمْ۔ (ابوداؤد ص۳۲۰ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۲۹)
کے گوشت کھاتے ہیں اور ان کی آبرو ریزی میں پڑتے ہیں۔

(۴۲۸) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍؓ وَّجَابِرٍؓ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت ابو سعیدؓ وحضرت جابرؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ الْغِيْبَةُ اَشَدُّ
نے کہ غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا اے رسول خدا اور غیبت زنا سے زیادہ سخت
مِنَ الزِّنَا قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَزْنِيْ فَيَتُوْبُ فَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ
کیسے ہے؟ فرمایا کہ آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں اور
فَيَتُوْبُ فَيَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِيْبَةِ لَا يُغْفَرُ لَهٗ حَتّٰى يَغْفِرَهَا
ایک روایت میں ہے کہ وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشدیتے ہیں۔ اور غیبت والے کو جبتک کہ اس کا
لَهٗ صَاحِبُهٗ وَفِيْ رِوَايَةِ اَنَسٍؓ قَالَ صَاحِبُ الزِّنَا يَتُوْبُ وَ
ساتھی اس کے جرم غیبت کو معاف نہ کردے معاف نہ کیا جائیگا۔ اور حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے
صَاحِبُ الْغِيْبَةِ لَيْسَ لَهٗ تَوْبَةٌ۔ (مشکوٰۃ ص۴۱۵)
کہ زنا کار توبہ کرلیتا ہے اور غیبت کرنیوالے کو توبہ نصیب نہیں ہوتی۔

(۴۲۹) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ اَخَاكَ

کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول ہی خوب جانتے ہیں ارشاد فرمایا کہ

بِمَا يَكْرَهُ قِيْلَ اَفَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ فِيْ اَخِيْ مَا اَقُوْلُ قَالَ اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا

تمہارا اپنے بھائی کا ایسی صفت کیساتھ (اسکی پیٹھ پیچھے) ذکر کرنا جو اس کو ناگوار ہو۔ عرض کیا گیا کہ یہ بتا دیجئے کہ اگر میرے

تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔ (مسلم ۳۲۲ مشکوٰة ۴۱۲)

بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کا میں ذکر کرتا ہوں؟ فرمایا اگر اس میں وہ عیب ہو جو تم بیان کرتے ہو تب ہی تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ عیب اس میں نہیں تو تم نے اسپر بہتان باندھا۔

تشریح (۴۲۷) شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اپنی آیات قدرت دکھلائیں اور اعمال کی جزا و سزا کے مشاہدے کرائے تھے۔ انہیں میں سے ایک مشاہدہ اس حدیث میں مذکور ہے۔ کہ غیبت کرنے والوں کو آپ نے تانبہ کے ناخنوں سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچتے اور زخمی کرتے ہوئے دیکھا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ نوحہ کرنے والی عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچتی اور زخمی کرلیتی ہیں۔ جو غیبت کرنے والوں کی جزا مقرر ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غیبت و آبرو ریزی بھی مردوں کا کام نہیں۔ بلکہ بزدلی اور زنانہ پن ہے۔ لہٰذا اس زنانے عمل کی سزا بھی اسی کے مناسب ہوئی۔ واللہ اعلم

(۴۲۸) حضرت ابو سعیدؓ و حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ صحابہؓ نے حیرت سے پوچھا کہ غیبت زنا سے زیادہ سخت گناہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ زنا کبیرہ گناہ ہے۔ اسپر حد ہے۔ اور بہت سی وعیدیں اسکے بارے میں وارد ہوئی ہیں ممکن ہے کہ قَالُوْا کا فاعل عام صحابہؓ ہوں یا دونوں راوی ہوں۔ (وکیف خبر مقدم ای کیف قولک ھٰذا اور الغیبۃ اشد من الزنا مبتدا مؤخر ہے) اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ غیبت زنا سے زائد سخت گناہ اسلئے ہے کہ زنا حق اللہ ہے۔ اسلئے وہ توبہ سے معاف ہوجاتا ہے۔ اور غیبت حق العبد ہے۔ اللہ تعالیٰ حق العبد کو معاف نہیں فرماتے، جبتک کہ بندہ خود معاف نہ کردے

وفی روایۃ انس الخ کا مطلب یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک انسانی دوسرا شیطانی۔ زنا انسانی گناہ ہے۔ کیونکہ یہ تقاضائے نفس اور شہوت کی قسم کا گناہ ہے۔ اور غیبت شیطانی گناہ ہے جس کا منشا کبر ہے۔ کیونکہ غیبت کرنیوالا خود کو بہتر سمجھ کر دوسرے کی آبرو ریزی اور غیبت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ انسانی و نفسانی گناہ والے کو توبہ کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ اور کبر سے پیدا ہونے والے گناہ سے توبہ کی توفیق نہیں دیتے۔ جیساکہ قصۂ آدم و ابلیس سے ظاہر ہے۔

اسی لئے آپ نے ارشاد فرمایا صاحب الزنا یتوب الخ یعنی زناکار کو توبہ کی توفیق نصیب ہوجاتی ہے۔ غیبت کرنے والے کو نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غیبت کرنے والا اس گناہ کو ہلکا اور معمولی خیال کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑا بھاری گناہ ہے۔ اسلئے صاحب غیبت توبہ نہیں کرتا۔ اور زناکار اس گناہ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اسلئے اس سے توبہ کرلیتا ہے۔ اس اخیر جملہ کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ غیبت کے لئے مستقل توبہ نہیں۔ بلکہ جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگنا اور اس کو راضی کرلینا ہی اسکی توبہ ہے۔ اور زنا کی توبہ کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ سے معافی مانگنا اور اس کو راضی کرلینا آسان ہے۔ اور بندہ سے معافی مانگنا بھی مشکل اور اس کا راضی ہونا بھی دشوار ہے۔

حقیقتِ غیبت

(۴۲۹) قرآن پاک میں وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کا نزول ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو غیبت کی حقیقت بتانے کے لئے ایک سوال سے متوجہ فرمایا أَتَدْرُونَ مَا الْغِيبَةُ کیا تم کو غیبت کی حقیقت معلوم ہے؟ صحابہؓ نے عرض کردیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ہمیں پورا علم نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ہی کو اس کی حقیقت خوب معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا اپنے مسلمان بھائی کی ایسی صفت کا اس کی پیٹھ پیچھے بیان کرنا جو اس کو معلوم ہو تو ناگوار ہو۔ غیبت ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ غیبت بدترین عیب ہے۔ جو لوگوں میں ایسی بری طرح پھیل گیا ہے کہ اس سے کوئی نہیں بچا۔ الا ماشاء اللہ۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں وذکرک بما یکرہ میں عموم ہے۔ اس کا تعلق بدن سے ہو، دین سے ہو۔ دنیا سے ہو۔ نفس سے ہو۔ اخلاق سے ہو، مال سے ہو۔ اولاد سے ہو، والدین سے ہو، زوجہ یا زوج سے ہو۔ خادم سے ہو، کپڑے سے ہو، حرکت اور چال سے ہو، یا لبشاشت، طلاقت اور کسی بھی حال سے ہو۔ پھر اس کا ذکر زبان سے ہو، قلم سے ہو، اشارہ سے ہو وغیرہ۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ تم جس طرح سے بھی اپنے غیر کو کسی مسلمان کا نقصان و عیب سمجھا دو تو وہ غیبت حرام ہے۔ اور کسی حرکت سے کسی کی نقل کرنا بھی غیبت ہے۔

کفار، فساق، مبتدع کا عیب بیان کرنا غیبت نہیں ہے۔ اسی طرح اصلاح کے لئے مربی و استاذ یا والدین سے شکایت مباح اور بسا اوقات مستحب ہے۔ اگر کسی نے جان، مال، آبرو وغیرہ کے نقصان کا پروگرام بنایا ہے تو اس کو اطلاع کردینا، جس مسلمان کے متعلق یہ منصوبہ بنایا گیا ہے واجب ہے۔ اور غیبت کو گناہ اور حرام نہ سمجھنا، اس کا انکار کرنا کفر ہے۔

اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ غیبت گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ۔ صحیح و مفتیٰ بہ قول ثانی ہے۔

غیبت و بہتان میں فرق

اسی روایت میں یہ ہے کہ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے مسلمان بھائی میں جو واقعی عیب ہے اس کو بیان کرنا بھی

غیبت ہوگا؟ فرمایا تب ہی تو غیبت ہے۔ اور اگر عیب نہیں ہے، پھر تم اس کی طرف عیب منسوب کر رہے ہو تو یہ اس سے بھی بڑا جرم "بہتان" ہے۔ جس کی سزا یہ ہے کہ پلصراط پر بہتانی کو روک لیا جائیگا۔ اور ثبوت مانگا جائیگا۔ اور کہدیا جائیگا کہ اس کا ثبوت پیش کر کے ہی آگے بڑھ سکتے ہو۔

تنبیہ اگر کسی کی غیبت کی، اور اس غیبت کی اس کو اطلاع نہیں ہے۔ تو اطلاع نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس سے اس کو اذیت ہوگی۔ البتہ اتنی ہی مقدار میں اس کی تعریف ان لوگوں کے سامنے کرے جن کے سامنے اس کی برائی کی ہے۔ اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہے۔ انشاءاللہ غیبت کا کفارہ ہوجائیگا۔ چنانچہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اِنَّ مِنْ كَفَّارَةِ الْغِيْبَةِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَهٗ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهٗ۔ (مشکوٰۃ ص۱۵؎)	بیشک غیبت کا ایک کفارہ یہ بھی ہے کہ تم اسکے لئے دعائے مغفرت کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے، یہ الفاظ کہو اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهٗ۔

اور اصل کفارہ اگرچہ معافی چاہنا ہی ہے لیکن غیبت کی اطلاع سے مؤمن بھائی کو اذیت ہوگی۔ اسلئے غیبت کا ذکر کیئے بغیر عام معافی مانگے۔ اور اگر غیبت کا علم ہوگیا ہو تو اس کے ذکر میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں صاف صاف جرم غیبت کا ذکر کر کے معافی مانگنا بہتر ہوگا۔

وَيُقَارِبُ الْغِيْبَةَ النَّمِيْمَةُ

اور غیبت کے قریب ہی چغلخوری ہے۔

(۴۳۰) عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ

يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ۔ (بخاری ص۸۹۵ مشکوٰۃ ص۱۴؎)

فرماتے تھے کہ چغلخور جنت میں نہ جائے گا۔

(۴۳۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے باغات میں سے

بَعْضِ حِيْطَانِ الْمَدِيْنَةِ فَسَمِعَ صَوْتَ اِنْسَانَيْنِ يُعَذَّبَانِ فِيْ

کسی باغ سے نکلے تو دو ایسے انسانوں کی آواز سنی جن کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جا رہا تھا

قُبُوْرِهِمَا فَقَالَ يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ كَانَ اَحَدُهُمَا

تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے۔ اور ان کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب

لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ وَكَانَ الْآخَرُ يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ ثُمَّ دَعَا بِجَرِيْدَةٍ

نہیں دیا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک تو پیشاب سے احتیاط نہیں رکھتا تھا۔ اور دوسرا چغل خوری کرتا پھرتا تھا

فَكَسَرَهَا بِكِسْرَتَيْنِ فَجَعَلَ كِسْرَةً فِيْ قَبْرِ هٰذَا وَكِسْرَةً فِيْ قَبْرِ

پھر آپ نے ایک ٹہنی منگائی اور اس کے دو ٹکڑے کیے پھر ایک ٹکڑا اس کی قبر پر رکھدیا اور ایک ٹکڑا اسکی قبر پر

هٰذَا فَقَالَ لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَوَضَعَ

پھر فرمایا شاید ان کی وجہ سے جبتک کہ یہ ٹہنیاں خشک نہوں اللہ تعالیٰ ان دونوں کے عذاب میں تخفیف

عَلٰى قَبْرِ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا كِسْرَةً۔ (بخاری ص۸۹۴ و ص۲۵،۳۴ مشکوٰۃ ص۴۲)

فرمادیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کی قبر پر ایک ٹکڑا رکھدیا۔

(۴۳۲) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ وَّاَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ

حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ اور اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ عِبَادِ اللهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ

نے فرمایا کہ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں کہ جب ان کو دیکھا جائے تو اللہ یاد آجائے۔

اللهُ وَشِرَارُ عِبَادِ اللهِ الْمَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ

اور اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو چغلخوری کرتے دوستوں میں جدائی کراتے پھرتے ہیں۔

الْاَحِبَّةِ الْبَاغُوْنَ الْبُرَآءَ الْعَنَتَ۔ (مشکوٰۃ ص۴۱۵)

(اور) پاکدامن پر گناہ (کی تہمت) ڈھونڈتے ہیں۔

تشریح

نَمِيْمَةٌ۔ چغلی (ن ض) نَمَّامٌ اسم فاعل کا صیغہ ج نُمَّامٌ، نُمٌّ نَمُّوْنَ، اَنِمَّاءُ نَمَّامٌ چغلخور۔ قَتَّاتٌ چغلخور، مؤنث قَتَّاتَةٌ (ن) جھوٹ بولنا، مہیا کرنا۔ ارادہ معلوم کرنے کے لئے کسی کے پیچھے پوشیدہ طور پر جانا۔ بات سننے کے لئے کان لگانا۔ بات بنانا، بات میں تحسین و تزویر کرنا۔

نمیمہ۔ نقل الکلام علیٰ وجہ الفساد کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ کلام سچا ہو یا جھوٹا۔ اور غیبت ایک تو صرف نقلِ کلام کو نہیں کہتے۔ جیساکہ معلوم ہو چکا ہے۔ پھر فساد کی نیت اس میں ضروری نہیں۔ اور نمیمہ میں نقلِ کلام اور نیت فساد یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو نمیمہ و غیبت میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہوگی۔

پھر نمّام اور قتّات دونوں مفہوم و مصداق میں ایک ہیں۔ کمافی النہایۃ۔ یا ان میں فرق ہے۔ جیساکہ بعض دوسرے علماء کا خیال ہے۔ کہ نمّام تو وہ شخص کہلاتا ہے جو لوگوں کے اندر موجود ہو۔

اور ان کے موافق اور مخالف دونوں طرح کی باتیں کرتا اور آپس میں فساد کی کوشش کرتا ہے۔ اور قتات اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں میں شامل تو نہیں ہے مگر ان کی باتیں اس طرح سے سنتا ہے کہ انکو معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں شخص ہماری باتیں سن رہا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ نمیمہ کا مدار کذب و حسد اور نفاق پر ہوتا ہے۔ اور یہی ذلت کے چولہے کے تین پتھر یعنی ذلت کی بنیادیں ہیں۔ اسلئے نمام سے بغض رکھنا چاہیئے۔ اور اس کی سچائی پر ہرگز اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔

(۴۳۰) لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ قَتَّاتٌ۔ ای مع الفائزین المفلحین۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ذَا الْوَجْھَیْنِ الَّذِیْ یَاْتِیْ ھٰؤُلَاءِ بِوَجْہٍ وَھٰؤُلَاءِ بِوَجْہٍ۔

تم لوگوں میں سب سے بڑا چغلخور کو پاؤگے کہ وہ اس گروہ کے پاس ایک رخ لیکر آتا ہے اور دوسرے کے پاس دوسرا۔

چغلخور منافقین کے مثل ہیں۔ کہ وہ ایک رخ اہلِ اسلام کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور دوسرے رخ سے اپنے ہم جنس شریروں سے ملتے ہیں۔ اور جو جس کے مشابہ ہوتا اسی کے ہمراہ اس کا حشر ہوگا۔ اس لئے چغلخور دوزخی ہے۔ گو اگر وہ مؤمن ہو تو سزا بھگت کر اپنے ایمان کی بنا پر جنت میں آخر کار پہونچ جائیگا۔ مگر کم از کم دخولِ اولی سے محروم رہیگا۔ اور دخولِ جنت سے محرومی اس کی خوئے فساد کی بنا پر ہوگی۔ واللہ لایحب المفسدین۔ ای یعاقبھم۔

حکایت کہتے ہیں کہ ایک حکیم کے پاس ایک شخص اس کی ملاقات وزیارت کے ارادہ سے آیا۔ اور گفتگو کے درمیان کسی دوسرے شخص کی برائیاں اور چغلیاں بھی کردیں اس حکیم نے کہا کہ تم نے میری ملاقات وزیارت باطل کردی۔ یعنی اس سے جو دنیوی مفاد اور اخروی ثواب ہوتا سب کھودیا۔ اور مزید تین نقصانات مجھ کو دیدیئے۔ (۱) میرے اس بھائی کا بغض جسکی برائی کی، میرے دل میں ڈالدیا۔ (۲) اور میرے خالی اور ہلکے پھلکے دل کو بھر کر بوجھل بنادیا۔ (۳) اور اب تک میرے نزدیک امین وقابلِ اعتماد تھے مگر آج تم نے خود کو میرے نزدیک متہم اور ناقابلِ اعتماد بنادیا۔

(۴۳۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے باہر تشریف لائے تو دو انسانوں کی آواز سنی جن کو عذاب قبر ہورہا تھا۔ آپنے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب قبر ہورہا ہے۔ اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں۔ ویجوز التعذیب علی الصغائر ایضا کما ھو مقرر فی العقائد خلافا للمعتزلۃ۔ بعض علماء نے کبیر کے معنی ثقیل بتائے ہیں یعنی ان کو ایسے گناہ کی وجہ سے سزا نہیں دی جارہی ہے جس سے بچنا دشوار اور بھاری ہوتا۔

بلکہ وہ غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے اس جرم کے مرتکب ہوئے۔ اور وہ جرم ایک کا پیشاب سے احتیاط نہ کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ پیشاب سے غیر محتاط ہونے کا نتیجہ نماز نہ ہونا ہے۔ جو کبیرہ گناہ ہے۔ اور دوسرے کا گناہ چغلی تھا کہ وہ اضرار و افساد کا باعث اور سبب ہوتی ہے۔ اور آپسی جھگڑا اور فسادِ ذات البین کے کبیرہ ہونے میں کیا اشکال ہے۔ اور اگر یہ دونوں گناہ فی نفسہٖ صغیرہ بھی مان لیئے جائیں تب بھی اصول یہ ہے کہ اصرار سے صغیرہ بھی کبیرہ ہوجاتا ہے فانہٗ لاصغیرۃ مع الاصرار ولا کبیرۃ مع الاستغفار وفی روایۃ بلیٰ انہما کبیران عند اللہ۔ علماء نے روایت کے ان الفاظ سے ان دونوں گناہوں کے کبیرہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔

کان احدھما لا یستتر من البول یہ لفظ روایات میں کئی طرح وارد ہوا ہے۔ (۱) لا یستتر استتار سے ہے جس کے معنی چھپنے کے اور محفوظ و محتاط رہنے کے ہیں۔ اس میں احتمال یہ بھی ہے کہ معنی یہ ہوں کہ وہ پیشاب کرتے وقت پردہ نہ کرتا تھا۔ بلکہ کشفِ عورت کرتا تھا جو باتفاق العلماء حرام و کبیرہ ہے۔ صاحب شرح السُّنہ نے اس کے یہی معنی مراد لئے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس روایت کو باب الاستتار عند قضاء الحاجۃ میں درج فرمایا ہے۔ اسکے دوسرے معنی ہیں لا یتحفظ یعنی وہ پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا۔ یہ ہی معنی زیادہ مناسب اور دیگر روایات کے موافق ہیں۔ (۲) بعض روایات میں لا یستبرئ وارد ہوا ہے۔ استبراء کے معنی طلب برارت یعنی پاکیزگی حاصل کرنے اور خوب پاک ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ بمعنی الاستنجاء بھی آتا ہے۔ (۳) لَا یَسْتَنْزِہُ بنون ساکنۃ بعدھا زای ثم ھاء۔ یہ ماخوذ ہے تنزہ بمعنی الابعاد سے جس کا حاصل ہے بچنا، محتاط رہنا، دور رہنا۔

اس روایت سے نیز دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب سے بے احتیاطی عذاب قبر کا سبب ہے۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر عذابِ قبر پیشاب سے بے احتیاطی کیوجہ سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے اِتَّقُوا الْبَوْلَ فَاِنَّہٗ اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ فِی الْقَبْرِ یہ یاد رہے کہ روایات میں بول عام ہے، اپنا ہو یا کسی اور انسان کا یا کسی بھی حیوان کا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بکریاں چراتا تھا۔ اور پیشاب سے احتیاط نہ کرتا تھا جس سے بظاہر بکریوں کا پیشاب معلوم ہوتا ہے۔ وَاَمَّا الْآخَرُ الخ اور دوسرا شخص چغلخور تھا۔ لگائی بجھائی کرکے لوگوں میں عداوت پیدا کرتا اور آپس میں دشمنی کو بھڑکاتا تھا اس سبب سے اس کو عذاب قبر ہو رہا ہے۔

ثُمَّ دَعَا بِجَرِیْدَۃٍ۔ جریدہ کھجور کی اس ٹہنی کو کہتے ہیں جس سے پتے یا چھلکا بھی دور کر دیا گیا ہو۔ بعض روایات میں ہے ثُمَّ اَخَذَ جَرِیْدَۃً رَطْبَۃً یعنی پھر آپ نے ایک تر ٹہنی لی فکسرھا

کِسْرَتَیْنِ (توڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے) صحیحین کی روایت میں ہے فَشَقَّهَا بِنِصْفَیْنِ (اس کو چیر کر درمیان سے دو حصّے کر دیئے) فَجَعَلَ کِسْرَةً الخ یعنی ایک ایک ٹکڑا دونوں قبروں پر رکھدیا۔ اور بخاری ومسلم کی روایت میں ہے ثم غرز فی کل قبر واحدۃ (پھر ہر قبر میں ایک ٹکڑا گاڑدیا) فقال پھر آپ نے فرمایا۔ یا صحابہؓ کے سوال کرنے پر (قالوا یا رسول اللہ لم صنعت ھٰذا کما فی الصحیحین)۔ ارشاد فرمایا۔ لَعَلَّهٗ کی ضمیر کے مرجع میں تین احتمال ہیں (۱) العذاب مرجع ہو تو اَنْ یُّخَفَّفَ فعل مجہول ہوگا۔ (۲) اللہ کو مرجع قرار دیں تو فعل معروف ہوگا۔ (۳) اس عمل یعنی پھاڑ کر گاڑ دینے (الغرز) کو مرجع قرار دیں تو فعل معروف اور اسناد مجازی ہوگا۔ وَاِدْخَالُ اَنْ فِیْ خَبَرِ لَعَلَّ مَبْنِیٌّ عَلٰی تَشْبِیْهِهَا بِعَسٰی فافہم۔ عَنْهُمَا صحیح یہی ہے کہ یہ ضمیر تثنیہ ہے۔ بعض روایات میں عَنْهَا توحید و تانیث کے ساتھ بھی وارد ہے۔ جیساکہ مشکوٰۃ الآثار کے نسخوں میں بھی ہے۔ اور اس صورت میں مرجع نفس ہوگا۔ علاوہ ازیں لَعَلَّهٗ کی ضمیر مذکر اور عَنْهَا کی ضمیر مؤنث کا مرجع میت کو بھی قرار دے سکتے ہیں فی الاول باعتبار کونہ انسانا وفی الثانی باعتبار کونہ نفسا ویجوز ان یکون ضمیر لعلہ ضمیر الشان وفی عنہا للنفس۔ اور اگر ضمیر تثنیہ ہو تو ان تاویلات کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ مَا لَمْ یَیْبَسَا۔ بالتذکیر ہے تو مرجع نِصْفَانِ یا قَضِیْبَانِ ہوگا۔ اور بالتانیث ہے تو مرجع الشِقَّتَانِ یا اَلْجَرِیْدَتَانِ ہوگا۔ اس جملہ کا حاصل یہ ہوا کہ آپ نے اس عمل کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ مجھے امید یہ ہے کہ جبتک یہ تر لکڑیاں خشک نہوں گی اسوقت تک ان دونوں انسانوں پر عذاب قبر میں تخفیف ہوجائے گی۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جب آپ نے عذاب قبر محسوس فرمایا تو ان قبروالوں کے لیے سفارش فرمائی تو آپ کو یہ حکم ہوا کہ تر لکڑیاں ان کی قبر پر گاڑدیجئے۔ جبتک وہ خشک نہوں گی آپ کی سفارش کی وجہ سے ان سے عذاب کو ہلکا کردیں گے (اور چونکہ وہ کافر تھے اس لیے عذاب سے مکمل طور پر نجات نہ ہوگی) امام مسلمؒ نے حدیث جابرؓ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ذکر کیا ہے کہ اِنَّ صَاحِبَیِ الْقَبْرَیْنِ اُجِیْبَتْ شَفَاعَتِیْ فِیْهِمَا اَیْ بِرَفْعِ ذٰلِكَ عَنْهُمَا مَا دَامَ الْقَضِیْبَانِ رَطْبَیْنِ (یعنی اللہ تعالیٰ نے دونوں کے بارے میں میری شفاعت رفعِ عذاب کے بارے میں اسوقت تک کے لئے قبول فرمالی ہے جبتک کہ یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں)

(۲) بعض علماء کہتے ہیں کہ درخت اور اس کی ٹہنیاں جبتک خشک نہیں ہوتیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی ہیں۔ اس لیئے ان ٹہنیوں کی تسبیحات کی برکات کی وجہ سے تخفیفِ عذاب کی امید کا اظہار فرمایا گیا۔ چنانچہ آیت شریفہ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ الخ کے تحت بہت سے مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس میں شیٔ سے مراد شیٔ حی ہے۔ اور ہر شیٔ کی حیات اس کی حیثیت کے موافق ہوتی ہے۔

چنانچہ لکڑی کی حیات خشک ہونے تک رہتی ہے۔ اور پتھر کی اس وقت تک رہتی ہے جبتک وہ پہاڑ میں اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ والمحققون علی العموم۔ واللہ اعلم

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ:

واستحب العلماء قراءة القرآن عند القبر لهذا الحديث اذ تلاوة القرآن اولى بالتخفيف من تسبيح الجريدة۔ (مرقاۃ ص ۲۸۶/۱۲)

علماء نے اس حدیث کی بنا پر قبر کے پاس تلاوتِ قرآن کو مستحب سمجھا ہے کیونکہ تلاوتِ قرآن کو تخفیفِ عذاب میں ایک ٹہنی کی تسبیح کی بہ نسبت زیادہ دخل ہونا چاہیئے۔

فوائد اس حدیث پاک سے چند امور مفہوم ہوتے ہیں۔ (۱) عذابِ قبر کا ثبوت جیسا کہ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔ (۲) پیشابوں کی نجاست مطلقاً مفہوم ہوتی ہے۔ (۳) چغلخوری خصوصاً اس کی عادت کی حرمت معلوم ہوئی (فان لفظ کان یدل علی الاستمرار) (۴) یہ بھی معلوم ہوا کہ پیشاب سے بے احتیاطی فسادِ صلوٰۃ کا سبب ہوگا۔ اور ترکِ صلوٰۃ بلاشبہ گناہِ کبیرہ اور عذاب کا سبب ہے۔ لیکن اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ صغیرہ پر بھی عذاب ممکن ہے۔ (۵) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صالحین کا قبور پر گذرنا اور ان کی زیارت کرنا تخفیفِ عذاب کا سبب ہے۔ اور ان کی برکات سے اہلِ قبور کو نفع ہوتا ہے۔ (۶) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبروں پر سے گھاس وغیرہ نہ کاٹی جائے۔ کیونکہ ان کی تسبیحات کی برکت اہلِ قبور کو پہنچتی ہے۔

کیا قبروں پر پھول وغیرہ چڑھا سکتے ہیں؟

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت بریدہ بن الحصیبؓ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری قبر پر دو ٹہنیاں رکھدی جائیں۔ شاید عاشق صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کے مثل فعل سے حصولِ برکت کا ارادہ کیا ہوگا۔ علامہ خطابیؒ نے اس قسم کے کام یعنی قبروں پر ٹہنیاں وغیرہ لگانے کو منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا کہ اس حدیث سے اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں نکلتا۔ (کیونکہ دو کافروں کے لئے آپ نے سفارش فرمائی تھی اور آپ سے ایک وعدہ ہوا تھا کہ جبتک یہ ٹہنیاں خشک نہوں گی عذاب ہلکا کر دیا جائیگا۔ اس حکم کو اہلِ ایمان پر جاری کرنا کھلی زیادتی ہے) حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے اس نکیر کو تسلیم نہیں کیا (وقال قوله لا اصل له ممنوع بل هذا الحديث اصل اصيل له ومن ثم افتى بعض الائمة من متأخري اصحابنا بان ما اعتيد من وضع الريحان والجريدة سنة لهذا الحديث. (مرقاۃ ص ۲۸۶/۱۲)

دورِ حاضر کے مبتدعین اس حدیث کو سُن کر اور بعض علمائے مجہولین کے فتاویٰ کو لیکر خوب بغلیں

بجاتے اور خوشی سے اُچھلتے پھرتے ہیں۔ کہ ان کی ایک جہالت کو کچھ سہارا مل گیا۔ ان نادانوں کا حال تو یہ ہے کہ بندر کے ہاتھ ادرک کی گرہ لگ گئی تو اس نے کہا کہ مجھ سے بڑا پنساری ہی کوئی نہیں ہے۔ اول تو حدیث میں نہ پھولوں کا ذکر ہے نہ چادر کا۔ وہاں لکڑی کا ذکر ہے۔ اس سے پھول، چادر، اگربتی وغیرہ کہاں سے نکل پڑیں۔ اگر ان کو قبروں پہ کچھ چڑھانا ہے تو پیڑ کاٹ کاٹ کر قبروں پر ڈال دیا کریں۔ لیکن کوئی ایسا نہیں کرتا۔ اور جو کرتے ہیں اس کا ثبوت حدیث میں نہیں ہے۔ اور یہ ان کا استدلال تو "ماروں گھٹنا پھوٹے خیر آباد" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ پھر ان نادانوں کو علماء کی اکثریت سے کیوں چڑھ ہے۔ اور ان کا فتویٰ ان کے لیے کیوں ناقابلِ عمل ہے؟ اور بعض غیر مشہور لوگوں کا فتویٰ اُٹھائے پھرنے سے خود ان کی نیت کا پاپ ظاہر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کافروں کی قبروں پر اُن سے عذاب کی تخفیف کے لیے یہ عمل کیا تھا۔ اہلِ بدعت سے پوچھا جائے کہ تم اولیاء اللہ کی قبروں پر کیوں پھول چڑھا رہے ہو؟ اگر اس حدیث کا سہارا لیتے ہو تو معلوم ہوگیا کہ تم اولیاء اللہ کو نہیں مانتے۔ تم ان سے بدگمان ہو۔ تم ان کو ان کی قبروں میں معذب و پریشان حال سمجھ رہے ہو۔ اور اسی عذاب کے ہلکا کرنے کے لیے یہ حرکت کرتے ہو۔ اور کسی مؤمن سے بدگمانی رکھنا خصوصاً اولیاء اللہ کی شان میں ایسی گستاخی کرنا کتنا سخت جُرم ہے؟ الامان والحفیظ۔

مشہور حدیث قدسی میں ہے مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ (العیاذ باللہ)

اور اگر اولیاء اللہ سے تم محبت کرتے ہو اور بدگمانی بھی نہیں رکھتے تو کیا یہ حماقت نہیں کہ ایک محتاج اور پریشان حال بھوکے کو نہ کھلایا جائے، اور جس کو ضرورت نہ ہو اور جو اچھی طرح سیر ہو اسکے منہ میں کھانا ٹھونستے رہو۔ کتنے غریب گنہگار مسلمان ہیں جو ایصالِ ثواب کے مستحق ہیں۔ اور تمہارے پھولوں سے اگر کوئی فائدہ ہوتا ہو تو وہ اس فائدہ کے محتاج ہیں۔ اور تم ان کو چھوڑ کر اولیاء اللہ کی قبروں پر ایسے کام کر رہے ہو۔ بلکہ جس قبر کو تم نے اپنا معبود و مقصود بنا لیا اس کی تو تم خوب پوجا پاٹ کرتے ہو۔ چادر چڑھاتے، گل پوشی کرتے ہو۔ سجدہ ریزیاں کرتے ہو۔ اور عام مسلمانوں کی قبروں میں کھونٹے ٹھونکتے ہو۔ ان پر چڑھتے، بیٹھتے اور ان پر ریح خارج کرتے ہو۔ کیا عام مسلمان کا احترام واجب نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ جن کو تم اپنا معبود و مقصود مانتے ہو انہیں کی کھوپڑی پہ ڈھول پیٹتے ہو۔ شہزادیوں سے قوالیوں کے نام پر خرافات بکواتے ہو۔ اور عورتوں کو عرسوں کے بہانے سے جمع کر کے بدمعاشیاں کرتے اور کراتے ہو۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر عورتوں کو عرسوں اور میلوں میں جانے سے روک دیا جائے تو یہ سب عرس میلے اُجڑ جائیں گے ؎

ہر ادا تیری اے بتِ ناکام غلط = دن غلط، رات غلط، صبح غلط، شام غلط

(۴۳۲) رُاُوْا اور ذُکِرَ دونوں مجہول کے صیغے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں کہ جن کو دیکھ کر اللہ یاد آجاتا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) وہ بندے اللہ جل شانہ کے ساتھ ایسی خصوصیت رکھتے ہیں جیسے خادم کو مخدوم کے ساتھ، غلام کو مولیٰ کے ساتھ یا ایک مخلص دوست کو دوسرے مخلص دوست سے ہو سکتی ہے۔ جب بھی ان بندوں کو دیکھا جاتا ہے فوراً دل میں اُن کے مولیٰ کی یاد آجاتی ہے۔ جیسے غلام کو دیکھ کر آقا کی، خادم کو دیکھ کر مخدوم کی اور ایک دوست کو دیکھکر اس کے ساتھ ہمیشہ رہنے والے دوست کی یاد آیا کرتی ہے۔ (اور یہ لوگ ہمہ وقت اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت کرنے والے اور اس کے دین کی خدمت کرنے والے ہی ہو سکتے ہیں)

(۲) اللہ کے نیک بندوں کا دیکھنا بھی ذکر میں داخل ہے۔ جیساکہ حدیث میں آتا ہے کہ:

اَلنَّظَرُ اِلیٰ وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ (عن ابن الاثیر والطبرانی والحاکم) یعنی علی کو دیکھنا بھی عبادت ہے)

اسی طرح حضرت عائشہ کی روایت مرفوعہ میں ہے اَلنَّظَرُ اِلَی الْکَعْبَۃِ عِبَادَۃٌ (کعبہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے)

ان بہترین بندوں کے مقابلہ میں بدترین بندوں کو بیان فرمایا کہ اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو چغلخوری کرتے پھرتے ہیں۔ دوستوں کے درمیان جدائی پیدا کراتے ہیں۔ اور پاکدامنوں پر الزام و بہتان باندھتے ہیں۔

البرأ بفتح الباء والراء بمعنی البریٔ مصدر وصف به للمبالغۃ العنت مفعول ثان للباغین والاول البراء والعنت بفتح العین والنون بمعنی المشقۃ والفساد والھلاك والاثم والخطاء والغلط والزنا کل ذٰلك قد جاء والحدیث یحتمل المعانی کلھا۔ قال النووی فی شرح مسلم ھو (ای البراء) علیٰ وزن فضلاء جمع بری۔ واللہ اعلم

حضرت عبد الرحمن بن غنمؓ

ھو عبد الرحمن بن غنم الاشعری الشامی ادرك الجاھلیۃ والاسلام واسلم علیٰ عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یرہٗ ولازم معاذ بن جبلؓ منذ بعثہ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیمن الیٰ ان مات معاذؓ (سنۃ ثمانی عشرۃ فی الشام) وکان افقہ اھل الشام روی عن قدماء الصحابۃ مثل عمر بن الخطابؓ ومعاذ بن جبلؓ (غنم بفتح الغین المعجمۃ وسکون النون) مات سنۃ ثمان وسبعین۔ واعلم ان الحدیث مرسل فکان حقہٗ ان یقول عن عبد الرحمن بن غنم مرسلاً تنبیھا علیٰ ذٰلك۔ واللہ اعلم

نسیم احمد الغازی المظاہری

السِّبَابُ وَاللَّعْنُ

گالی دینا اور لعنت کرنا

(۴۳۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَّ قِتَالُہٗ کُفْرٌ۔ (بخاری ص۸۹۳ مشکوٰۃ ص۴۱۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا نافرمانی ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔

(۴۳۴) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ اَنَّہٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَرْمِیْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا یَرْمِیْہِ بِالْکُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَیْہِ اِنْ لَّمْ یَکُنْ صَاحِبُہٗ کَذٰلِکَ۔ (بخاری ص۸۹۳ مشکوٰۃ ص۴۱۱)

حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ نہیں تہمت لگاتا کوئی شخص کسی پر نافرمانی کی اور نہیں الزام لگاتا ہے کسی پر کفر کا مگر وہ اسی پر لوٹ جاتا ہے اگر وہ اس کا اہل نہ ہو۔

(۴۳۵) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ لَمْ یَکُنْ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَّلَا لَعَّانًا وَّلَا سَبَّابًا کَانَ یَقُوْلُ عِنْدَ الْمَعْتَبَۃِ مَا لَہٗ تَرِبَتْ جَبِیْنُہٗ۔ (بخاری ص۸۹۳ مشکوٰۃ ص۵۱۹)

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو کوئی فحش بات فرماتے نہ لعنت کرتے اور نہ گالی دیتے تھے۔ غصہ کے وقت فرمایا کرتے تھے اس کو کیا ہوا اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔

(۴۳۶) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اُدْعُ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ قَالَ اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَّ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً۔ (مسلم ص۳۲۳ ج۲ مشکوٰۃ ص۵۱۹)

حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ مشرکوں کے لیے بد دعا فرما دیجئے آپ نے فرمایا کہ مجھ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا مجھ کو تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

(۴۳۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَجُلًا لَعَنَ الرِّیْحَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنْھَا فَاِنَّھَا مَاْمُوْرَۃٌ وَّاِنَّہٗ مَنْ لَعَنَ شَیْئًا لَیْسَ لَہٗ بِاَھْلٍ

حضرت ابن عباسؓ سے نقل ہے کہ ایک شخص نے ہوا پر لعنت بھیجی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوا پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ تو مامور ہے اور اصول یہ ہے کہ جو کسی ایسی چیز پر لعنت کرتا ہے جو لعنت کی

رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ۔ (ابوداؤد ص مشکوٰۃ ص۴۱۳)

اہل نہیں تو وہ لعنت اسی (لعنت کرنے والے) پر لوٹ جاتی ہے۔

(۴۳۸) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِىْ مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ۔ (مسلم ص۳۲۲ مشکوٰۃ ص۴۱۱)

کہ دو گالی دینے والوں نے جو کچھ بھی کہا تو (سب گناہ) شروع کرنیوالے پر ہوگا جبتک کہ مظلوم حد سے نہ بڑھ جائے۔

لغات اَلسِّبَابُ مص مفاعلة۔ سَبَّ سَبًّا (ن) گالی دینا۔ اَللَّعْنُ (ف) لعنت کرنا، رسوا کرنا، گالی دینا، خیر سے دور کرنا۔ فُسُوْقٌ مص (ن ض ك) بدکار ہونا، راہِ راست سے ہٹ جانا۔ فَاحِشًا قبیح، بدخلق، بہت بخیل، ہر وہ چیز جو حد سے بڑھ جائے۔ کرم سے لازم۔ اَلْمَعْتَبَة مص (ن ض) خفگی کا اظہار کرنا۔

تشریح (۴۳۴) مسلمان کو برا بھلا کہنا نافرمانی ہے۔ اور اس سے لڑنا کفر ہے یعنی سب وشتم تو کسی درجہ میں قابلِ برداشت ہو سکتی ہے لیکن قتل وقتال برداشت نہیں ہو سکتا۔ یہ حرکت کفریہ حرکت ہے۔ اور بڑی حد تک رشتۂ اسلامی کو قطع کر دینے والی ہے۔ اسلام در اصل شہادتین کا نام ہے۔ مگر کچھ مخصوص افعال ایسے ہیں جو اس کی شہادتِ باطنی کے گواہ کہلاتے ہیں۔ ان افعال کو شہادتین کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ گویا یہ افعال شہادتین کا قالب ہیں۔ اس لئے ان افعال کا اختیار کرنا اسلام اور ان کا ترک کفر کے ساتھ موسوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کفر اگرچہ اسلامی عقائد کے برخلاف عقائد کا نام ہے لیکن کفر کی زندگی کے بھی کچھ لوازم ہیں جو بعض اوقات خود کفر نہیں ہوتے مگر انسان کے کافر ہونے کا کھلا ہوا ثبوت شمار ہوتے ہیں احادیث میں اس قسم کے افعال کو بھی کفر کے افعال کہا گیا ہے۔ اور مومن کے لئے یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اس کی زندگی میں یہ کفری افعال نظر آئیں۔ اس لئے اسلام کے بعد اس قسم کے افعال کی وجہ سے کسی کو کافر تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس کفر نما اسلام کو اسلام کہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مسلمان جس طرح کفر وشرک سے بچتا ہے اسی طرح ان افعالِ کفریہ سے بھی اس کو محتاط رہنا چاہیئے۔

والاضافة فی سباب المسلم وقتاله اضافة المصدر الی مفعوله۔ اعلم ان الشتم بغیر حق حرام وقتاله لاجل اسلام کفر بلا شك ومحاربته بالباطل کفر بمعنی کفران النعمة والاحسان فی اخوة الاسلام او ارید التهدید والتغلیظ والتشدید فی الوعید کما فی قوله علیه السلام

من ترك الصّلوٰة متعمّدًا فقد كفر نعم قتل المسلم مع استحلاله كفر صريح۔

(۴۳۵) فَاحِشًا ای آتیا بالفحش من الفعل ولا لعانًا ولا سبّابًا وهما من قبيل الفحش القولی۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو کوئی بے حیائی کا کام کرتے تھے۔ یہ مطلب ہے فَاحِشًا کا۔ اور نہ آپ کوئی بات بے حیائی کی کرتے تھے۔ یہ وَلَا لَعَّانًا وَلَا سَبَّابًا کا مطلب ہوا۔ یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے کہ حرفِ نفی جب مبالغہ پر داخل ہوتا ہے تو نفی مبالغہ یعنی صرف زیادتی معنی کی نفی ہوتی ہے اس لیئے یہاں نفی زیادہ لعنت کرنے اور زیادہ گالی دینے کی ہوئی، نفسِ لعن اور نفسِ سب کی نفی نہیں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کی بے حیائی کی باتیں کرنے اور لعنت اور گالی گلوچ کرنے کی عادت ہوجاتی ہے تو وہ لوگ اس میں بہت بڑھ جاتے ہیں اسی مُعتاد و مروّج طریق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مبالغہ کے صیغوں پر نفی داخل کی گئی جس سے مقصود مُعتاد کی نفی ہے۔ اور مُبالغہ کی نفی اس سے مقصود نہیں۔ لہٰذا معنی یہ نہیں ہوں گے کہ آپ بہت زیادہ لعنت کرنے والے اور بہت زیادہ گالی گلوچ کرنے والے نہ تھے جس سے یہ وہم پیدا ہوجائے کہ آپ لعنت اور سب وشتم کرتے تھے اگرچہ زیادہ نہ کرتے تھے۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ آپ لعنت اور گالی گلوچ بالکل نہ کرتے تھے۔ اور یہاں حدیث کا اخیر حصّہ کان یقول الخ اس معنی کا قرینہ ہے۔ فافهم۔

علامہ طیبیؒ نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ نفی مبالغہ کے مفہوم کا یہاں اعتبار نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں واقع ہوا ہے۔ قرینۂ مدح خود نفی اصلِ معنی پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اگر نفیِ کثرت کا اعتبار کر لیا جائے اور معنی یہ ہوں کہ آپ زیادہ لعنت اور زیادہ سب وشتم نہ کرتے تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کفار و منافقین جو لعنت وسب کے مستحق ہیں ان پر بھی بکثرت لعنت وسب نہ کرتے تھے کہ ان میں سے ہر ہر فرد پر لعنت کرتے رہیں یا اُن کو بُرا بھلا کہتے رہیں۔ بلکہ حسبِ ضرورت کرتے تھے۔ مثلاً قرآن کی تلاوت کے وقت لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ یا ان آیات کی تلاوت میں جو ذمِ منافقین میں نازل ہوئیں، یا اور کسی خاص ضرورت کے موقع پر۔ اور اگر مبالغہ یعنی زیادتِ معنی کا لحاظ کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ لعنت وسب وشتم اتنی زیادہ قبیح چیزیں ہیں کہ مستحقینِ لعنت پر جتنی (حسبِ ضرورت و وقتِ تلاوت) لعنت کی گئی اگر غیر مستحقین پر اتنی کردی جاتی تو لعّان و سبّاب کی صفات صادق آجاتیں۔ مگر کیونکہ مستحقین پر لعن وسب ہوئیں اس لیئے یہ صفات بطور مبالغہ آپ کے لیئے ثابت نہیں ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں صیغہ فَعَّال مبالغہ کے لیئے نہیں بلکہ نسبت کیلیئے ہے۔ جیسے تَمَّار صاحبِ تمر کو اور لَبَّان صاحبِ لبن کو کہتے ہیں۔ مطلب ظاہر ہے کہ آپ

صاحب لعن وصاحب سب نہ تھے۔ جیساکہ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ میں ظلّام ذی ظلم کے معنی میں ہے۔
حاصل یہ ہواکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (غیر مستحقین لعنت وسبّ کفار ومشرکین وفجار ومنافقین وغیرہ کے علاوہ) کسی پر لعنت نہ فرماتے، اور نہ کسی کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ کیونکہ آپ نبیٔ رحمت تھے۔ اسی لیئے آگے بطور جملہ مستانفہ فرمایا گیا کان یقول الخ یعنی ملامت وعتاب اور غضب کے وقت آپ مَالَہٗ تَرِبَ جَبِیْنُہٗ فرمادیا کرتے تھے۔ اس میں ضمیر غائب (ہٗ) اعراض پر دلالت کرتی ہے اور تَرِبَ جَبِیْنُہٗ کے معنی رَغِمَ اَنْفُہٗ کے مثل بھی ہوسکتے ہیں یعنی اس کی پیشانی خاک آلود ہو، یعنی وہ ذلیل وخوار ہوجائے۔ اور دعا کے معنی بھی ہوسکتے ہیں یعنی اس کو اللہ کے سامنے سجدہ کرنے کی توفیق ہوجائے۔
واللہ اعلم۔

(۴۳۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی موقع پر درخواست کی گئی کہ یارسول اللہ آپ ظالم مشرکین کے لیئے بدعا فرمادیجئے۔ تو آپ نے یہ جواب دیا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کرنے والا بناکر نہیں بھیجا گیا، بلکہ مجھ کو رحمت بن کر بھیجا گیا ہے قَالَ تَعَالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (ہم نے آپ کو سارے عالم پر مہربانی کرنے کے لیئے (یا سراپا رحمت بناکر بھیجا ہے) یہ مسلّم ہے کہ آپ کا وجود باجود ساری کائنات کے لیئے سراپا رحمت ہے۔ خصوصًا انس وجن کے لیئے آپ کا رحمت خداوندی ہونا بہت ہی ظاہر ہے۔ خصوصًا مؤمنین کے لیئے تو آپ دارین کی فلاح وفوز کا سبب ہیں۔ اور کافروں پر بھی آپ کی برکت سے اس دنیا میں عذابِ عام نہیں آئے گا۔ گویا آپ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمٰن ورحیم کے ساتھ متخلق اور ان کے مظہرِ اتم ہیں جیس طرح رحمٰن کی رحمت دنیا وآخرت دونوں کو حاوی وشامل ہے۔ اور صفتِ رحیمیت آخرت میں مؤمنوں کے ساتھ خاص ہوگی (وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا) یہی شان آپ کی بھی ہے۔
علامہ طیبیؒ نے اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ الخ کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ میری بعثت اس لیئے ہوئی ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کے قریب کردوں۔ میں اس لیئے مبعوث نہیں ہوا کہ ان کو اللہ سے دور کردوں اور لعنت کے معنی ہیں اللہ کی رحمت سے دور کرنے کے، یا اللہ کی رحمت سے دُوری کی دُعا کرنے کے۔ اور یہ میری بعثت کے منشا اور میری شانِ رحمت کے خلاف ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت میں یہ الفاظ نقل کیئے ہیں اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً وَلَمْ اُبْعَثْ عَذَابًا۔

(۴۳۷) مشکوۃ شریف ص۴۱۳ میں اس حدیث کے شروع میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

اِنَّ رَجُلًا نَازَعَتْهُ الرِّيحُ رِدَاءَهٗ فَلَعَنَهَا ۔ (ایک شخص کی چادر ہوا نے اتار پھینکی تو اس نے ہوا پر لعنت کی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہوا پر لعنت نہ کرو۔ کیونکہ وہ تو مامور ہے خود نہیں چلی۔ اس کو چلایا گیا ہے۔ اور اس کو تیری چادر اتار پھینکنے کا بھی حکم ہوا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ابتلاء وامتحان ہے جس طرح دیگر مصائب اور مزاج کے خلاف پیش آنے والی چیزوں میں ہوتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہوا کا چلنا تو امر خداوندی سے ہوا۔ اور اس کے لوازم وخواص میں سے یہ بھی ہے کہ وہ کپڑوں کو اڑادے۔ چراغ کو بجھادے وغیرہ۔ لہٰذا ہوا پر لعنت نہ کرو۔ اگر کسی کے لاٹھی لگے تو وہ لاٹھی خود نہیں لگی بلکہ وہ جس کے ہاتھ میں ہے اس نے ماری ہے۔ عقلمند لاٹھی کو قصوروار قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح ہوا کا کوئی قصور نہیں۔ اور حق تعالیٰ خالق و مالک اور حکیم وحاکم ہیں۔ ان کو قصوروار قرار دینا جرم عظیم ہے۔ پھر آپ نے وانہ من لعن شیئاً الخ میں ایک اصول ارشاد فرمایا کہ لعنت غیر مستحق کو نہیں پہنچتی بلکہ مستحق کو تلاش کرتی ہے۔ اگر وہ شئی مستحق لعنت نہیں جس پر لعنت کی گئی ہے تو وہ لعنت کرنے والے ہی پر لوٹ آتی ہے۔ کیونکہ یہ غیر مستحق پر لعنت کر کے خود قصوروار و مستحق لعنت ہو گیا۔

حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا لَعَنَ شَيْئًا صَعِدَتِ اللَّعْنَةُ اِلَى السَّمَاءِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ دُوْنَهَا ثُمَّ تَهْبِطُ اِلَى الْاَرْضِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُهَا دُوْنَهَا ثُمَّ تَاْخُذُ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا فَاِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَاغًا رَجَعَتْ اِلَى الَّذِيْ لَعَنَ فَاِنْ كَانَ لِذٰلِكَ اَهْلًا وَّاِلَّا رَجَعَتْ اِلٰى قَائِلِهَا۔

(مشکوٰۃ ص۴۱۳)

بیشک جب کوئی بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے تو آسمان کے دروازے اس کے سامنے سے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی طرف اترتی ہے تو زمین کے دروازے اسکے سامنے سے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ داہنے اور بائیں جاتی ہے۔ پھر جب وہ کوئی راستہ نہیں پاتی تو اس کی طرف لوٹتی ہے جس پر لعنت کی گئی ہے۔ اور اگر وہ اس کا مستحق ہوتا ہے تو اس پر واقع ہو جاتی ہے ورنہ لعنت کرنے والے کی جانب لوٹ جاتی ہے۔

یعنی اوپر نیچے داہنے بائیں ہر طرف بھٹکتی پھرتی ہے۔ آخر کار اپنے مستحق پر واقع ہو جاتی ہے۔ خواہ مستحق وہ ہو جس پر لعنت کی گئی یا خود لعنت کرنے والا ہو۔ بہرحال لعنت اپنے صاحب و مستحق کا راستہ ڈھونڈھ لیتی ہے اور اس کو پہونچ جاتی ہے۔ یہی حال رحمت کا بھی ہے۔

(۴۳۸) مشکوٰۃ شریف ص۴۱۳ میں یہ حدیث بحوالہ مسلم حضرت انسؓ وحضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔

المستبان بتشدید الباء باب تفاعل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے ای المتشاتمان (ایکدوسرے کو گالی دینے والے) یہ مبتدا ہے۔ اور ما قالا ای اثم قولهما خبر ہے۔ فعلی البادی ای علی المبتدی فقط۔

اس میں فاء جزائیہ ہوگی۔ اگر لفظ مَا کو شرطیہ یا موصولہ متضمن لمعنی الشرط قرار دیں وقال الطیبی یجوز ان تکون ما شرطیة وقوله فعلی البادئ جزاءہ اوموصولة فعلی البادئ خبرہ والجملة مسببة (مرقاة) اور لفظ البادئ بالہمزہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دو آدمی جو ایکدوسرے کو گالی دے رہے ہیں ان دونوں کی گالیوں اور برا بھلا کہنے کا سارا گناہ صرف ابتداء کرنے والے پر ہوگا کیونکہ وہ اس جھگڑے اور گالی گلوچ کے گناہ والے کام کا سبب بنا ہے۔ مالم یعتد المظلوم جبتک مظلوم حد سے نہ بڑھ جائے۔ لیکن اگر ابتداء کرنے والے سے وہ آگے بڑھ گیا یعنی جواب میں اس نے زیادتی کی۔ گالی گلوچ اس سے زیادہ کردی۔ اور تکلیف زیادہ پہنچائی تو اب یہ مظلوم ظالم بن گیا۔ اس زیادتی کا گناہ اس کو ہوگا۔ وفی شرح السنة من اربی الربوا من یسب سبتین بسبة (بدترین سود یہ ہے کہ آدمی ایک گالی کے بدلے دو گالیاں دے)

اَلْھِجْرَةُ

قطع تعلق کرنا

(۴۳۹) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوایوب انصاری سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

قَالَ لَا یَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ

کہ کسی آدمی کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی (مسلمان) کو تین دن سے زائد چھوڑ دے۔ دونوں ملیں تو یہ

ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔ (بخاری ص۸۹۷ مشکوٰۃ ص۴۲۷)

بھی منہ پھیرلے اور یہ بھی منہ پھیرلے۔ اور ان دونوں میں زیادہ اچھا وہ ہے جو پہلے سلام کرلے۔

(۴۴۰) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تُعْرَضُ

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کے اعمال ہر ہفتہ

اَعْمَالُ النَّاسِ فِیْ کُلِّ جُمُعَةٍ مَّرَّتَیْنِ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَیَوْمَ الْخَمِیْسِ

میں دوبار پیش کیئے جاتے ہیں پیر کے دن اور جمعرات کے دن۔ تو ہر مؤمن

فَیُغْفَرُ لِکُلِّ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اَخِیْہِ شَحْنَآءُ فَیُقَالُ

بندہ کی مغفرت کی جاتی ہے مگر اس بندہ کی مغفرت نہیں کی جاتی کہ اس بندہ اور اس کے

اُتْرُکُوْا ھٰذَیْنِ حَتّٰی یَفِیْئَا۔ (مسلم ج۲ ص۳۱۷ مشکوٰۃ ص۴۲۸)

بھائی کے درمیان کینہ ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو صلح کرنے تک چھوڑ دو۔

لغات الھجرۃ (ن) قطع تعلق کرنا۔ اعراض کرنا، چھوڑنا۔ تعرض اِفعال سے روگردانی کرنا، ظاہر کرنا وغیرہ۔ (ض) پیش کرنا۔ مُرّ۔ شَحْنَاء بغض، کینہ، دشمنی، عداوت۔ (ف) لادنا، بھرنا۔ (س) کینہ رکھنا۔ یَفِیْئَا (ض) لوٹنا۔

تشریح (۴۳۹) یہاں اخوۃ سے مراد اخوتِ اسلام ہے۔ خواہ اخوتِ قرابت ہو یا اخوتِ صحبت، بہرحال حرمتِ ہجران کی علت یہی اخوتِ اسلام ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر یہ علت مرتفع ہوجائے گی تو حکم بھی ختم ہوجائے گا۔ یعنی جہاں شرطِ اخوتِ اسلام نہ رہے گی حرمتِ ہجران کا حکم بھی نہ رہے گا۔ چنانچہ اہلِ بدعت واہلِ ہوٰی بددینوں اور باطل پرستوں کا چھوڑ دینا، ان سے تعلقات ختم کردینا واجب ہے۔ جبتک کہ وہ فسق و بدعت اور باطل سے توبہ نہ کرلیں۔ اسی طرح ایسے لوگوں سے ہمکلامی و تعلقات کا منقطع کرنا ضروری ہوگا جنکے ساتھ مکالمہ و صحبت رکھنے سے دینی مضرت و فساد کا اندیشہ ہو، یا دنیوی مضرت و نقصان کا خطرہ ہو۔ وعلیہ اجماع العلماء۔

فَوْقَ ثَلٰثِ لَیَالٍ ای بایّامھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تین دن تک چھوٹ چھٹاؤ جائز ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کو غصہ ایک طبعی اور فطری چیز ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس میں بندوں کو سہولت عطا فرمائی۔ کہ وہ اپنے طبعی تقاضے کو بھی پورا کرلیں، مگر یہ تقاضا فساد کا باعث نہ ہونا چاہیئے۔ اس لیئے صرف تین دن کی رخصت و مہلت عطاء فرمادی۔ تین دن میں آدمی اپنے غصہ پر قابو بھی پاسکتا ہے۔ اور اس قلیل مدت میں چنداں اندیشۂ فساد بھی نہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ تین روز تک جوازِ ہجران بطور مفہومِ مخالف سمجھ میں آتا ہے۔ لہٰذا جن کے نزدیک نصوص میں مفہومِ مخالف کا اعتبار ہے جیسے حضراتِ شافعیہ۔ تو یہ حکم جوازِ ہجران انہی کے نزدیک اس حدیث سے مستنبط ہوسکتا ہے۔ دوسروں کے نزدیک نہیں۔ مثلاً حضراتِ احناف مفہومِ مخالف کو حجت نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک اس حدیث سے یہ حکم ثابت نہ ہوگا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت وجواز ہے، حرمت اصل نہیں ہے۔ اور شارع نے اس مہاجرت کو حرام قرار دیا ہے جو فوق ثلث لیالٍ کی قید کے ساتھ مقید ہے۔ تو اس سے کم کی مہاجرت اپنی جگہ پر جائز و مباح باقی رہی۔ اس طرح حکمِ اباحت کو اس حدیث کے مفہوم سے مستنبط ماننے کی ضرورت ہی نہیں علاوہ ازیں مہاجرت کو اگر مطلقاً حرام قرار دیدیا جائے تو اس میں حرجِ عظیم واقع ہوگا۔ اسکا مطلب

تو یہ ہوگا کہ غضب کو جو آدمی کی فطری چیز ہے قطعاً حرام وگناہ قرار دیدیا جائے۔ جو تکلیف مالا یطاق ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بظاہر دوستوں اور بھائیوں کے بارے میں ہے۔ والد و ولد اور تلمیذ واستاذ کا معاملہ اس سے جداگانہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان مہاجرت عداوت اور بغض وکینہ کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ جو اصل علت حرمت ہے۔

فیعرض هذا الخ یہ بطور استیناف کیفیت ہجران کا بیان ہے۔ اور اگر اس کو یھجر کے فاعل یا مفعول سے حال مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ اگر ملاقات و اعراض نہیں ہے تو مطلق ہجران حرام نہیں۔ وخیرهما کیونکہ بغض وعداوت سے توبہ ضروری ہے۔ اور آپس میں صلح صفائی بھی لازم ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک سلام کرے دوسرا جواب دے۔ لیکن جو ابتداء بالسلام کر رہا ہے وہ ان دونوں میں افضل ہے۔ کیونکہ اس نے صلح کی طرف اول پیش قدمی کی۔ اور وہ صاحب تواضع، صاف دل اور حسن خلق کی صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اور اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے دوستانہ تعلقات، اور محبت وصحبت کو قائم ودائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس سے کم درجہ کا وہ ہے جو سلام کا جواب دے۔ کہ جواب سلام واجب ہے۔ اور اگر وہ سلام کا جواب نہ دے تو وہ تارک واجب فاسق ہے۔ اس میں کوئی خیر نہیں۔ اور اس کا ہجران بھی جائز بلکہ فاسق ہونے کی وجہ سے واجب ہے۔

وفیه حث علی ازالة الهجران وانه یزول بمجرد السلام وفیه ایماء بانه لا ینبغی لمسلم ان یبدأ بالکلام قبل السلام۔

(۳۰۴) فی کل جمعة بضم الجیم والمیم ویجوز سکون المیم۔ جمعہ سے مراد اسبوع یعنی ہفتہ ہے۔ یوم الاثنین ویوم الخمیس ظرفیت کی بنا پر منصوب ہیں۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کو مرتین سے بدل مانا جائے۔ تاکہ معنوی اعتبار سے یہ وہم نہ ہو جائے کہ پیر کے دن دو مرتبہ اور جمعرات کے دن دو مرتبہ اعمال پیش ہوتے ہیں، حالانکہ یہ خلاف مقصود ہے۔ لیکن اس حدیث میں اس کا بیان نہیں کہ اعمال کس پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ معروض علیہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ یا وہ ملک جن کے ذمہ تمام اعمال ناموں کا نظم وضبط ہے۔ لیکن اول (یعنی یہ کہ معروض علیہ حق تعالیٰ ہیں) صحیح ہے۔ چنانچہ طبرانی نے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ میں اسکی تصریح ہے۔

تعرض الاعمال علی الله یوم الاثنین والخمیس فیغفر الله الا ما کان من متشاحنین او قاطع رحم۔	اللہ تعالیٰ پر پیر اور جمعرات کے دن اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ بغض وکینہ رکھنے والوں اور رشتہ ناطہ توڑنے والے کے سوا سب کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

وفی روایۃ الحکیم عن والد عبد العزیز ولفظہ تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس علی اللہ تعالیٰ وتعرض علی الانبیاء وعلی الآباء والامھات یوم الجمعۃ فیفرحون بحسناتھم وتزداد وجوھھم بیاضاً واشراقاً فاتقوا اللہ ولا تؤذوا موتاکم۔ (مرقات ص۱۹، ۴)

اَلْفُحْشُ وَالْبَذَاءُ

بدگوئی و بیہودگی

(۱۴۴) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰہِ مَنْزِلَۃً یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مَنْ تَرَکَہُ النَّاسُ اِتِّقَاءَ فُحْشِہٖ۔ (بخاری ص۸۹۴، مشکوۃ ص۴۱۲)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک اللہ کے نزدیک قیامت کے دن لوگوں میں سب سے برا مرتبہ میں وہ شخص ہوگا کہ جس کو لوگوں نے اس کی بدزبانی کیوجہ سے چھوڑ دیا ہو۔

(۲۴۴) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّۃِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِی النَّارِ۔ (ترمذی ص۲۲، مشکوۃ ص۴۳۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حیاء ایمان کا اہم شعبہ ہے۔ اور (اہل) ایمان جنت میں داخل ہوگا۔ اور بے حیائی جفا کا حصہ ہے۔ اور جفا (والا) جہنم میں جائیگا۔

(۳۴۴) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُّوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَاِنَّ اللّٰہَ یَبْغَضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ۔ (ترمذی ص۲۱، مشکوۃ ص۴۳۱)

حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ بیشک ہر چیز سے زیادہ وزنی جو چیز مومن کی ترازو میں قیامت کے دن رکھی جائیگی اچھے اخلاق ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتے ہیں بدگو بے شرم کو۔

تشریح (۱۴۴) پوری حدیث کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص نے جس کا نام عُیینۃ الفزاری تھا۔ یا مخرمۃ بن نوفل تھا۔ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ شخص عیینۃ بن حصن تھا۔ اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ یونہی اظہارِ اسلام کرتا تھا (اس نے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا کہ آنے کی اجازت دیدو۔ لیکن وہ اپنی قوم کا برا آدمی ہے۔ اس بات کے فرمانے سے اس کی غیبت مقصود نہ تھی، بلکہ لوگوں کو اس کے حال پر آگاہ کرنا تھا۔

تاکہ جن لوگوں کو اس کا حال معلوم نہیں وہ اس سے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ اور یہ آگاہی بسا اوقات ضروری بھی ہوتی ہے۔ (غیبت کا تفصیلی بیان اور اس کے ضروری احکام قریب ہی میں لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا کے تحت گذر چکے ہیں) پھر جب وہ شخص حاضرِ خدمت ہوا اور آپ کی مجلس میں بیٹھا تو آپ اس کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی و خوش اخلاقی سے پیش آئے، اس سے بہت نرم گفتگو فرمائی۔ اور اپنے قریب بٹھایا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ اکرام اور دلجوئی اس لئے فرمائی تاکہ وہ اسلام سے مانوس ہو۔ اور آپ کا یہ برتاؤ اس کے ایمان و اخلاص کا سبب بنے۔ نیز اس کے شر سے حفاظت رہے۔ پھر جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے تو اس کے بارے میں اس کے آنے سے پہلے ایسی ایسی باتیں ارشاد فرمائی تھیں اور جب وہ آگیا تو آپ نے ایسے بُرے آدمی کے ساتھ اسقدر خوش اخلاقی کا برتاؤ فرمایا۔ بظاہر یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں آپ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ تم نے مجھ کو فحش باتیں کرنے والا اور اخلاق سے گر کر برتاؤ کرنے والا کب پایا ہے۔؟ پھر ایک اصولی بات اور اس برتاؤ کی علت بیان فرمائی کہ اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللہِ الخ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن درجہ کے اعتبار سے انسانوں میں بدترین انسان وہ ہے کہ جس کی بداخلاقی و بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔ یہاں روایات میں دونوں لفظ ہیں اِتِّقَاءَ شَرِّہٖ اور اِتِّقَاءَ فُحْشِہٖ اور مطلب ایک ہی ہے۔ یعنی جس طرح اچھے اخلاق والا قیامت کے دن سب سے زائد بلند مرتبہ ہوگا۔ اسی طرح بداخلاق کا مرتبہ سب سے زیادہ پست اور بُرا ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے نبیؐ کے لئے یہ پستی نازیبا تھی۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جیسا فرمایا تھا ویسا ہی وہ ثابت ہوا۔ کہ وفاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ مرتد ہوگیا۔ اور جنگ میں مسلمانوں سے مقابلہ کیا۔ پھر صدیق اکبرؓ کے پاس اس کو گرفتار کرکے لایا گیا۔ پھر وہ مسلمان ہوگیا۔ اس کو لوگ احمق کے لقب سے پکارتے تھے۔ شراح نے اس حدیث کے تحت بہت سے فوائد بیان فرمائے ہیں جو متفرق طور پر اس کتاب میں آبھی گئے ہیں۔ اس لئے اختصار کے پیشِ نظر ہم ان کو ترک کر رہے ہیں۔ یہاں صرف ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ میں مدارات کو اختیار فرمایا جو مستحسن ہے لیکن مداہنت جائز نہیں۔ اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ مدارات کے معنی ہیں دنیا کو قربان کر دینا دُنیا یا دین یا دین ودُنیا دونوں کی صلاح و درستی کے لئے۔ اور مداہنت کا مطلب ہے دین کو تج دینا دُنیا بنانے کے لئے۔ اس فرق کو سمجھنے کے بعد یاد رکھیئے کہ مدارات جائز بلکہ مستحسن ہے اور مداہنت ناجائز ہے۔ اکثر لوگ ان میں فرق نہیں کرتے، اور مداہنت کو مدارات سمجھتے ہیں۔ اور ایک ناجائز امر کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ اور مداہنت سے بچنے والوں کو طعنے بھی

دیتے ہیں۔

(۴۴۲) الحیاء من الایمان یعنی حیا ایمان کا ایک بڑا شعبہ ہے جیساکہ دوسری روایت میں مذکور ہے الحیاء شعبۃ من الایمان۔ یہ روایت مع تفصیلات عنوان "اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ" کے تحت نمبر ۱۴ پر جزء اوّل کے شروع میں، نیز "اماطۃ الاذی" کے تحت نمبر ۲۶۵ میں جزء ثانی میں گذر چکی ہے۔ اور الحیاء کے عنوان کے تحت از نمبر ۳۳۷ تا نمبر ۳۴۱ حیاء کی تفصیلات جزء ثانی میں گذر چکی ہیں۔

وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّۃِ ای واھل الایمان فی الجنۃ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو عین ایمان سے تعبیر کرکے ان کے ایمان کے رسوخ اور مضبوطی کو بیان کرنا ہے۔ جیساکہ قرآنِ پاک کی آیت وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ میں بھی حضرات انصارؓ کے ایمان کی مضبوطی و استقامت کو بیان کرنا ہے کہ گویا وہ لوگ ایمان کا مقر اور ٹھکانہ ہیں۔ وَالْبَذَاءُ بفتح الباء خلاف الحیاء جس سے فحش قولی اور بداخلاقی پیدا ہوتی ہے۔ من الجفاء خلاف البر۔ بِرّ سے وفاء پیدا ہوتی ہے اور جفا سے بے وفائی و غداری پیدا ہوتی ہے۔ یعنی بے حیائی و بے شرمی جفا (سنگدلی) و بے وفائی کا منشاء اور اس کا بڑا شعبہ ہے۔

والجفاء فی النار ای اھل الجفاء فی النار۔ یہاں بھی تعبیر حسبِ سابق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غلاظتِ طبع و قساوتِ قلب (طبیعت اور دل کی سختی) والے دوزخ میں جائیں گے۔ کیونکہ اہلِ جفاء کا بے وفا و غدار ہونا ضروری ہے۔ جیسے باحیاء کا باایمان ہونا لازم ہے۔ اگر جفاء کا کمال درجہ حاصل ہے۔ تو ابدالآباد کے لیے دوزخ میں جائیگا۔ ورنہ ایک مدت کے لیئے دوزخ میں سزا بھگت کر آخر کار جنت میں داخل کردیا جائیگا۔

(۴۴۳) یُوْضَعُ ای ثوابہٗ او صحیفتہٗ او عینہ المجسد علی اختلاف الاقوال کما مرّ فی الجزء الاوّل من ھٰذا الکتاب تحت "والیوم الآخر"۔ خُلُقٌ حَسَنٌ فانّ اللہ یحبّہٗ ویرضی عن صاحبہ ویحبہ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم کما قال علیہ السلام ان من احبکم الیّ احسنکم اخلاقًا (رواہ البخاری مشکوٰۃ ص۴۳۱) وَاِنَّ اللہَ یَبْغَضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ فانہٗ خلاف صاحب خلق حسن وھو سیئ القول وسیئ الخلق فلیس لہٗ وزن ولا قدر عند اللہ یوم القیٰمۃ وھو مبغوض للہ تعالیٰ فلا یقیم لہٗ یوم القیٰمۃ وزنًا۔ وھٰذا المعنی مفہوم من المقابلۃ بین القسمین۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ بسم احمد غاشی مظاہری

اَلْمُجَاهَرَةُ وَالْمُجَانَةُ

اظہارِ گناہ اور بے باکی

(۴۴۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپؐ

یَقُوْلُ کُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًی اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمُجَانَةِ اَنْ یَّعْمَلَ الرَّجُلُ

فرماتے تھے کہ میری ساری اُمّت کو عافیت دیجائے گی مگر گناہ ظاہر کرنیوالوں کو۔ اور یقیناً یہ بات بے پروائی کی ہے کہ

بِاللَّیْلِ عَمَلًا ثُمَّ یُصْبِحُ وَقَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَیَقُوْلُ یَا فُلَانُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ کَذَا

آدمی رات میں کوئی (گناہ کا) کام کرے پھر وہ ایسی حالت میں صبح کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسپر پردہ ڈالدیا تھا لیکن وہ کہنے لگے

وَکَذَا وَقَدْ بَاتَ یَسْتُرُهُ رَبُّهُ وَیُصْبِحُ یَکْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ۔

او فلاں میں نے رات ایسا ایسا (گناہ) کیا ہے حالانکہ رات اس طرح گذاری کہ اسکے رب نے پردہ پوشی کی تھی اور وہ صبح کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے اللہ کے پردہ کو کھولدیتا ہے۔ (بخاری ص ۸۹۶ ج ۲، مشکوٰۃ ص ۴۱۲)

لغات

اَلْمُجَاهَرَةُ باب مفاعلة کا مصدر ہے، کھلم کھلا ظاہر کرنا، غلبہ کی کوشش کرنا، یہاں مراد ہے اپنے گناہ کو دوسروں پر ظاہر کرنا۔ (ف) اعلان کرنا، آواز بلند کرنا وغیرہ (س) چندھیا جانا۔ (ک) بلند ہونا، بلند بانگ ہونا وغیرہ۔ اَلْمُجَانَةُ (ن) موٹا اور سخت ہونا۔ بے حیا ہونا، مخول کرنا، بے پروا ہونا۔ مُعَافًی باب مفاعلة سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، عافیت وسلامتی دیا ہوا۔

تشریح

اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ: مشکوٰۃ کے تمام نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح بالرفع ہے، قاعدہ کے مطابق منصوب ہونا چاہیئے کیونکہ یہ استثناء کلامِ موجب میں واقع ہے۔ لیکن مستثنیٰ منہ مُعَافًی معنیٰ میں نفی کے ہے ای کُلُّ اُمَّتِیْ لَا ذَنْبَ عَلَیْهِمْ اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ۔ حافظ ابوموسیٰ کے مجموعہ اور نہایہ میں اِلَّا الْمُجَاهِرِیْنَ منصوب موافق قاعدہ وارد ہوا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اس جملہ کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ کلّ امّتی یُترکون عن الغیبة الّا المجاهرون جیسا کہ من القی جلباب الحیاء فلا غیبة لهٗ ہے۔ گویا یہاں عفو بمعنیٰ ترک ہے۔ یعنی میری اُمّت میں سے کسی کی غیبت نہ کی جائے مگر ان لوگوں کی غیبت میں کوئی حرج نہیں جو خود ہی اپنی پردہ دری کرتے پھرتے ہوں

اور اپنی ذلت ورسوائی کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ اور ترک میں نفی کے معنی موجود ہیں۔ کیونکہ ترک کے معنی یہاں لایغتاب کے ہوئے اس لیئے الاّ المجاھرون بالرفع درست ہوگا۔ لیکن اس حدیث میں بظاہر اس معنی پر کوئی قرینہ و دلیل نہیں۔ اسی طرح اس سے پہلے معنی لاذنب علیہم الاّ المجاھرون بھی علی الاطلاق درست نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ جو چھپا کر گناہ کرتے ہیں گناہگار تو وہ بھی ہیں۔ بلکہ بہتر معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ:

کل امتی لایواخذون اخذاً شدیداً ولایعاقبون عقاباً شدیداً الاّ المجاھرون۔ واللہ اعلم

وَاِنَّ مِنَ الْمَجَانَۃِ یعنی النسان کا لاابالی پن اور اس سے بے پروائی کروہ کیا کر رہا ہے اور لوگ اس کو کیا کہہ رہے ہیں یہ ہے کہ آدمی رات میں کوئی گناہ و نافرمانی کر کے خود ہی صبح کو دوسروں سے ظاہر کر دے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کو ظاہر نہ کیا تھا بلکہ ستّاری فرمائی تھی ثُمَّ یُصْبِحُ اور فیقول بالنصب والرفع دونوں طرح جائز ہیں۔ ان یعمل پر عطف مانیں تو نصب اور ثمّ ھو یصبح اور فیقول کا عطف اس پر کریں تو دونوں میں رفع ہوگا۔ وقد بات حال یکشف یصبح کی خبر ہے۔ سِتْرَ اللہ بکسر السین بمعنی السترۃ والحجاب وفی نسخۃ بفتحہا وھو مصدر والمقصود غایۃ الاستغراب ولذا وقع فی الکلام نوع من الاطناب۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اَلْمِرَاءُ

جھگڑا کرنا

(۴۴۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُمَارِ اَخَاكَ

حضرت ابن عباسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ تم اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرو

وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ۔ (ترمذی ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۲)

اور نہ اس سے مذاق کرو اور نہ اس سے ایسا وعدہ کرو کہ اس کو پورا نہ کرو۔

تشریح لَا تُمَارِ۔ المِرَاءُ والمُمَارَاۃُ آپس میں جھگڑا کرنا، دشمنی کرنا۔ اخاک سے مراد مسلمان ہے۔ وَلَا تُمَازِحْهُ ای بمایتأذی منہ اویفضی المزاح الی ایذائہ من ھتک السترۃ وغیرہ

وَلَا تَعِدْ مَوْعِدًا یہ مصدر میمی ہے یا اسم ظرف مکان یا ظرف زمان ہے۔ تینوں احتمالات صحیح ہیں۔

فَتُخْلِفَهُ اِخْلَاف (افعال) سے ہے اور منصوب ہے۔ جواب نہی واقع ہونے کی بناء پر اَنْ مقدر ہے۔ اور اگر مرفوع پڑھیں تو معنی ہوں گے فَاَنْتَ تُخْلِفُهُ تو یہ جملہ خبریہ جملہ انشائیہ سابقہ پر عطف ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ اس ارشاد میں تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے۔ (۱) اپنے مسلمان بھائی سے

جھگڑا اور دشمنی نہ کرو۔ اس کی تفصیل "ومنھا اصلاح ذات البین" اور "الحسد" وغیرہ عنوانات کے تحت آچکی ہے۔ (۲) اور اپنے بھائی سے ایسی مزاح نہ کرو جس سے اس کو ایذاء پہونچے۔ آگے ایک عنوان "الضحک" چھوڑ کر "المزاح" میں اس کا بیان آرہا ہے۔ (۳) کسی مسلمان سے وعدہ خلافی نہ کرو۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ اگر وعدہ جائز ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیئے۔ لیکن ایفائے وعد واجب ہے یا مستحب عمر بن عبد العزیز وغیرہ ایک جماعت کا مسلک ہے کہ وعدہ کا ایفاء واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ و امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ ہاں ترکِ وفاء سخت مکروہ ہے۔ اور اگر عدمِ ایفاء سے قصد ایذاء ہے تو عدمِ ایفائے وعد میں گناہگار بھی ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ وعدہ کے وقت توقع اور امید کے الفاظ کہے۔ مثلاً امید ہے کہ میں ایسا کرونگا، یا انشاء اللہ کہے اور وعدہ پورا کرنے کا عزم کرے۔ لیکن اگر وعدہ کرتے وقت عدمِ ایفاء کا عزم ہے تو یہ نفاق ہے۔ عنوان "والموفون بعھدھم" کے تحت جزء اوّل میں اس کی پوری تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

اَلضِّحْكُ

ہنسنا

(۴۴۶) عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
حضرت بہز بن حکیم سے ان کے باپ سے ان کے داداسے منقول ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلٌ لِّلَّذِيْ يُحَدِّثُ بِالْحَدِيْثِ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ
ہلاکت ہے اس کے لیئے جو کوئی بات اس لیئے کہتا ہے کہ لوگ اس سے ہنسیں۔ اور وہ
فَيَكْذِبُ وَيْلٌ لَّهٗ وَيْلٌ لَّهٗ۔ (ترمذی ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۲)
جھوٹ بولتا ہے ہلاکت ہے اس کے لیئے بربادی ہے اس کے لیئے۔

(۴۴۷) عَنْ جَرِيْرٍ قَالَ مَا حَجَبَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْذُ اَسْلَمْتُ
حضرت جریرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کبھی نہیں روکا جب سے میں مسلمان ہوا
وَلَا رَاٰنِيْ اِلَّا تَبَسَّمَ فِيْ وَجْهِيْ۔ (بخاری ص۹۰۰ مشکوٰۃ ص۴۰۶)
اور مجھ کو آپنے کبھی نہیں دیکھا مگر میرے سامنے مسکرائے۔

(۴۴۸) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا
حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کھل کھلا کر ہنستے نہیں دیکھا۔
قَطُّ ضَاحِكًا حَتّٰى اَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ (بخاری ص۹۰۰ مشکوٰۃ ص۴۰۶)
کہ میں آپ کے حلق کا گوشت دیکھ لیتی آپ تو صرف مسکرایا کرتے تھے۔

تشریح ضحك (س) ہنسنا۔ قاموس میں ہے ضحك ضحكًا بالفتح والکسر وبکسرتین ککتف واضح رہے کہ تبسم (مسکرانا) ضحک (ہنسنا) قہقہہ (کھل کھلاکر ہنس پڑنا) منہ تو ان تینوں میں کھلتا ہے۔ مگر تبسم میں آواز بالکل نہیں ہوتی۔ ضحک میں آواز تو ہوتی ہے مگر خفیف سی۔ اور قہقہہ میں اچھی خاصی آواز ہوتی ہے۔ اسی طرح منہ کھلنے میں فرق ہوتا ہے۔ تبسم میں صرف دانت کھلتے ہیں ضحک میں تھوڑا سا منہ کھلتا ہے اور قہقہہ میں زیادہ۔ یہانتک کہ قہقہہ والے کے حلق کا کوّا اور اس کی ڈاڑھیں بھی نظر آجاتی ہیں۔

(۴۶۴) عن بهز بفتح الباء وسكون الهاء وبالزاء بن حكيم تابعی اختلف فيه العلماء فقد تكلّم بعضهم فيه (فی بهز) ووثقه جماعة روی عنه جماعة ولم يخرج البخاری ومسلم فی صحيحهما شيئًا منه وقال ابن عدی ولم اری حديثه منكرًا عن ابيه ای حكيم بن معاوية القشيری البصری قال البخاری فی صحبته نظر روی عنه ابن اخيه معاوية بن حكيم وقتادة عن جدّه ای معاوية بن حيدة بفتح الحاء وسكون الياء بعده دال مهملة۔

حاصل یہ ہے کہ بہز اپنے والد حکیم سے روایت کرتے ہیں۔ اور حکیم بہز کے دادا یعنی اپنے والد معاویہ ابن حیدہ سے نقل کرتے ہیں۔ ضمیروں کے مراجع کے بارے میں ظاہر یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

ویل کے معنی ہلاکت کے بھی آتے ہیں اور دوزخ کی ایک گہری وادی کا بھی نام ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہلاکت یا وادیِ جہنم ہے اس شخص کے لیئے جو لوگوں سے جھوٹی باتیں کہتا ہے اور مقصد ان کو ہنسانا ہوتا ہے۔ لِيُضْحِكَ اگر باب افعال سے پڑھیں تو فاعل ضمیر مَنْ ہے۔ اور اَلْقَوْم مفعول بہ ہوگا۔ اور اگر باب سَمِعَ سے پڑھیں تو لفظ اَلْقَوْم اس کا فاعل ہوگا۔ اوّل صورت میں معنی ہوں گے "تاکہ ہنسائے وہ شخص لوگوں کو ان جھوٹی باتوں سے" اور دوسری صورت میں معنی ہوں گے "تاکہ لوگ اس کی جھوٹی باتوں سے ہنسیں" اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر ہنسانے کے لیئے کوئی سچی بات کہہ دے بشرطیکہ صرف بیہودگی پیشِ نظر نہ ہو بلکہ لوگوں کو خوش کرنا یا اور کوئی بہتر مقصد ہو مثلاً غصّہ دُور کرنا وغیرہ تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ ایسا ہنسانا اکثر باعثِ ثواب ہوگا۔ مثلاً جب ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات اُمّہات المؤمنین سے خفا ہو گئے تھے تو حضرت عمرؓ نے ایک ہنسی کی بات کہہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسا دیا تھا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گاہے مزاح فرماتے تھے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تو مزاح میں سچ بولے اور کسی کے قلب کو ایذاء نہ پہونچائے اور اس میں افراط اور زیادتی نہ کرے، اور کبھی کبھی ایسا کرے، عادت نہ بنائے۔

تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔ لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ آدمی مزاح، ہنسی، دل لگی کو عادت بنا لے۔
اور اس میں افراط سے کام لے۔ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل (مزاح) سے دلیل پکڑنے لگے۔
تو وہ شخص ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص ہے جو ناچنے والے حبشیوں کے ساتھ ہو جائے اور ان کا ناچ
دیکھتا رہے۔ اور اس کے جواز کی دلیل یہ بیان کرنے لگے کہ آپ نے حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کا
کھیل دکھایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ استدلال معقول نہ ہوگا۔

وَيۡلٌ لَّهٗ وَيۡلٌ لَّهٗ۔ یہ لفظ دو بار مزید تاکید کے لئے فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ ویل
تین بار آیا ہے۔ اول کا تعلق عالم برزخ سے ہے۔ دوسرے کا موقف حساب (حشر) سے ہے۔ اور
تیسرے کا جہنم سے۔ واللہ اعلم

(۴۴۷) حضرت جریر بن عبد اللہ البجلیؓ فرماتے ہیں کہ جب سے میں مسلمان ہوا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے مجھے اپنے گھر یا اپنی مخصوص مجلس سے نہیں روکا۔ یعنی مجھ کو حاضری کے لئے اجازت کی ضرورت
پیش نہیں آئی۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے طلب کیا آپ نے عطا فرمایا اور مجھ کو منع نہیں
فرمایا۔ اور یہ حضرت جریر بن عبد اللہ بجلیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چالیس
دن پہلے مسلمان ہوئے تھے۔

وَلَا رَاٰنِیۡ الخ ای منذ اسلمت اذ الحذف من الثانی لدلالة الاول کثیر ویؤیدہ ما فی
روایة الترمذی عنه ما حجبنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ولا رأنی منذ اسلمت الخ
فهو متعلق بکل من الفعلین علی سبیل التنازع۔

اِلَّا تَبَسَّمَ۔ اس کا تعلق صرف فعل ثانی یعنی وَلَا رَاٰنِیۡ سے ہے۔ یعنی آپ نے جب بھی مجھکو دیکھا
تو آپ مسکرائے۔ ترمذی کی روایت میں اِلَّا ضَحِكَ ہے۔ اس سے مراد بھی تبسّم ہی ہے۔ کیونکہ
دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اکثر مُسکراتے تھے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بلند اخلاق کا کمال تھا کہ آپ اپنے صحابہ و خدام سے بھی انبساط اور خندہ پیشانی سے پیش آتے
تھے۔ ولعل منشاء انبساطه علیه السلام معه رضی اللہ عنه کونه من مظاهر
الجمال ولذا قال عمر رضی اللہ عنه ان جریرًا یوسف هذه الامة۔ واللہ اعلم۔

(۴۴۸) ضَاحِكًا مُسۡتَجۡمِعًا۔ ضاحکا یہ ضمیر مفعول بہ سے تمیز ہے۔ اگرچہ مشتق ہے جیسا کہ لِلّٰهِ دَرُّهٗ
فَارِسًا میں لفظ فَارِسًا تمیز ہے۔ اور مُسۡتَجۡمِعًا ضمیر ضَاحِكًا سے حال ہے اور معنی یہ ہیں کہ
ما رأیته یضحك تامًّا مقبلًا بکلیته علی الضحك (یعنی میں نے آپؐ کو اس طرح
کھِل کھِلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ پورے زور سے ہنسی پر پوری توجہ فرماتے ہوئے

ہنس رہے ہوں۔ اور بعض شراح نے ضَاحِکًا کو حال قرار دیا ہے ای ما رأیتہ مستجمعًا یضحکہ فی حال ضحکہ بجمیع فمہ۔ واللہ اعلم

حَتّٰی اَدٰی مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ۔ لَهَوَات لَهَاۃ کی جمع ہے۔ اس گوشت کو کہتے ہیں جو حلق میں لٹکا ہوتا ہے جس کو اُردو میں حلق کا کوا کہتے ہیں۔

اِنَّمَا کَانَ یَتَبَسَّمُ اس میں آپ کی عام عادتِ مبارکہ بیان فرمائی گئی ہے کہ آپ اکثر مسکراتے تھے۔ اگرچہ گاہے آپ ہنستے بھی تھے مگر قہقہہ تک نوبت نہ پہونچتی تھی۔ گو حیاتِ مبارکہ میں چند بار قہقہہ فرمانا بھی روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

اَلْمُزَاحُ

خوش طبعی

(۴۴۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا قَالَ اِنِّیْ

حضرت ابوہریرہؓ سے نقل ہے فرماتے ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہم سے خوش طبعی فرماتے ہیں؟

لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا۔ (ترمذی ص۲۰ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۶)

آپ نے فرمایا کہ میں سچ ہی کہتا ہوں۔

(۴۵۰) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ یَا

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا " او

ذَا الْاُذُنَیْنِ۔ (ترمذی ص۲۲ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۶)

دو کانوں والے۔

تشریح مُزاح بضمّ المیم وکسرھا۔ بعض کہتے ہیں کہ بالکسر باب مفاعلۃ کا مصدر ہے۔ اور بالضمّ اسم۔ یہ مجرد میں باب فتح سے مستعمل ہے۔ مزاح کے معنی ہیں انبساط مع الغیر من غیر ایذاء۔ اور اگر خوش طبعی میں ایذاء رسانی بھی شامل ہوجائے تو وہ استہزاء، سخریہ اور تمسخر کہلائے گا۔ جو نص قرآنی لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ الآیۃ سے ممنوع وحرام ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ وہ مزاح جس کی ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے (مثلاً (۴۴۵) میں لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ عنوان "المراء" میں گذرا) وہ ایسی دل لگی ہے جس میں افراط اور دوام ہو کہ مزاح کی عادت بن گئی ہے۔ کیونکہ اس سے ہنسی پیدا ہوتی ہے اور سنگدلی اس کا نتیجہ نکلتا ہے۔ اور

جب یہ چیزیں پیدا ہوجائیں تو انسان ذکر اللہ اور فکرِ دین و فکرِ آخرت جیسی مقصود چیزوں سے غافل ہوجاتا ہے۔ اور بسا اوقات ایذا اور کینہ پیدا ہوجانے کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ (جو دنیا و دین کے لیئے خطرے ہیں) خوش طبعی کی عادت کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اس سے آدمی کی ہیبت و وقار جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان امور مذکورہ سے احتیاط رہے تو مزاح مُباح ہے۔ (اسی کے قریب قریب (۱۴۶) میں امام غزالیؒ کا قول گذرا ہے) البتہ یہاں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عبداللہ بن الحارث کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ،

مَارَأَیْتُ اَحَدًا اَکْثَرَ مِزَاحًا مِّنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زائد مزاح کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

لیکن آقا میں اور غلاموں میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ آپ اپنے اوپر پورا پورا قابو رکھتے اور رضا و غضب اور مزاح وغیرہ کسی حال میں بھی حق کے سوا نہ فرماتے تھے۔ آقائے کائنات کی تو شان ہی بڑی عظیم اور نرالی ہے۔ آپؐ کے پروانوں پر بھی خود کو قیاس کرنا گستاخی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہنستے تھے؟ آپ نے جواب دیا ہاں ہنستے تھے۔ مگر ان کے دلوں میں ایمان پہاڑ سے زیادہ عظیم تھا۔

حضرت بلال بن سعدؓ کہتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ کو دیکھا کہ وہ اپنے کاموں میں محنت کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ لیکن جب رات ہوجاتی تو وہ لوگ ایسے زاہد و تارک الدنیا اور عبادت گذار بن جاتے تھے (کہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ دنیا سے ان کو کوئی تعلق ہی نہیں)۔

(مشکوٰۃ شریف باب الضحک ملتقطا)

ظاہر ہے کہ سمندروں اور دریاؤں کا پانی ڈھیلوں، پتھروں اور کوڑے کرکٹ سے گدلا نہیں ہوتا۔ اور گڈھوں کا پانی گندہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح معمولی لوگوں کو معمولی باتوں سے نقصان پہونچ جاتا ہے اور بڑوں کو بڑی باتوں سے بھی نہیں پہونچتا۔ اس لیئے خوش طبعی اور ہنسی دل لگی سے ہم جیسوں کو احتیاط ہی کرلینا بہتر ہے۔ ورنہ اس کے نقصانات ظاہر ہیں۔ ہاں گاہے کسی کو خوش کرنے یا کسی سے فکر و غم دُور کرنے کے لیئے یا کسی اور اچھے مقصد کے لیئے شرائط کا لحاظ رکھ کر مزاح میں مضائقہ نہیں۔

شرائط کا حاصل یہ ہے کہ (۱) جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات نہ کہے (۲) ایذا رسانی کا قصد نہ ہو۔ (۳) کسی مؤمن کی تحقیر کا ارادہ نہ ہو۔ (۴) عادت نہ بنالے (۵) صرف فضول بکواس اور بیہودگی پیش نظر نہ ہو۔ ان شرائط کے ساتھ مزاح جائز اور ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوجاتے تو وہ استہزاء اور تمسخر و سخریہ میں داخل ہے جو ممنوع ہے۔

(۴۹۴) بعض صحابۂ کرامؓ نے مزاح اور خوش طبعی آپ کی شانِ عالی کے خلاف سمجھ کر دریافت کیا تھا

کہ یارسول اللہ آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں۔ اس استبعاد وتعجب کو ظاہر فرمانے کے لیئے تاکیدی لفظ (انک) لائے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ صحابہؓ کے سوال کا منشاء یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح سے منع فرمایا تھا جیساکہ اوپر ابن عباسؓ کی روایت میں لاتمار اخاك ولا تمازحہ گذرا۔ اور اسپر کلام بھی آچکا) تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں۔ یعنی اگر مزاح نامناسب چیز ہے تو آپ کی شانِ عالی تو اس سے بہت بلند ہے۔ آپ نے فرمایا کہ (اپنے آپ کو مجھ پر قیاس نہ کرو۔ میں اپنے اوپر پورا قابو رکھتا ہوں۔ اور حدود سے ہٹ نہیں سکتا چنانچہ میری زبان پر بھی خلافِ واقعہ بات نہیں آسکتی) میں حق اور سچ ہی کہتا ہوں۔ کیونکہ میں معصوم ہوں۔ عدالت وصداقت سے کسی حال میں برطرف نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ آپ کی مزاح میں جو بلند مقاصد ہوتے تھے وہ اور کسی کے مزاح میں نہیں ہوسکتے۔ مثلاً نبئ اعظم کا رعب اور آپ کی ہیبت اس قدر تھی کہ آپ کے قریب جاتا ہوا آدمی گھبراتا تھا مگر آپ مزاح کے ذریعہ اپنے جاں نثاروں کے قلوب میں انس پیدا فرماتے اور ان کو اپنے قریب لگاتے تھے۔ تاکہ وہ فیوض وبرکات حاصل کرتے رہیں۔

(۴۵۰) یَاذَا الْاُذُنَیْنِ (اے دو کانوں والے) یہ واقعہ ہے کہ ہر آدمی کے دو کان ہوتے ہیں۔ حضرت انسؓ کے بھی دو کان تھے۔ بات تو واقعی ہے۔ لیکن یہ بات سُنکر اوّل وہلہ میں عجیب سی معلوم ہوتی ہے اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی عجیب صفت ہے۔ جو اور کسی میں نہیں ہے۔ بس اسی اعتبار سے یہ مزاح ہوا۔ بعض شراح کہتے ہیں کہ اس جملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کی مدح فرمائی ہے۔ کہ وہ بہت ذہین وفہیم ہیں۔ اور سچے خادم ہیں کہ اپنے دونوں کانوں کو اَمر کی طرف ہمہ وقت متوجہ رکھتے ہیں۔ اور ہر بات کو سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کو تنبیہ بھی مقصود ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے کان دیئے ہیں تو خبرداری وبیداری سے سُن کر بات کو سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انبساط وخوش طبعی کے ساتھ ساتھ مدح وتنبیہ بھی مقصود ہو۔ ان سب معانی میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قال علی القاری ویمکن ان یکون فی اذنیہ طول او قصر او قصور فاشار بذلك الیہ۔

واللہ اعلم۔

اَلشَّمَاتَةُ

کسی کی مصیبت پر خوش ہونا

(۴۵۱) عَنْ وَاثِلَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُظْهِرِ

حضرت واثلہؓ نے فرمایا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم اپنے بھائی کی مصیبت

الشَّمَاتَةَ لِاَخِيكَ فَيَرْحَمَهُ اللّٰهُ وَيَبْتَلِيكَ۔ (ترمذی ص۲ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۴)
پر خوشی ظاہر نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اسپر رحم فرمادیں گے اور تم کو مبتلا کردیں گے۔

تشریح (۴۵۱) عن واثلة بكسر المثلثة وهو ابن الاسقع الليثي اسلم والنبي صلى الله عليه وسلم متوجه الى تبوك ويقال انه خدم النبي صلى الله عليه وسلم ثلث سنين وكان من اهل الصفة ومات ببيت المقدس وهو ابن مائة سنة۔

لا تظهر الشماتة۔ شماتة (س) دشمن کی مصیبت پر خوش ہونا۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ تمہارا مسلمان بھائی اگر کسی دینی یا دنیوی یا بدنی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو تم اس کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرو (یہ اسلامی بھائی چارہ کے بھی خلاف ہے۔ اور اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ) اللہ تعالیٰ رحم فرما کر اس کو اس مصیبت سے نجات دیدیں اور تم کو اس مصیبت میں مبتلا کردیں۔ بلکہ اگر کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھیں تو چپکے سے یہ دعا پڑھیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي عَافَانِي مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهِ وَفَضَّلَنِي عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيلًا۔ (مشکوٰۃ ص۲۱۱)	تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھ کو اس مصیبت سے عافیت دی (بچایا) جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور مجھ کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس دعا کے پڑھنے کا اثر یہ ہوگا کہ وہ مصیبت خواہ کیسی بھی ہو اس دعا کے پڑھنے والے کو نہ پہونچے گی۔

اَلتَّعْيِيرُ
عار دلانا

(۴۵۲) عَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَيَّرَ
حضرت معاذؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی کو کسی
اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ۔ (ترمذی ص۲ج۲ مشکوٰۃ ص۴۱۴)
گناہ پر شرم دلائے تو وہ اسوقت تک نہ مریگا جب تک وہ گناہ نہ کرلے۔

تشریح عن معاذؓ وهو ابن جبل عند الاطلاق۔ مَنْ عَيَّرَ الخ جس نے کسی مسلمان بھائی کو شرم دلائی۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کی کسی ایسے گناہ پر جو اس سے سرزد ہوگیا تھا (پھر اس نے اس گناہ سے توبہ بھی کرلی تھی۔ اور یہ ملامت، شماتت یا تحقیر کے طور پر تھی)

تو اس ملامت کرنے والے کو دنیا ہی میں اس کی سزا یہ ملے گی کہ جبتک وہ اس گناہ میں مبتلا نہ ہو جائیگا موت نہ آئے گی۔ مشکوٰۃ شریف میں اس حدیث کے بعد یہ عبارت بھی ہے یعنی مِنْ ذَنْبٍ تَابَ مِنْهُ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ذنب سے وہ گناہ ہے جس سے وہ گناہگار توبہ کرچکا تھا) قال میرك هٰذا التفسیر منقول عن الامام احمد۔ تعییر کا بیان لاتنابزوا بالالقاب میں (۱۶م) میں اور وَلَا تَجَسَّسُوْا کے تحت (۴۲۳) میں بھی گذر چکا ہے۔

ذُوالْوَجْهَیْنِ

دو رُخا

(۴۵۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم قیامت کے

تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ذَا الْوَجْهَیْنِ الَّذِیْ یَاْتِیْ

دن لوگوں میں سب سے بُرا دو رُخے کو پاؤگے جو ان کے پاس ایک رُخ سے آتا ہے

هٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ وَّهٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ۔ (بخاری ۸۹۵ مشکوٰۃ ۴۱۱)

اور ان کے پاس دوسرے رُخ سے۔

تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم قیامت کے دن دو رُخے کو سب سے بدترین پاؤگے دو رُخے کی تفسیر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی کہ ان لوگوں کے پاس ایک رُخ لے کر پہنچتا ہے اور دوسرے لوگوں کے پاس دوسرا رُخ لے کر یعنی جن لوگوں کے پاس جاتا ہے اُن کے پاس جاکر دوسروں کی بُرائی کرتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد آپس میں فساد کرنا ہوتا ہے۔ جیسے چغلخوروں اور منافقوں کا بھی یہ ہی حال ہوتا ہے۔ جس کے پاس پہنچے اسی کی سی کہنے لگے۔ اور دوسروں کی بُرائی بیان کرکے خود اس کے نزدیک بھلے بن گئے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی مشابہت اختیار کی جائے گی انہیں کے ساتھ حشر ہوگا۔ من تشبہ بقوم فھو منھم۔ قَتَّات، نَمَّام، ذُوالْوَجْهَیْنِ یہ سب الفاظ چغلخور کے معنی میں آتے ہیں۔ گو ان میں تھوڑا تھوڑا فرق بھی ہے۔ قتات وہ چغلخور ہے جو بات کو بناکر پیش کرتا ہے۔ نمام عام ہے۔ وہی بات کہدے جو واقعی ہے۔ یا اس کو بناکر پیش کرے۔ بعض نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ نمام تو ان لوگوں میں شامل ہوتا ہے جن کی چغلی کرتا ہے۔ اور قتات الگ ہوتا ہے اور کان لگاکر

سن لیتا ہے۔ اور فساد کے لئے نقل کرتا ہے۔ ان میں فرق پہلے بھی مفصل گذر چکا ہے۔ (اللآلی ج ۳ ص ۱۷۵)
ذُوالْوَجْهَيْنِ قتات و نمام سے اعم ہے خواہ وہ بات بنا کر نقل کرتا ہو یا سُنکر، غرض وہ اوروں کو بُرا بنا کر اور ان کے درمیان آپس میں پھوٹ ڈال کر خود دونوں کے نزدیک بھلا اور دونوں کا ہمدرد و ہوا خواہ بننا چاہتا ہے۔ بہرحال چغلخوروں کی عادت منافقین کی عادت کے مشابہ ہے۔ اس لئے ان کا منافقین کے ساتھ حشر ہوگا۔ جو سب سے زیادہ بُرا ہوگا۔ قال اللہ تعالیٰ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ وقال علیہ السلام من کان ذا وجہین (ای المنافق) فی الدنیا کان لہ یوم القیٰمۃ لسان من نار۔ (مشکوٰۃ عن عمارؓ ص ۴۱۳)
بعض حضرات نے ذوالوجہین کا ترجمہ بھی منافق ہی کیا ہے۔

اَلْخِيَانَةُ

بے ایمانی

(۴۵۴) عَنْ اَبِيْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
وَسَلَّمَ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَكَرَ بِهٖ۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۴، مشکوٰۃ ص ۴۲۸)
کہ ملعون ہے وہ شخص جو کسی مومن کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ کرے۔

(۴۵۵) عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت ابوامامہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكِذْبَ۔ (مشکوٰۃ ص ۴۱۴)
مومن تمام خصلتوں پر پیدا کیا جا سکتا ہے مگر خیانت اور جھوٹ پر نہیں۔

تشریح (۴۵۴) مَلْعُوْنٌ ای مُبْعَدٌ عَنِ الْخَيْرِ (خیر سے محروم اور اللہ کی رحمت سے دور ہے) وہ شخص جو کسی مومن کو ناحق تکلیف یا نقصان پہنچائے۔ ضرر اور مشقت دو لفظ قریب المعنی ہیں۔ لیکن ضرر اتلافِ مال میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور مشقت بدنی ایذا رسانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ضرر کے معنی نقصان کے بہتر ہوں گے۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ضرر ایذائے بدنی، نقصان مالی اور دُنیوی و اُخروی نقصانات سب کو شامل ہے۔ اور مشقت کے اصل معنی مخالفت، محاربت اور منازعت کے ہیں۔

اَوْمَكَرَبِهٖ۔ مکر کے معنی ہیں دھوکہ دینا یعنی پوشیدہ اور نامعلوم طریقہ سے کسی کو نقصان پہنچانا۔ ظاہر بات ہے کہ مومنوں کو ناحق ستانا، نقصان پہنچانا اور ان کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرنا اصل ملعونوں (کافروں اور منافقوں) ہی کا شیوہ ہے۔ اور اگر کوئی اسلام وایمان کا دعویدار یہ حرکت کرتا ہے تو یہ اس کی حرکت کافرانہ ومنافقانہ ہونے کی وجہ سے قابلِ لعنت ضرور ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ توفیقِ خیر کا سلب ہوجانا اور حق تعالیٰ کی نگاہِ رحمت سے محروم ہوجانا ہے۔ یہ حدیث معہ تشریح مرآۃ جزء ثانی میں نمبر ۱۶۴ پر گذر چکی ہے۔

(۴۵۵) یُطْبَعُ بصیغۃ المجھول ای یُخلق ویُجبل الخِلاَل الخِصال وَزناً ومعنیً دونوں ایک ہیں۔ کُلّھا یعنی مومن تمام اخلاقِ ذمیمہ پر پیدا کیا جاسکتا ہے اور اس میں ساری بُری عادتیں جمع ہوسکتی ہیں اِلاَّ الْخِیَانَۃَ وَالْکَذِبَ بنصبھما ای غیرھما یعنی دو خصلتیں یکجائی طور پر یا دونوں میں سے ایک خصلت بھی اس میں نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ مومن کی تصدیق قلبی اور اسکے ایمان کا تقاضا صدق وامانت ہے۔ اور کذب وخیانت ان کی ضدّین ہیں۔ اس لئے مومن میں کذب و خیانت کا وجود حیرت انگیز اور اس کے مزاجِ ایمان کے خلاف ہے۔ ولذا قال تعالیٰ اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰذِبُوْنَ (جھوٹ بے ایمان ہی بولتے ہیں اور یہ انہی لوگوں کا شیوہ ہے) وقال علیہ السّلام لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ۔ لہٰذا مومن سے اگر کذب وخیانت کا صدور ہوتا ہے تو وہ اس کے تقاضائے ایمان کے خلاف عارضی چیز ہے۔ اس کی اصل خلقت وطبیعت نہیں۔ لہٰذا یہ عارضی سیاہی مومن کے رُخِ انور کے لیے داغ نازیبا ہے۔ اس کو فوراً دور کردینا چاہئے۔ اور اس ارشاد سے نہی عن الخیانۃ والکذب ہی مقصود ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خیانت وکذب سے آدمی کافر ہوجاتا ہے۔ علمائے حق کا اس پر اتفاق ہے۔

اور ممکن ہے کہ ان دونوں خصلتوں سے تہدید شدید اور مومن سے ان دونوں صفتوں سے نفی کرنے میں تاکید ومبالغہ مقصود ہو۔ کیونکہ یہ اصل عادتیں کافروں، منافقوں اور بے ایمانوں کی ہوتی ہیں۔

اَلْکَذِبُ

جھوٹ

(۴۵۶) عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِیْ اِلَى الْفُجُوْرِ
کہ تم جھوٹ سے بچتے رہو اس لیئے کہ جھوٹ نافرمانی کا راستہ دکھاتا ہے۔
وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِیْ اِلَى النَّارِ وَمَا زَالَ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى
اور نافرمانی دوزخ کا راستہ دکھاتی ہے۔ اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا اور جھوٹ
الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا۔ (ترمذی ص۲۲ مشکوٰۃ ص۴۱۲)
بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

(۴۵۷) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت سمرہ بن جندبؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
قَالَ رَاَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ اَتَيَانِیْ فَاَخَذَا بِيَدِیْ فَاَخْرَجَانِیْ اِلَى
کہ میں نے آج رات (خواب) میں دو شخصوں کو دیکھا کہ وہ میرے پاس آئے اور ان دونوں نے میرا
الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ فَاِذَا رَجُلٌ جَالِسٌ وَرَجُلٌ قَائِمٌ بِيَدِهٖ
ہاتھ پکڑا۔ پھر وہ مجھ کو نکال کر ایک مقدس سرزمین کی طرف لے گئے تو وہاں ایک شخص بیٹھا ہے
كَلُّوْبٌ مِّنْ حَدِيْدٍ يُدْخِلُهٗ فِیْ شِدْقِهٖ حَتّٰى يَبْلُغَ قَفَاهُ ثُمَّ
اور دوسرا آدمی اپنے ہاتھ میں لوہے کی ایک سنڈاسی لیئے کھڑا ہے۔ جس کو وہ اس آدمی کی باچھ میں
يَفْعَلُ بِشِدْقِهِ الْاٰخَرِ مِثْلَ ذٰلِكَ وَيَلْتَئِمُ شِدْقُهٗ هٰذَا
داخل کر کے (چیرتا ہوا) اس کی گدی تک پہنچا دیتا ہے پھر دوسری باچھ کیساتھ اسی طرح کرتا ہے۔ اور یہ
فَيَعُوْدُ فَيَصْنَعُ مِثْلَهٗ قُلْتُ مَا هٰذَا قَالَ كَذَّابٌ يُّحَدِّثُ
باچھ اس کی درست ہو جاتی ہے پھر لوٹ کر اسی طرح کرتا ہے۔ میں نے دریافت کیا یہ کیا ماجرا ہے۔ ان دونوں
بِالْكَذِبَةِ فَتُحْمَلُ عَنْهُ حَتّٰى تَبْلُغَ الْاٰفَاقَ فَيُصْنَعُ بِهٖ اِلَى
نے کہا کہ یہ جھوٹا ہے۔ جھوٹی بات کہتا تھا جو اس سے نقل کی جاتی تھی اور ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (بخاری ص۱۸۵ مشکوٰۃ ص۳۹۵)
لہٰذا اس کے ساتھ یہ عمل قیامت کے دن تک کیا جاتا رہے گا۔

(۴۵۸) عَنْ سُفْيَانَ بْنِ اَسَدٍ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ
حضرت سفیان بن اسد حضرمیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ كَبُرَتْ خِيَانَةً أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ
کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ بڑی خیانت (کی) ہے یہ بات کہ تم اپنے بھائی سے
حَدِيثًا هُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَأَنْتَ لَهُ كَاذِبٌ۔ (ابوداؤد ۲۳۳/۲ مشکوٰۃ ۴۱۳)
ایسی گفتگو کرو کہ وہ اس میں تمہاری تصدیق کر رہا ہو اور تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔

(۴۵۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ دَعَتْنِي أُمِّي يَوْمًا وَّرَسُولُ اللّٰهِ
حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے فرمایا کہ مجھے میری اماں نے ایک دن بُلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ فِي بَيْتِنَا فَقَالَتْ هَا تَعَالَ أُعْطِيكَ
ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے تو میری والدہ نے کہا او آجا میں تجھے دوں گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا أَرَدْتِّ أَنْ
وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم ان کو کیا دینا چاہتی ہو والدہ صاحبہ نے عرض کیا
تُعْطِيَهُ قَالَتْ أُعْطِيهِ تَمْرًا فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
کہ میں اس کو چھوارہ دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ سے فرمایا
وَسَلَّمَ أَمَا إِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِيهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ۔
یاد رکھو اگر تم نے اس کو کچھ نہ دیا ہوتا تو تمہارے ذمہ جھوٹ (کا گناہ) لکھ دیا جاتا۔
(ابوداؤد ۲۳۳/۲ مشکوٰۃ ۴۱۶)

(۴۶۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَفَى
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے
بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ (ابوداؤد ۲۳۳/۲ مشکوٰۃ ۴۱۸)
گناہ (گار ہونے) کے لئے یہ کافی ہے کہ جو سُنے وہ بیان کر دے۔

تشریح (۴۵۶) یہ روایت مع تفصیلات مرآۃ الانوار کے جزء ثانی میں "متھا الصدق فی الامور کلھا" کے تحت (نمبر ۲۶۹) پر گذر چکی ہے۔

(۴۵۷) حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح ادا فرما کر ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر تشریف فرما ہوتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ تم میں سے رات

کس آدمی نے خواب دیکھا ہے؟ حضرت سمرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو وہ بیان کر دیتا تھا۔ پھر آپ اس کی وہ تعبیر دیدیتے تھے جو اللہ چاہتا تھا۔ اسی معمول کے مطابق آپؐ نے ہم لوگوں سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ نہیں دیکھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا (یہاں تک صاحب مشکوٰۃ الآثار نے روایت کا شروع حصہ حذف کر دیا ہے) لیکن میں نے رات یہ خواب دیکھا ہے کہ دو شخص میرے پاس آئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک مقدس سرزمین کی جانب لے گئے۔ میں نے یہ دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہے اور ایک دوسرا شخص لوہے کی سنڈاسی لیئے ہوئے کھڑا ہے۔ (کلّوب مہمیز، آگ نکالنے کے لیئے مڑے ہوئے سر کی سلاخ، آنکس ج کلالیب) جس کو وہ اس کی باچھ میں داخل کر کے اس کو گدی تک پھاڑ ڈالتا ہے۔ پھر یہی معاملہ اس کی دوسری باچھ کے ساتھ کرتا ہے۔ جبتک وہ پہلی باچھ درست ہوجاتی ہے۔ پھر اس کو اسی طرح پھاڑتا ہے۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے (انہوں نے کہا کہ آگے چلیئے۔ اور چند اور دوسرے مناظر دکھا کر بعد میں سب معاملات کی تفصیل بیان کی تو اس شخص مذکور کے متعلق) انہوں نے کہا کہ یہ جھوٹا آدمی ہے۔ جس کی عادت تھی کہ وہ جھوٹ بولتا تھا۔ اور جھوٹی باتیں اس سے نقل ہوکر دنیا میں مشہور ہوجاتی تھیں۔ اس لیئے اس شخص کے ساتھ قیامت تک یہی معاملہ ہوتا رہیگا، یعنی اس کو یہی سزا ملتی رہے گی۔

یہ روایت طویل ہے۔ مشکوٰۃ شریف کتاب الرؤیا ص۳۹۵ وص۳۹۶ میں بحوالہ بخاری شریف مذکور ہے۔ اس روایت کا ایک حصہ مرآۃ الانوار جزء ثانی میں «اَلْمُوْبِقَاتُ» کے تحت نمبر(۳۰۶) پر گذر چکا ہے۔

(۴۵۸) عن سفیان بن اسد الحضرمی۔ اَسَد بفتحتین و فی نسخۃ صحیحۃ بل ھی الاصح اَسِید بفتح الھمزۃ وکسر السین وھو الاکثر والثانیۃ بضم الھمزۃ وفتح السین والثالثۃ بفتح الھمزۃ وفتح السین وحذف الیاء ھو الحضرمی الشامی روی عن جُبیر ابن نُفَیر حدیثہ فی الحمصیین (الاکمال لولی الدین ذکرہ فی الصحابۃؓ)

کَبُرَتْ بضم الباء ای عَظُمَتْ ضمیر المؤنثۃ ممیز خیانۃ تمیزۃ کقولہ تعالیٰ کَبُرَتْ کَلِمَۃً فی سورۃ الکھف۔ اَنْ تُحَدِّثَ الجملۃ بتأویل المفرد فاعل کَبُرَتْ اَنَّثَہٗ باعتبار التمیز فانہ فاعل معنًی وقیل بتأویل الخصلۃ او الفعلۃ وقال الطیبی انث الفعل لہ باعتبار المعنی لانہ یعنی التحدیث نفس الخیانۃ وفیہ معنی التعجب کمافی قولہ تعالیٰ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ ومعنی التعجب تعظیم الامر فی قلوب

السّامعین لانّ التعجّب لایکون الّا من شیٔ خارج عن نظائرہ واشکالہ ۔ فافہم۔
حدیث پاک کا مفہوم یہ ہوا کہ بڑا بھاری جرم ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی ایسی بات کہو کہ وہ تم کو اس میں سچّا سمجھ رہا ہو اور تم اس میں جھوٹ بول رہے ہو (ایک روایت میں انت بہٖ کی بجائے انت لہٗ ہے) ظاہر ہے کہ وہ تم کو ایماندار مسلمان سمجھ رہا ہے اور تم اس کے ساتھ منافقانہ حرکت کر رہے ہو۔ اور امانتداری کے برخلاف خیانت سے کام لے رہے ہو۔

(۴۵۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَامِرٍؓ۔ حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے فرمایا کہ میں بچہ تھا تو میری والدہ نے یہ کہہ کر مجھے بلایا "او آجا میں تجھے ایک چیز دوں گی " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف فرما تھے۔ آپ نے پوچھا تم کیا دوگی اس کو؟ میری اماں نے عرض کیا چھوارہ دوں گی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہاری کچھ دینے کی نیت نہ ہوتی تو تم پر جھوٹ لکھ دیا جاتا یعنی تم کو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو بلاتے اور بہلانے میں بھی جھوٹ نہ بولنا چاہیئے۔ اس سے بچوں کو جھوٹ کا سبق ملتا ہے۔ اور ان کی تربیت بگڑ جاتی ہے۔ پھر آدمی خود بھی جھوٹا بنجاتا ہے۔ اور اپنی عادت بھی خراب ہوتی ہے۔ اس روایت میں ھَا تنبیہ کے لیئے ہے۔ یا اسم فعل بمعنی خُذْ ہے۔ اُعْطِیْكَ ای انا اعطیك یعنی یہ مبتدا محذوف اَنَا کی خبر ہے۔ اسی لیئے مرفوع ہے۔ بعض نسخوں میں بحذف الیاء اُعْطِكَ ہے جو جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے جیسے فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ میں یَرِثُنِیْ کے اندر دونوں احتمال ہیں۔
اُعْطِیْہِ تَمْرًا ای اردت ان اعطیہ تمرًا واحدًا او شیئًا من التمرۃ فانہٗ اسم جنس۔
اَمَا اَنَّكِ میں اَمَا بالتخفیف تنبیہ کے لیئے ہے۔ کَذْبَۃٌ بفتح الکاف وسکون الذال مرۃٌ من الکذب او بکسر الکاف ای نوعٌ من الکذب۔ اور ذال کا کسرہ فتح کاف کے ساتھ صحیح نہیں جبکہ اسپر تاء آئے۔ اور بغیر تاء کے اَکَذِبٌ صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن عامرؓ حضرت عبداللہ بن عامرؓ قریشی ہیں حضرت عثمان بن عفانؓ کے ماموں ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پاس ان کو لایا گیا اور آپ نے ان کی تحنیک کی۔ اور اپنا لعاب دہن ان کے منہ میں لگا کر ان پر دم کیا۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ ان کی عمر آپ کی وفات کے وقت تیرہ ۱۳ برس کی تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث روایت کی اور نہ آپ سے براہِ راست کوئی ارشاد انہوں نے محفوظ کیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ جو حدیث یہاں مذکور ہے خود انہوں نے اس کو محفوظ کیا اور روایت کیا ہے۔

حضرت عثمانؓ نے ان کو بصرہ اور خراسان کا والی بنایا تھا۔ یہ شہادت عثمانؓ تک اپنی ولایت پر قائم رہے۔ سخی وکریم اور کثیر المناقب انسان تھے۔ انہوں نے خراسان کو فتح کیا۔ کسریٰ انہی کی ولایت کے زمانہ میں قتل کیا گیا۔ فارس کے اطراف اور خراسان کا اکثر حصہ اور اصفہان و کرمان اور حلوان وغیرہ انہی کے دورِ ولایت میں فتح ہوئے۔ نہر بصرہ بھی انہوں نے ہی بنوائی تھی۔ سنہ ۵۹ھ میں وفات پائی۔

(۴۶۰) کَفٰی بِالْمَرْءِ۔ المرء کفٰی کا مفعول بہ ہے۔ اور باء زائدہ ہے۔ کَذِبًا بفتح الکاف وکسر الذال ویجوز کسر الکاف وسکون الذال یہ تمیز ہے اَنْ یُّحَدِّثَ کفٰی کا فاعل ہے۔
مطلب حدیث کا یہ ہے کہ آدمی اگر قصداً جھوٹ نہ بولے اور جو سُن لے اس کو بغیر تحقیق بیان کر دے تو اس کے جھوٹا ہونے کے لیئے یہ بھی کافی ہے۔ کیونکہ جب تک بات کے جھوٹ یا سچ ہونے کا خود آدمی کو یقین نہیں اس وقت تک اس کو بیان ہی نہ کرنا چاہیئے۔ اس میں بے تحقیق باتوں کے بیان کرنے سے زجر و ممانعت ہے۔ خصوصاً احادیث کے بارے میں تو بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ قال تعالیٰ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (بنی اسرائیل)

(اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل نہ کیا کر کان اور آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں انسان سے (قیامت کے دن) پوچھا جائے گا)

بہر حال کوئی بات بلا تحقیق بیان نہ کرنی چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ بعض دفعہ شیطان انسانی صورت میں آکر لوگوں سے کوئی جھوٹی بات کہہ جاتا ہے، پھر لوگ وہاں سے اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ اور ان میں کوئی آدمی اس بات کو نقل کرتا ہے کہ میں نے یہ بات ایک شخص سے سنی ہے جس کی صورت تو میں پہچانتا ہوں (بظاہر بڑا مقدس تھا) اور اس کا نام نہیں جانتا۔ اس نے یہ بات کہی تھی (اس طرح یہ جھوٹ پھیل جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص۲۸)

---

(۴۶۱) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصّف آیت ۲، ۳)
اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی ناراضگی کی ہے کہ تم ایسی بات کہو جو خود نہ کرو۔

(۴۶۲) اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ
کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم

تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرۃ آیت ۴۴)

کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

(۴۶۳) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يُؤْتٰى بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُلْقٰى فِى

ہوئے سنا کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور دوزخ میں ڈال دیا جائیگا

النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُ بَطْنِهٖ فَيَدُوْرُ بِهَا كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ

فوراً اس کے پیٹ کی آنتیں نکل پڑیں گی۔ اور وہ ان پر اس طرح چکر لگائے گا جیساکہ گدھا

بِالرَّحٰى فَيَجْتَمِعُ اَهْلُ النَّارِ اِلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ يَا فُلَانُ مَالَكَ

پن چکی میں گھومتا ہے۔ تو دوزخی اس کے پاس اکٹھے ہوکر کہیں گے کہ اے فلاں تجھ کو کیا ہوا

اَلَمْ تَكُنْ تَاْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ فَيَقُوْلُ بَلٰى قَدْ

کیا تو نیکی کا حکم نہیں کرتا تھا اور برائی سے نہیں روکتا تھا وہ کہے گا بیشک بات یہی تھی (مگر) میں بھلائی

كُنْتُ اٰمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِيْهِ وَاَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ وَاٰتِيْهِ۔

کا حکم دوسروں کو کرتا تھا اور خود اس پر عمل نہ کرتا تھا۔ اور دوسروں کو (ترمذی ج۲ ص۶۳ مشکوٰۃ ص۴۳۶)

برائی سے روکتا تھا اور میں خود برائی میں مبتلا رہتا تھا۔

لغات مَقْتٌ (ن) بہت بغض رکھنا (ك) ناپسند کرنا، بہت بغض رکھنا، سخت ترین غصہ، سخت ناپسند۔ تَنْدَلِقُ نکل جانا، نکل پڑنا۔ دَلَقَ دَلْقًا (ن) سونتنا، کھولنا، نکالنا۔ اِفْعال سے بھی یہی معانی ہیں۔ اَقْتَابٌ جمع قِتْبٌ و قَتَبٌ کی۔ آنتیں، پالان۔ مذکر ہے۔ گاہے مؤنث بھی مستعمل ہے۔ قِتْبَةٌ بھی اَقْتَاب کا واحد آتا ہے۔ قَتَبَ قَتْبًا (ن) بھنی ہوئی آنت کھلانا۔ الرَّحٰى چکی (مؤنث) تثنیہ رَحَوَانِ و رَحَيَانِ (ن) چکی چلانا، گنڈل مارنا۔ مرّ فی (۱۳۶)۔

تشریح (۴۶۱) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ الآیۃ سورۃ صف کی دوسری اور تیسری آیات ہیں۔ ان کے شانِ نزول کے سلسلہ میں امام ترمذی و امام حاکم نے عبداللہ ابن سلام سے روایت نقل کی ہے۔ اور حاکم نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے آپس میں یہ مذاکرہ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے تو ہم وہ عمل کریں۔ بغویؒ نے اس میں یہ بھی نقل

کیا ہے کہ ان حضرات میں سے بعض نے کچھ ایسے الفاظ بھی کہے کہ اگر ہمیں احب الاعمال عند اللہ معلوم ہو جائے تو ہم اپنی جان و مال سب اس کے لئے قربان کر دیں۔ ابن کثیرؒ نے بحوالہ مسند احمد روایت کیا ہے کہ ان چند حضرات نے جمع ہو کر آپس میں یہ مذاکرہ کیا۔ اور یہ بھی چاہا کہ کوئی صاحب جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا سوال کریں۔ مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ ابھی یہ لوگ اسی حالت پر تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سب کو نام بنام اپنے پاس بلایا (جس سے معلوم ہوا کہ آپ کو بذریعہ وحی اُن کے اجتماع اور گفتگو کا علم ہو گیا تھا) جب یہ سب لوگ حاضرِ خدمت ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۃ صف پڑھ کر سنائی جو اسی وقت آپ پر نازل ہوئی تھی۔ اس سورت نے یہ بتایا کہ احب الاعمال جس کی تلاش میں تم لوگ ہو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اور کیونکہ ان حضرات نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہمیں احبّ الاعمال کا علم ہو جائے تو ہم اس عمل کو کرنے میں جان و مال قربان کر دیں۔ جس میں یہ دعویٰ ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں ان حضرات کو تنبیہ کی گئی کہ مؤمن کے لئے ایسے دعوے درست نہیں ہیں۔ اس کو کیا معلوم ہے کہ وقت پر وہ اپنے ارادہ کو پورا کر سکے یا نہ کر سکے۔ کیونکہ اس کے اسباب کا مہیا ہونا، موانع کا زائل ہونا اس کے اپنے اختیار میں نہیں۔ پھر خود اس کے اعضاء جوارح اور دست و بازو بلکہ قلبی عزم و ارادہ وغیرہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی پورے طور پر اس کے اختیار اور قبضہ میں نہیں ہے۔ اسی لئے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن کریم میں یہ تلقین کی گئی کہ جو کام آپ کو آئندہ کرنا ہو اگر اس کے ارادہ کو بیان کرنا ہے تو ان شاء اللہ ضرور فرما دیا کریں (وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ) حضرات صحابہؓ کا قصد گو دعویٰ کا نہ ہو مگر صورت دعوے کی ضرور تھی، اور دعویٰ اللہ کو پسند نہیں۔ اس پر تنبیہ کے لئے ان آیات کا نزول ہوا۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے۔ تو ہم وہی کرتے اور اس کے لئے اپنے جان و مال کو قربان کر دیتے اس پر یہ آیت اُتری اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ الآیۃ اور غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی آزمائش کی گئی تو مسلمان پشت پھیر کر بھاگ گئے تب لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ نازل ہوئی۔ ابن جریرؒ نے ابو صالح کی روایت میں بیان کیا کہ مسلمانوں کے قولِ مذکور پر یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ الآیۃ نازل ہوئی تو بعض مسلمانوں پر جہاد شاق گذرا اس پر یہ آیت مذکورہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ الخ اتری۔ مقاتلؒ کہتے ہیں کہ آیت لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اس کے بارے میں نازل ہوئی جو جہاد میں نہ تلوار استعمال کرتا تھا

نہ برچھا، نہ دشمن کو قتل کرتا تھا۔ مقاتلؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ جنگ اُحد میں جو پشت پھیر کر بھاگ گئے تھے یہ آیت اُن کے بارے میں اتری ہے۔ واللہ اعلم

ان آیات کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جو کام تمہیں کرنا نہیں اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو جس سے ایسے کام کے دعوے کی ممانعت تو واضح ہو ہی گئی جس کو کرنے کا ارادہ ہی دل میں نہو۔ کیونکہ وہ تو محض جھوٹا دعویٰ ہے جو نام و نمود کے لیئے ہو سکتا ہے۔ لیکن جن صحابہؓ نے یہ مذاکرہ کیا تھا وہ ایسے ہرگز نہ تھے کہ ان کے دل میں کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور محض دعویٰ کریں۔ اس لیئے اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ گو کام کرنے کا دل میں عزم و ارادہ ہو پھر بھی اپنے نفس پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا کہ ہم فلاں کام کریں گے یہ شانِ عبدیت کے خلاف ہے۔ اول تو ایسے کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب موقع ملے کر گذرنا چاہیئے۔ اور کسی مصلحت سے اگر کہنا بھی پڑے تو انشاء اللہ کی قید لگا کر کہا جائے۔ یعنی اگر اللہ کو منظور ہوگا تو یہ کام کروں گا۔ تو پھر یہ دعویٰ نہ رہے گا۔

مسئلہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام کا دعویٰ کرنا جس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور اس کو کرنا ہی نہ ہو تو یہ گناہِ کبیرہ اور اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضی کا سبب ہے۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ کا مصداق یہی ہے۔ اور جہاں یہ صورت نہو بلکہ ارادہ اس کام کو کرنے کا ہو وہاں بھی اپنی قوت و قدرت پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا ممنوع و مکروہ ہے۔

دعویٰ اور دعوت میں فرق

مذکورہ تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ ان آیات کا تعلق دعوی سے ہے۔ کہ آدمی جو کام کرنا نہیں چاہتا اس کا دعویٰ کرتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ رہا معاملہ دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا کہ جو کام آدمی خود نہیں کرتا اس کی نصیحت دوسروں کو کرتا اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتا ہے تو وہ اس تفسیر کی بناپر اس آیت کے مفہوم میں شامل نہیں۔ اس کے احکام دوسری آیات و احادیث میں مذکور ہیں۔ مثلاً اگلی دو نصوص میں اسی کا بیان آرہا ہے۔ یاد رکھیئے عنوان قول بلا عمل کے عام مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے جو آیاتِ مذکورہ سے ثابت ہو رہی ہے۔ فافهم (از معارف القرآن ج ۸ ص ۴۴۳ و ۴۴۴)

تفسیر حقانی میں ہے کہ: علماء کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہارِ محبت کرتے تھے کہ ہم آپ پر جان فدا کر دیں گے۔ مگر اُحد کی لڑائی میں سُست پڑ گئے اور ہیر پھیر کرنے لگے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ منافقوں کی طرف اشارہ ہے۔ جو زبان سے دعویٰ ایمان و جاں نثاری کرتے تھے مگر وقت پر ثبوت سے عاجز تھے۔

قومی ترانہ بات یہی ہے کہ کسی کی خصوصیت نہیں۔ ہر ڈینگ مارنیوالا اس میں داخل ہے۔ (مختصراً)

(۶۲۴) اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ ونصیحت کرنے والوں کو اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ جب تم اور لوگوں کو نیک عمل کی دعوت دیتے ہو تو تم خود بھی اس پر عمل کرو۔ ایسا نہ کرو کہ دوسروں کو نیکی کی طرف بلاؤ اور خود کو بھلاؤ۔

اس آیت میں اگرچہ خطاب علمائے یہود کو ہے۔ اور ان کو ملامت کی جارہی ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو اور دین اسلام پر قائم رہو۔ (جو اس بات کی علامت ہے کہ علمائے یہود پیغمبر اسلام اور مذہب اسلام کو برحق جانتے تھے) مگر وہ خود نفسانی خواہشات سے ایسے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن معنوی اعتبار سے اس آیت میں ہر اس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیتا ہو مگر خود عمل نہ کرتا ہو، دوسروں کو خدا سے ڈراتا اور گناہوں سے روکتا ہو، اور خود نہ ڈرتا اور نہ گناہوں سے باز رہتا ہو۔ احادیث میں اس کی بڑی ہولناک وعیدیں مذکور ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں میرا گذر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے، میں نے جبریلؑ سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے (وہ بے عمل دنیا دار) واعظ ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے تھے اور خود عمل نہ کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ فلاح)

کیا فاسق وعظ ونصیحت نہیں کرسکتا؟

لیکن اس سے یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ بے عمل اور فاسق کا دوسروں کو وعظ ونصیحت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ خود نیک عمل کرنا الگ نیکی ہے۔ اور اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے۔ جیسے ایک شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لیئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی نہ رکھے۔ (بلکہ اگر ایک نیکی چھوٹ جائے تو دوسری ضرور کرلینی چاہیئے) بالکل اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے۔ اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا مستقل گناہ ہے۔ اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرا گناہ بھی کرے (بلکہ ایک گناہ سے اگر نہ بچ سکا تو دوسرے سے ضرور بچ جائے)

چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر شخص یہ سوچکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں جب گناہوں سے پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔

کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو۔ حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ جب مجھے اپنی کسی بُری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور پر بیان کرتا ہوں، تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل رہنا جائز نہیں۔ اور دونوں میں فرق ظاہر ہے۔

سوال:۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا نہ واعظ کے لئے جائز ہے نہ غیر واعظ کے لیئے، پھر واعظ کی تخصیص کیوں ہے۔؟

جواب:۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بے عمل ہونا ناجائز تو دونوں کے لئے ہے۔ مگر واعظ کا جُرم غیر واعظ کے مقابلہ میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابلِ ملامت ہے۔ کیونکہ واعظ جُرم کو جُرم سمجھتے ہوئے اور اس کا اعلان کرتے ہوئے اس کو جان بوجھ کر کرتا ہے۔ اس کے پاس یہ عذر نہیں کہ مجھے اس جُرم کا علم نہ تھا۔ برخلاف غیر واعظ اور اَن پڑھ جاہل کے کہ اس کو گو علم حاصل نہ کرنے کا گناہ ضرور ہوگا۔ لیکن ارتکابِ جُرم میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذرِ نادانی موجود ہے۔ علاوہ ازیں عالم واعظ جُرم کر کے دین کے ساتھ ایک قسم کا استہزاء کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا جاہلوں کو معاف فرمائیں گے اتنا علماء کو معاف نہ فرمائیں گے۔ (معارف ۲۱۸/۱ و ۲۱۹)

بے عمل کو چونکہ وعظ کہنا جائز ہے۔ اسی لیئے آیتِ مذکورہ میں ترکِ عمل پر ملامت تو ہے، مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم خود عمل نہیں کرتے تو دوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو۔ معلوم ہوا کہ جس نیک کام کے خود کرنے کی ہمت و توفیق نہیں ہے اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے اور نصیحت کرنے کا سلسلہ نہ چھوڑے۔ امید ہے کہ اس وعظ و نصیحت کی برکت سے کسی وقت خود کو عمل کی توفیق ہو جائے گی۔ جیسا کہ اس کا بکثرت مشاہدہ و تجربہ ہے۔ البتہ وہ عمل اگر واجب یا سنتِ مؤکدہ کے درجہ میں ہو تو آیاتِ مذکورہ میں غور و فکر کر کے نادم و شرمندہ ہوتے کا سلسلہ جاری رکھنا واجب ہے۔ اور اگر مستحبات کے متعلق ہو تو یہ سلسلۂ ندامت بھی مستحب ہے۔ واللہ اعلم

جاہل کو وعظ کہنا جائز نہیں

البتہ جاہل کو واعظ بننا جائز نہیں جس کو کسی حکم کا پورا علم نہیں، اور وہ اس کی حدود سے پورے طور پر واقف نہیں۔ اسی طرح جس کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حقیقت اور معروف و منکر اور ان کے درجات کا علم بھی حاصل نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ غلط دعوت و تبلیغ سے

لوگوں کے عقائد و اعمال خراب کر دے گا۔ اور بسا اوقات منکر کو معروف یا اس کے برعکس سمجھ کر فتنہ و گمراہی بپا کر دے گا۔ اس لئے جاہل خواہ کتنا ہی نیک نظر آتا ہو اس کو وعظ کہنا جائز نہیں اسی طرح محقق عالم کے سوا کسی کا وعظ سننا جائز نہیں۔ آج کل عام دستور ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس وعظ گوئی کر رہا ہے۔ اور عوام جاہلوں کے مواعظ میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور علماء کے مواعظ سے کنارہ کشی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بلکہ رواجی تبلیغی جماعت میں جہلاء ایک دو چلّے دیکر علماء سے خود کو بلند و بالا سمجھ لیتے ہیں۔ بلکہ ان کی بدگوئیاں اور برائیاں عموماً بیان کر کر کے دوسروں کو بھی ان سے دور کرتے ہیں۔ بلکہ بعض تو تین دن کی چلّی دے کر خود کو اُن علماء سے بہتر جاننے لگتے ہیں جنہوں نے پوری زندگی علوم نبویہ کے پڑھنے پڑھانے اور دین کی اشاعت میں صرف کر دی ہے۔ میرا تجربہ تو مشاہدہ ہے کہ آجکل جس میں تین چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ پکا تبلیغی شمار ہوتا ہے۔ (۱) علماء سے عداوت (۲) قرآن مقدس سے نفرت (۳) مدارس دینیہ سے مخالفت۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

دور حاضر میں یہ حشر ہوا ہے اس جماعت کا جس نے غافلوں کو بیدار کیا تھا اور جس کا فیض اسکے بانیوں کے اخلاص کی بدولت بفضلہٖ تعالیٰ پورے عالم میں پھیل گیا تھا۔

(۶۲۴) مشکوٰۃ شریف میں یہ روایت بحوالہ صحیحین حضرت اسامہ بن زیدؓ سے نقل کی گئی ہے اسکے الفاظ اس طرح ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُجَاءُ بِالرَّجُلِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَیُلْقٰی فِی النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُہٗ فِی النَّارِ فَیَطْحَنُ فِیْہَا کَطَحْنِ الْحِمَارِ بِرَحَاہُ فَیَجْتَمِعُ اَہْلُ النَّارِ عَلَیْہِ فَیَقُوْلُوْنَ اَیْ فُلَانُ مَا شَاْنُکَ اَلَیْسَ کُنْتَ تَاْمُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَانَا عَنِ الْمُنْکَرِ قَالَ کُنْتُ اٰمُرُکُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِیْہِ وَاَنْہَاکُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاٰتِیْہِ۔

(مشکوٰۃ ص۴۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص کو لایا جائیگا قیامت کے دن اور اس کو دوزخ میں ڈالدیا جائیگا تو اس کی آنتیں دوزخ میں نکل پڑیں گی۔ پھر وہ ان آنتوں میں اس طرح چکر لگائیگا جس طرح گدھا اپنی چکی میں گھومتا ہے۔ پھر دوزخی اس کے پاس اکٹھے ہو جائیں گے اور اس سے پوچھیں گے اے فلاں یہ تیرا کیا حال ہے۔ کیا تو ہم کو نیکی کا حکم نہ دیتا تھا اور ہم کو برائی سے منع نہ کرتا تھا وہ کہیگا کہ میں تم کو نیکی کا حکم کرتا تھا مگر خود عمل نہ کرتا تھا۔ اور برائی سے روکتا تھا مگر خود اس سے باز نہ آتا تھا۔

مطلب ظاہر ہے کہ بے عمل واعظ کے لئے وعید شدید ہے۔ کہ اس کو جب دوزخ میں ڈالا جائیگا تو اس کا پیٹ پھٹ کر اس میں سے آنتیں فوراً باہر ہو جائیں گی۔ کیونکہ عموماً بے عمل واعظ

وہی دنیا دار لوگ ہوتے ہیں جن کا مقصود وعظ کہہ کر اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ اس لیئے اس کو سزا بھی ملے گی کہ دوزخ میں اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ آنتیں باہر ہوجائیں گی۔ اور ان آنتوں پر وہ اس طرح (ان کو روندتا ہوا) چکر لگائے گا جس طرح پہلے زمانے میں گدھا چکی کے چاروں طرف چکی چلانے کے لیئے گھومتا تھا۔ یہ واعظ بھی روٹی حاصل کرنے کے چکر میں رہتا اور سرگرداں پھرتا تھا۔ یہی سزا اس کو ملے گی۔ اور حمار کا ذکر کرنا اس کی حماقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے دنیا میں یہ حماقت کی تھی کہ اوروں کو نفع پہنچایا اور خود اس سے محروم رہا۔ اور دنیا جیسی حقیر چیز دین جیسی عظیم چیز کے بدلہ میں خرید لی۔ دوسرے قرآن پاک میں بے عمل لوگوں کو لدے ہوئے گدھے سے تشبیہ دی ہے۔ ارشاد ہے کہ:

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا۔

(سورۃ الجمعۃ)

(جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ان کی حالت اس گدھے کی سی حالت ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوتے ہے۔

علم چندانکہ بیشتر خوانی
گر عمل در تو نیست نادانی
نہ محقق بود نہ دانشمند
چہار پائے برو کتابے چند

كَثْرَةُ الْكَلَامِ وَالتَّشَدُّقِ

زیادہ گفتگو اور زبان درازی

(۴۶۴) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَاِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ

اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو۔ کیونکہ ذکر اللہ کے سوا زیادہ بولنا

اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِّلْقَلْبِ وَاِنَّ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِيْ

دل کی سختی (کا سبب) ہے۔ اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور سخت دل ہوتا ہے۔ (ترمذی ج۲ ص۶۲، مشکوٰۃ ص۱۹۸)

وَقَدْ مَرَّ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
اور مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت گذر چکی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهٰى مِنْ قِيْلٍ وَّقَالٍ وَكَثْرَةِ السُّؤَالِ۔
زیادہ بولنے سے اور زیادہ سوال کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

(تحت "قتل الاولاد و وأد البنات (۴۰۲)، مشکوٰۃ ص۴۱۹)

(۴۶۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْبَلِيْغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِيْ يَتَخَلَّلُ بِلِسَانِهٖ
بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے اس صاحب بلاغت کو ناپسند فرماتے ہیں جو لپیٹتا ہے اپنی زبان کو
كَمَا يَتَخَلَّلُ الْبَاقِرَةُ بِلِسَانِهَا۔ (ابوداؤد ص۳۲۵ ج۲ و مشکوٰۃ ص۴۱۱)
جیسے بیل لپیٹتا ہے اپنی زبان کو۔

(۴۶۶) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَقَدْ اُمِرْتُ اَنْ اَتَجَوَّزَ فِي الْكَلَامِ فَاِنَّ
سنا کہ مجھ کو گفتگو میں اختصار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ اختصار ہی
الْجَوَازَ هُوَ خَيْرٌ۔ (ابوداؤد ص۳۲۵ ج۲ ومشکوٰۃ ص۴۱۱)
زیادہ اچھا ہے۔

تشریح (۴۶۴) لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ اس سے بطور اشارہ یہ معلوم ہوا کہ ہر کلام ناجائز نہیں۔ بلکہ بعض کلام مباح ہیں، بلکہ ضروری بھی ہیں اور مفید بھی۔

قَسْوَةٌ لِّلْقَلْبِ یعنی دل کی سختی کا سبب ہے۔ اور دل کے سخت ہوجانے کی علامت یا اس کا ثمرہ ونتیجہ یہ ہے کہ دل حق بات سننے سے اور اللہ کے ذکر سے دور و نفور ہو جاتا ہے۔ اور مخلوق سے میل جول کی رغبت اس میں پیدا ہوجاتی ہے خشوع وخشیت اور اللہ کے سامنے رونے دھونے سے محروم ہو جاتا ہے۔ آخرت سے غفلت اور بے توجہی پیدا ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے دوری ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا وانّ ابعد النّاس من اللہ ای من نظر رحمتہ وعنایتہ القلب القاسی ای صاحب القلب القاسی یا تقدیر عبارت یہ مان لی جائے

ابعد قلوب النّاس القلب القاسی یعنی القلب القاسی کا مضاف محذوف مان لیا جائے یا النّاس سے پہلے مضاف مان لیا جائے ۔تاکہ معنی درست ہو جائیں ۔یہ بھی ممکن ہے کہ ابعد النّاس من لہ القلب القاسی تقدیر عبارت ہو۔ مگر اس میں حذف زائد ماننا پڑتا ہے۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ قلب بول کر شخص مراد لیا گیا ہو۔کیونکہ ہر شخص کی حیات اور صلاح وفساد اسی سے وابستہ ہے۔جیسے عرب میں بولا جاتا ہے المرء باصغریہ ای بقلبہ ولسانہ۔ اس صورت میں محذوف ماننے سے نجات ہو جائے گی۔ قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وقال تعالیٰ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ۔
وَقَدْ مَرَّ عَنِ الْمُغِيْرَةِ الخ یہ پوری حدیث "قتل الاولاد ووأد البنات" کے تحت نمبر (۴۰۲) پر "مرآۃ الانوار" جزء ثانی میں مع تفصیلات دیکھئے۔
(۴۶۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رض بلیغ سے مراد وہ شخص ہے جو فصاحت و بلاغت میں مبالغہ اور تکلف و تصنع کرتا ہے۔اور رجال کو خصوصاً بطور اظہارِ واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے۔کیونکہ اکثر انہی میں یہ عادت ہوتی ہے۔ یَتَخَلَّلُ ای یاکل بلسانہ او یُدیر لسانہ حول اسنانہ مبالغۃً فی اظہار فصاحتہ وبلاغتہ ۔یعنی جس طرح بیل کی عادت ہوتی ہے کہ وہ زبان سے لپیٹ لپیٹ کر کھاتا رہتا ہے۔اور اپنی زبان گھما گھما کر منہ چاٹتا رہتا ہے اسی طرح اس کا حال ہے۔جو فصاحت وبلاغت میں تکلف کرتا ہے کہ بغیر گفت گو اور بناوٹ کے اور بغیر زبان درازی کے اس کو چین نہیں پڑتا۔اور بیل سے حماقت میں تشبیہ ہے۔گویا تصنع کرنے والا بلیغ بھی بیل ہے۔جس کو بغیر منہ چلائے اور زبان ہلائے رہا نہیں جاتا۔اور وہ احمق اس حماقت کو اپنے لیئے اچھا سمجھتا ہے۔ یتخلل بمعنی یاکل پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت دلیل ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لاتقوم السّاعۃ حتّٰی یخرج قوم یاکلون بالسنتھم کما تاکل البقرۃ بالسنتھا رواہ احمد (مشکوٰۃ ص۱۱۴) اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ اپنی زبانوں کو اپنے کھانے پینے اور پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنائیں گے۔وہ لوگوں کی مدح وذم غلط طریقہ پر کر کے اُن سے دنیا حاصل کریں گے۔اسی طرح پر تکلّف وعظ وتقریر کر کے لوگوں سے نذرانے وصول کر کے کھائیں گے۔ دورِ حاضر میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔گویا یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ونبوت کی ایک دلیل ہے۔
الباقرۃ سے مراد بقرۃ ہے کانہٗ اراد واحداً من الجنس کالبقرۃ من البقر۔ اور نہایہ میں

اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ یلفه کما تلف البقرة بلسانها لفا (یعنی وہ اظہار فصاحت کے لئے اپنی زبان کو اس طرح لپیٹتا اور گھماتا ہے جیسا کہ بیل لپیٹتا اور گھماتا ہے) معلوم ہوا کہ پسندیدہ گفتگو وہ ہے جو بقدر ضرورت ہو۔ جس میں انسان کا ظاہر و باطن ایک اور تکلف وتصنع سے پاک ہو۔ نیز وہ گفت گو شریعت مطہرہ کے موافق ہو۔ (مرقاۃ ص۱۶۱ ج۴)

(۶۶م) روایت کا شروع حصہ اس طرح ہے۔

عن عمرو بن العاص انه قال یوما وقام رجل فاکثر القول فقال عمرو لو قصد لکان خیرا له سمعت الخ (یعنی ایک دن ایک شخص وعظ کہنے کھڑا ہوا اور اس نے اپنی فصاحت و بلاغت ظاہر کرنے کے لئے خوب طویل کلام کیا تو حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا کہ اگر یہ شخص اپنے وعظ میں اختصار سے کام لیتا تو اس کے لئے بہتر تھا۔ (وقال التوربشتی قوله قصد ای لو اخذ فی کلامه الطریق المستقیم والقصد ما بین الافراط والتفریط یعنی میانہ روی اختیار کرتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ سنت یہی ہے کہ کلام میں اختصار اور میانہ روی ملحوظ رکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ اتباع سنت ہی میں خیر ہے۔ ولانه اسراع وانتقال من التکلم الی السکوت والسکوت خیریته مسلمة حضرت عمرو بن العاص نے بطور دلیل فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے (یعنی اللہ نے حکم دیا ہے) کہ میں کلام میں اختصار کروں۔ (الجواز بفتح الجیم هو الاختصار علی قدر الکفایة) حاصل یہ ہے کہ گفت گو میں اختصار اور میانہ روی سنت اور بہتر ہے۔ نہ تو کلام اتنا مختصر ہو جو سمجھ ہی میں نہ آئے اور نہ اتنا طویل کہ مخاطب اکتا جائے اور مقصد سے زائد ہو۔ خیر الکلام ما قل ودل ولم یطل فیمل۔

اَلتَّمَادُحُ

ایک دوسرے کی تعریف کرنا

(۶۷م) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس تم اپنے نفس کی پاکی بیان نہ کرو۔ تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔ (النجم آیت ۳۲)

(۶۸م) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا کہ وہ دوسرے

رَجُلًا یُّثْنِیْ عَلٰی رَجُلٍ وَیُطْرِیْهِ فِی الْمِدْحَةِ فَقَالَ اَهْلَكْتُمْ

شخص کی تعریف کر رہا ہے اور اس کی تعریف میں مبالغہ کر رہا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کو ہلاک

أَوْ قَالَ قَطَعْتُمْ ظَهْرَ الرَّجُلِ۔ (بخاری ص۸۹۵ مشکوٰۃ ص۴۱۳ عن ابی بکرۃ)

کر دیا یا فرمایا کہ تم نے اس آدمی کی کمر توڑ دی۔

(۴۶۹) عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

حضرت مقداد بن اسودؓ نے فرمایا ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَيْتُمُ الْمَدَّاحِيْنَ فَاحْثُوْا فِيْ وُجُوْهِهِمُ

جب تم تعریف (میں مبالغہ) کرنے والوں کو دیکھو تو تم ان کے مونہوں میں مٹی

التُّرَابَ۔ (مسلم ص۴۱۴/۲۲ مشکوٰۃ ص۴۱۳)

جھونک دو۔

تشریح (۴۶۷) یعنی تم اپنے تقدس کا دعویٰ نہ کرو۔ کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کون کیسا ہے۔ اور کس درجہ کا ہے۔ فضیلت و بزرگی کا اصل مدار تقویٰ اور پرہیزگاری پر ہے۔ ظاہری اعمال پر نہیں۔ پھر تقویٰ بھی وہی معتبر ہے جو اللہ کو پسند ہو اور جو موت تک قائم رہے۔ اور اس کو اللہ کے سوا کون جان سکتا ہے کہ انسان کا خاتمہ کیسا ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آدمی کو تقویٰ کا علم بھی مشکل ہے۔ نہ وہ اپنے تقویٰ کو جانتا ہے نہ دوسرے کے تقویٰ کو۔ اسی طرح یہ جو تقویٰ حاصل ہے تو اللہ کے یہاں مقبول ہے یا نہیں۔ موت تک باقی رہیگا یا نہیں اس کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ اس لئے انسان اپنے یا کسی دوسرے کے تقدس و تقویٰ کا جزماً کس طرح دعویٰ کر سکتا ہے؟

حضرت زینت بنت ابی سلمہؓ کا نام ان کے والدین نے برہ رکھا تھا جس کے معنی "نیکوکار" کے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت پاک تلاوت فرما کر اس نام سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں اپنے نیک ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور ان کا نام بدل کر آپ نے زینب رکھدیا۔

(رواہ مسلم فی صحیحہ ابن کثیر)

(۴۶۸) حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے دوسرے کی تعریف اس کے سامنے کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا اور اس کے نقصان سے آگاہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ تم نے اس کو ہلاک کر دیا۔ یا یہ فرمایا کہ تم نے اس کی کمر توڑ دی بیجا تعریف کرنے والا خود جھوٹ کا مرتکب ہو کر گنہگار ہوتا ہے۔ اور جس کی تعریف کرتا ہے اس کو عجب و خود پسندی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آدمی میں خود پسندی پیدا ہو جائے تو یہ اس کی دینی اعتبار سے ہلاکت ہے ہی۔ اور بعض دفعہ دنیوی اعتبار سے بھی اسکی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کو عداوت و نفرت پیدا ہوگی۔ جو اس کے قتل کا

سبب بن سکتی ہے۔ مشکوٰۃ میں صحیحین کی روایت حضرت ابوبکرہؓ سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص نے دوسرے کی تعریف کی تو آپ نے ویلك قطعت عنق اخیك (تیرا ناس ہو تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی) تین بار فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ تم کو اگر کسی کی تعریف کرنی ضروری ہے تو کہو اَحْسِبُ فُلَانًا وَاللّٰهُ حَسِیْبُهٗ (میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں اور اللہ اس کا محاسب ہے یعنی حقیقتِ حال کا اللہ ہی کو علم ہے) اور یہ بھی اس وقت ہے جب کہ واقعی اس کو ایسا ہی سمجھتا ہے جیسا کہہ رہا ہے، ورنہ جھوٹ کا گناہ ہوگا۔ اور آپؐ نے فرمایا وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللّٰهِ اَحَدًا (اور اللہ کے مقابلہ میں کسی کو مقدس قرار نہ دے۔ کیونکہ اللہ کا حکم اور قضا و قدر کیا ہے اس کا اسی کو علم ہے۔ نہ حال کی حقیقت کا کسی کو علم ہے نہ انجام و مآل کا۔

(۴۶۹) حضرت مقداد بن الاسودؓ راوی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم مدح میں مبالغہ کرنے والوں کو دیکھو (کہ تمہارے پاس نظم یا نثر میں تمہاری تعریف کرنے آرہے ہیں اور تم سے کچھ وصول کرنے کی طمع رکھتے ہیں) تو تم ان کے چہروں میں مٹی جھونک دو۔ اُحْثُوْا باب نصر سے صیغہ جمع حاضر امر ہے۔ بعض روایات میں فِیْ وُجُوْهِهِمْ کی بجائے فِیْ اَفْوَاهِهِمْ ہے مطلب میں کوئی فرق نہیں۔ مداحین کے چہروں میں مٹی ڈالدینے کا مطلب کیا ہے۔ اس میں متعدد اقوال ہیں۔

(۱) ظاہر حدیث پر عمل کرنا چاہئے۔ اور مٹی لے کر ان کے چہروں پر ڈال دینی چاہئے۔

(۲) مٹی سے مراد مال ہے کہ وہ بھی انسان کی جان اور آبرو کے مقابلہ میں مٹی سے زائد وقعت نہیں رکھتا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ان کو مال دے کر اپنی آبرو بچالو۔ ورنہ وہ تمہاری مذمت کریں گے۔ تو اس ترکیب سے ہجو سے ان کی زبانوں کو بند کردو۔

(۳) "تراب" سے مراد عطائے قلیل ہے۔ قلت کی بنا پر تراب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی تھوڑی سی عطا دو۔ اور ان کی زیادہ حوصلہ افزائی کرکے اپنی مدح پر ان کو جری نہ بناؤ۔ جب تھوڑا نفع ہوگا تو آئندہ تعریف نہ کریں گے۔

(۴) "تراب" سے مراد حرمان ہے۔ یعنی ان کو کچھ نہ دو۔ اور ان کے مقصود میں اُن کو ناکام کردو۔ تاکہ آئندہ ایسی جرأت نہ کریں۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد زجر و منع ہے۔ یعنی تعریف کرنے والے کو تعریف سے روکنا ہے۔ کیونکہ وہ ممدوح کو کبر و غرور اور عجب و خود پسندی میں مبتلا کرکے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اور مداحین سے وہی لوگ مراد ہیں جن کی عادت اور جن کا پیشہ ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کی تعریفیں کرکرکے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ لیکن جو شخص کسی شخص کی کسی اچھے کام پر تعریف

کردے تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور دوسرے لوگوں کو اس کی اقتدار کی ترغیب ہو۔ تو ایسی تعریف میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اَلظُّلْمُ

(۴۷۰) وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍؕ
اور جو اپنے اوپر ظلم ہو چکنے کے بعد، برابر کا بدلہ لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔
اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ
الزام تو صرف ان لوگوں پر ہے، جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور دنیا میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں
بِغَيْرِ الْحَقِّؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَ
ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب طے ہے۔ اور جو صبر کرلے اور
غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ (سورۃ الشوریٰ آیت ۴۱ و ۴۲ و ۴۳)
معاف کردے تو بیشک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

(۴۷۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
حضرت ابن عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا کہ
اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۴۳۴)
ظلم بہت سی اندھیریاں ہوں گی قیامت کے دن۔

(۴۷۲) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
قَالَ اتَّقُوا الظُّلْمَ فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاتَّقُوا
کہ تم ظلم سے بچتے رہو کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی اندھیریاں ہوں گی اور تم کنجوسی
الشُّحَّ فَاِنَّ الشُّحَّ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰٓى اَنْ
سے بچتے رہو کیونکہ کنجوسی نے ان لوگوں کو ہلاک کردیا جو تم سے پہلے گذرے ہیں اس نے ان کو اپنے
سَفَكُوْا دِمَآءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ۔ (مسلم صفحہ ۳۲۰ / ۲۲، مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۴)
(ایک دوسرے کے) خون بہانے اور اپنے اوپر حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرلینے پر آمادہ کردیا تھا۔

(۴۷۳) عَنْ اَبِيْ مُوْسٰىؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَیُمْلِیْ الظَّالِمَ فَاِذَا اَخَذَہٗ لَمْ یُفْلِتْہُ ثُمَّ قَرَءَ

بیشک اللہ عزّ وجلّ ظالم کو مہلت دیتے رہتے ہیں پھر جب اس کو پکڑ لیتے ہیں تو اس کو چھوڑتے نہیں۔

وَکَذٰلِکَ اَخْذُ رَبِّکَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰی وَھِیَ ظَالِمَۃٌ اِنَّ

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی "اور اسی طرح آپ کے رب کی پکڑ ہوتی ہے جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتے

اَخْذَہٗ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ○ (مسلم ج۲ ص۳۲۰ مشکوٰۃ ص۴۳۶)

ہیں درانحالیکہ وہ بستیاں ظالم ہوتی ہیں۔ بیشک ان کی پکڑ بڑی دردناک (اور) سخت ہوتی ہے۔

(۴۷۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

بَعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ اتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّہٗ

معاذؓ کو یمن بھیجا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ مظلوم کی دعا

لَیْسَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ۔ (بخاری ج۱ ص۳۳۱ مشکوٰۃ ص۱۵۵)

اور اللہ (کی قبولیت) کے درمیان حجاب نہیں ہوتا۔

تشریح (۴۷۰) یہ تینوں آیات مع تفصیلات "ومن ابواب البر حفاظۃ النفس والاھل والمال والدفاع عنھم" کے تحت نمبر ۱۷۲ پر "مرآۃ الانوار" جزء ثانی میں گذر چکی ہیں۔ وہاں ملاحظہ فرمائی جائیں۔

(۴۷۱) امام راغبؒ کہتے ہیں کہ ظلم وضع الشیٔ فی غیر موضعہ کو کہتے ہیں خواہ وہ نقصان کے ساتھ یا زیادتی کے ساتھ۔ وقت سے شیٔ کو ہٹا دیا جائے یا جگہ سے۔ قطب ربانی شیخ عبدالکبیر یمانیؒ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے بندہ کا قلب اپنے ذکر وفکر کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ جو شخص غیر اللہ کے ذکر وفکر کو قلب میں رکھتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ (مرقاۃ ج۴ ص۷۵۸)

اَلظُّلْمُ سے مراد جنس ظلم ہے خواہ وہ متعدی ہو یا غیر متعدی۔ یعنی اس کا اثر دوسروں تک پہنچے یا ظالم کی ذات تک محدود رہے۔ ظُلُمَاتٌ یعنی قیامت کے دن گھنی اندھیریوں کا سبب ہوگا۔ جس طرح عدل کی انواع، انوار کے اسباب ہیں۔ اسی طرح ظلم کی انواع تاریکیوں کے اسباب ہیں لان الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں قاضی کا قول نقل کیا ہے۔

کہ یہ حدیث شریف اپنے ظاہری معنی پر ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ظلم اپنے صاحب (ظالم) پر تاریکیاں بن کر چھا جائے گا۔ اور قیامت کے دن اس کو نجات کی کوئی راہ نظر نہ آئے گی۔ قال تعالیٰ وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ اس کے برخلاف مؤمن کو ایمان وعدل کی بدولت ایسا نور حاصل ہوگا جو اس کے سامنے اور داہنے دوڑتا ہوا ہوگا۔ اور اس کو نجات کی راہیں نظر آجائیں گی۔ قال تعالیٰ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ اور احتمال یہ بھی ہے کہ ظلمات سے مراد قیامت کے شدائد ومصائب ہوں یعنی ظلم قیامت کی مصیبتوں اور سختیوں کا سبب ہوگا۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کے قول قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ میں ظلمات سے مراد مشکلات ومصائب ہی ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ظلمات سے عقوبات اور سزائیں مراد ہوں۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا امام نوویؒ کے قول علیٰ ظاہرہٖ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ظلمات سے اس کے حقیقی معنی مراد ہیں۔ حالانکہ مجازی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ یہ اطلاق السبب علی المسبب کے قبیل سے ہے۔ یعنی ظلم سبب ہوگا اور ظلمات مسبب ہوں گی۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کا ظلم آخرت کی تاریکیوں کا سبب ہوگا۔ اور قاضیؒ نے جو احتمالات بیان کیے ہیں کہ مصائب وشدائد مراد ہوں یا عقوبات اور سزائیں۔ تو ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مصائب ومشکلات تو دخولِ نار سے پہلے کی چیزیں ہیں۔ اور عقوبات وانکال دخولِ نار کے بعد کی ہیں

(۲۷۴) ظلم، شح (شدتِ بخل) اور تمام رذائل اور اخلاقِ دنیہ کو شامل ہے۔ مگر اس کے بعد اس کی ایک خاص نوع (شح) کو خصوصیت سے اس لیے بیان فرمایا کہ یہ تمام رذائل میں زائد خطرناک اور بہت سے رذائل کی بنیاد ہے۔ قال علی القاری افرد الشح بالذکر لانہٗ اعظم انواع الظلم فانہٗ منشاء المفاسد العظیمۃ ونتیجتہٗ محبۃ الدنیا الذمیمۃ قال تعالیٰ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

شح شدید ترین بخل کو کہتے ہیں۔ بخیل تو اپنے مال میں بخل کرتا ہے۔ اور شحیح غیر کے مال میں بھی بخل کرتا ہے اور اس کو مصرفِ خیر میں صرف کرنے سے منع کرتا ہے۔ دوسرے بخل کا تعلق مال سے ہے۔ اور شح مال وغیر مال یعنی ہر معروف وطاعت میں ہوتی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ شح، بخل اور حرص دونوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔

فَاِنَّ الشُّحَّ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مرض پرانا ہے۔ اور اس کے نتائج ہلاکت خیز ہیں۔ چنانچہ اس بیماری نے پہلی امتوں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ دنیا کی ہلاکت تو خونریزی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور محرمات کو حلال کرنے اور ایک دوسرے کا خون بہانے کی وجہ سے اُخروی عذاب میں مبتلا ہونا اُخروی ہلاکت ہے۔ اور دونوں ہلاکتوں کا سبب

شدت بخل اور بدترین حرص ثابت ہوئی جس کو شح سے تعبیر فرمایا گیا۔ اور شح ان ہلاکتوں کا سبب اس لئے بنی کہ مال کے خرچ کرنے سے خلقِ خدا کی ہمدردی، بھائیوں سے محبت اور ایک دوسرے سے میل ملاپ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے دین و دنیا کے اجتماعی امور کی تنظیم ہوتی ہے۔ جو ان کی بقاء و ترقی اور قوت و شوکت کا سبب ہے۔ اور بخل و شح سے آپسی تعلقات ختم ہو کر عداوت و دشمنی اور جنگ و جدال بپا ہوتے ہیں۔ اجتماعیت اور قوت و شوکت پر زوال آتا ہے۔ جس سے جان و مال اور آبرو وغیرہ غیر محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اور ان مفاسد کی وجہ سے دُنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں۔

(۳/۴۷) یُمْلِی اِمْلاء (باب اِفْعال) سے ہے جس کے معنی ڈھیل اور مہلت دینے کے ہیں۔ یعنی ظالم کی حق تعالیٰ فوراً پکڑ نہیں فرماتے۔ بلکہ اس کو طولِ عمر اور کثرتِ مال و اسباب عطاء فرماتے ہیں۔ کہ سعید تو اس فرصت میں نعمتوں پر نظر کر کے تائب ہو جائے اور شقی ظلم میں حدِ کمال کو پہنچکر سخت سزا کا مستحق ہو جائے۔

حَتّٰی اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ یُفْلِتْهُ۔ یُفْلِتُ اِفْلَات (افعال) سے ہے جس کے معنی تنگی سے بھاگ کر نکلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ پھر اس کی ایسی پکڑ فرماتے ہیں جس سے وہ نکل نہیں سکتا۔ یا لَمْ یُفْلِتْهُ کے معنی لم یخلصه ہیں یعنی پھر حق تعالیٰ اس کو چھوڑتے نہیں ہیں۔ وهذا المعنی هو الظاهر والاول حاصل المعنیٰ۔ اس حدیث میں مظلوم کو تسلی اور ظالم کو وعید کی گئی ہے۔ کما قال تعالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۝ (آپ اللہ کو ظالموں کے اعمال سے بے خبر نہ سمجھیں وہ تو ان کو ایسے دن کے لئے ڈھیل دے رہے ہیں جسمیں آنکھیں پتھرا جائیں گی) اس ارشاد کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور استدلال و استشہاد یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ الآیۃ (اور آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی سخت ہے جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتے ہیں جب وہ ظلم (اور کفر) کیا کرتے ہوں۔ بلاشبہ اللہ کی پکڑ بڑی اذیت ناک اور سخت ہوتی ہے)

(۴/۴۷) یہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا آخری ٹکڑا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کی جانب (قاضی و امیر بنا کر) بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ یعنی ان میں سے اکثر اہل کتاب) ہیں۔ تو تم ان کو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دینے کی دعوت دینا (کیونکہ مشرکین بھی وہاں تھے اگرچہ اہل کتاب تغلیبًا فرمایا گیا ہے) اور محمد رسول اللہ کی گواہی کی (دعوت دینا اس لئے کہ موحدین ہونے کے باوجود کچھ لوگ آپ کی نبوت و رسالت کے منکر ہو سکتے ہیں۔

(اس سے معلوم ہوا کہ کفار کو اگر دعوتِ اسلام نہ پہنچی ہو تو ان کو دعوتِ اسلام پہنچانا واجب اور ضروری ہے) پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کر لیں یعنی توحید و رسالت کا اقرار کر کے مسلمان ہو جائیں تو ان کو یہ بتا نا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر شب و روز میں نماز پنجگانہ فرض فرمائی ہے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ کفار فروعات کے مخاطب نہیں ہیں۔ جیسا کہ امام اعظمؒ کا مسلک ہے) پھر اگر وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتا نا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرمائی ہے۔ جو ان سے لیکر ان کے محتاجوں ہی پر تقسیم کی جائے گی۔ (وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم کو ان کے مالوں کا لالچ ہے) پھر اگر یہ بات بھی مان لیں تو (ان سے اوسط درجہ کے اموالِ زکوٰۃ میں وصول کرنا) عمدہ اور نفیس مال مت لینا (کیونکہ یہ ظلم ہو گا اور وہ مظلوم قرار پائیں گے۔ اسی لئے آگے فرمایا)

وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ الخ مظلوم کی بددعا سے ڈرنا۔ کیونکہ مظلوم کی دعا اور اللہ کے درمیان حجاب نہیں ہوتا۔ یعنی مظلوم کی دعا کی قبولیت یقینی ہے۔ درمیان میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن = اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

اس حدیث کا شروع حصہ وَاتَّقِ الذَّكْوة کے تحت نمبر (۹۵) پر مرآۃ الانوار کے جزء اول میں مفصل گذر چکا ہے۔

اَلْکِبْرُ

تکبر

(۴۷۵) عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ الْخُزَاعِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

حضرت حارثہ بن وہب خزاعیؓ سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعِّفٍ

آپ نے فرمایا کیا میں تم کو اہلِ جنت نہ بتا دوں (جنتی) ہر ایسا کمزور و ناتواں ہے کہ اگر وہ

لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ

اللہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری فرما دیں۔ کیا میں تم کو اہلِ دوزخ نہ بتا دوں۔ دوزخی ہر تند خو،

جَوَّاظٍ مُتَكَبِّرٍ۔ (بخاری ص۸۹۷ مشکوٰۃ ص۴۳۳)

اُجڈ (اور) مغرور ہے۔

(۴۷۶) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَتِ الْاَمَةُ مِنْ اِمَاءِ اَهْلِ

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ مدینہ والوں کی باندیوں میں سے

الْمَدِيْنَةِ تَأْخُذُ بِيَدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَنْطَلِقُ
کوئی باندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر
بِهٖ حَيْثُ شَاءَتْ ۔ (بخاری ۸۹۷ مشکوۃ ۵۱۹)
جہاں چاہتی لے جاتی تھی۔

(۴۷۷) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ
حضرت ابو سعیدؓ وحضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِزُّ اِزَارِيْ وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ فَمَنْ
کہ عزت میری لنگی ہے اور بڑائی میری چادر ہے۔ سو جو شخص
يُنَازِعُنِيْ عَذَّبْتُهٗ ۔ (مسلم ۳۲۹ مشکوۃ ۴۳۳ عن ابی ہریرۃؓ)
مجھ سے چھینا جھپٹی کریگا میں اس کو سزا دوں گا۔

(۴۷۸) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے ارشاد
قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ
فرمایا کہ جنت میں نہ جائے گا وہ شخص جس کے قلب میں ایک ذرہ برابر تکبر ہوگا۔
كِبْرٍ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ
اور دوزخ میں نہ جائے گا وہ شخص جس کے قلب میں ایک ذرہ برابر ایمان ہوگا۔
اِيْمَانٍ قَالَ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّهٗ يُعْجِبُنِيْ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبِيْ حَسَنًا
ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اچھا ہو
وَنَعْلِيْ حَسَنًا قَالَ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْجَمَالَ وَلٰكِنَّ الْكِبْرَ
اور میرا جوتا اچھا ہو فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتے ہیں لیکن تکبر تو
مَنْ بَطِرَ الْحَقَّ وَغَمَصَ النَّاسَ ۔ (ترمذی ۲۲ مشکوۃ ۴۳۳)
اس شخص کا ہے جو حق کے مقابلہ میں اکڑ جائے اور لوگوں کو حقیر جانے۔

(۴۷۹) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ يَقُوْلُوْنَ فِيَّ التِّيْهُ وَقَدْ
حضرت جبیر بن مطعمؓ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مجھ میں تکبر ہے حالانکہ میں

رَكِبْتُ الْحِمَارَ وَلَبِسْتُ الشَّمْلَةَ وَقَدْ حَلَبْتُ الشَّاةَ وَقَدْ

گدھے پر سوار ہوا ہوں اور میں نے چادر اوڑھی ہے۔ اور میں نے بکری دوہی ہے اور

قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ فَعَلَ هٰذَا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جو شخص یہ کام کرے گا تو

فَلَيْسَ فِيْهِ مِنَ الْكِبْرِ شَيْءٌ۔ (ترمذی ص۲ ج۲)

اس میں تکبر کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

لغات ضَعِيْفٌ کمزور ج ضِعَافٌ وضُعَفَاءُ وضَعَفَةٌ وضَعْفَى (ک) مُتَضَعَّفٌ بفتح العين وكسرها من باب التأكيد كجنود مجندة والقناطير المقنطرة وظل ظليل۔ عُتُلٌّ بہت کھانے والا، سرکش، سخت عادت، سخت (ن ض) سختی سے کھینچنا (س) برائی کی طرف جلدی کرنا جَوَّاظٌ تکبر سے چلنے والا، اُجد، بہت کھانے والا (ن) تکبر سے چلنا۔ العِزّ عزت، غلبہ، قوی ہونا، کمیاب ہونا، دشوار ہونا۔ وغیرہ بابۂ ضرب۔ اَلْكِبْرِيَاءُ بزرگی، عظمت، غرور۔ ج۔ بَطَرٌ (س) اترانا، ناپسند کرنا، حقیر سمجھنا، ناشکری کرنا (ن ض) چیرنا، شگاف دینا۔ غَمَصٌ (ض س) حقارت کرنا، جھوٹ بولنا۔ ناشکری کرنا۔ غَمَطٌ ایضاً (ض) حقارت کرنا۔ حقیر جاننا، ناشکری کرنا، ناقدری کرنا۔ اَلتِّيْهُ گمراہی، تکبر، غرور، ڈینگ۔ چٹیل میدان جس میں انسان بھٹک جائے ج اَتْيَاهٌ وَاَتَاوِيْهُ وَاَتَاوِهُ۔ تَاهَ تَيْهًا (ض) تکبر کرنا، گمراہ ہونا۔ سرگشتہ پھرنا، تفعیل سے متعدی۔ الشَّمْلَةُ چادر، گدڑی و بالکسر ہیئۃ الاشتمال حَلَبْتُ (ن ض) دوہنا (س) کالا ہونا۔

تشریح امام راغبؒ فرماتے ہیں کبر انسان کی ایک مخصوص حالت وصفت ہے۔ جو خود پسندی سے پیدا ہوتی ہے جس سے وہ خود کو اوروں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اور کبر کا بڑا درجہ یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کرے اور حق تعالیٰ کی عبادت کرنے سے رک جائے۔ پھر استکبار یعنی بڑا بننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان بڑا بننے کے لئے اچھے کام اختیار کرتا ہے تو یہ قسم محمود ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جو چیز اس کو حاصل نہیں اس کا اظہار کرتا ہے مثلاً عالم نہیں۔ مگر عالم ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ بزرگ نہیں بزرگی کا اظہار کرتا ہے۔ تو یہ صورت مذموم ہے۔ وعليه قوله تعالىٰ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورۃ البقرہ)

اسی طرح متکبر کی بھی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ شخص جس کی نیکیاں اور خوبیاں دوسروں سے واقعی طور پر زائد ہیں، اور وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ان لوگوں سے بہتر جانتا ہے جن میں وہ خوبیاں نہیں ہیں۔ تو یہ قسم محمود ہے۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ نے اپنی صفت متکبر بیان فرمائی ہے قال تعالیٰ اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ (لیکن انسان کا اپنے حق میں یہ فیصلہ کرنا کہ میں اوروں سے بہتر ہوں بڑا مشکل ہے۔ کیا معلوم اللہ کے نزدیک کس کی خوبیاں زائد اور کس کی نیکیاں اس کے نزدیک قبول ہیں، اور کس کا انجام بہتر ہے۔ اسلیئے انسان کو اپنی بڑائی کا اظہار و ادعا نازیبا ہے) دوسرا وہ شخص ہے کہ واقعہ کے خلاف اپنی خوبیوں کو دوسروں سے زائد سمجھتا یا اس کا اظہار کرتا ہے۔ اور یہ قسم مذموم ہے۔ قال تعالیٰ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کبر کا تعلق ظاہر سے بھی ہوتا ہے اور باطن سے بھی۔ جب جوارح پر اس صفت کا اظہار ہو تو اس پر لفظ "تکبّر" بولا جاتا ہے۔ اور اظہار نہ ہو صرف باطن سے تعلق ہو تو لفظ "کبر" کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ کبر و تکبر میں فرق ہے۔ اسی طرح متکبر کے لیئے متکبر علیہ ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس کے مقابلہ میں صفات کمال میں خود کو متکبر (بڑا) سمجھے۔ اور متکبر بہ یعنی صفت کمال بھی ضروری ہے۔ اور عجب (خود پسندی) میں معجب بہ (یعنی اس صفت خاص کا جس کو پسند کرے) ہونا تو ضروری ہے۔ مگر معجب علیہ کا ہونا ضروری نہیں۔ جس کے مقابلہ میں معجب اعجاب میں مبتلا ہو۔ اگر معجب اکیلا بلا مقابل ہے تو بھی وہ معجب اور خود پسند ہو سکتا ہے۔ بخلاف متکبر کے کہ وہ بلا مقابل (متکبر علیہ) متکبر نہیں ہوگا۔ اس سے متکبر اور معجب میں فرق معلوم ہو گیا۔ کہ متکبر خاص ہے اور معجب عام ہے۔ اور کبر و عجب میں بھی فرق ظاہر ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

(۴۷۵) کُلُّ ضَعِیْفٍ۔ بالرفع مبتدا محذوف ہو کی خبر اور بالجر اہل الجنۃ سے بدل۔ ضعیف سے مراد یہ ہے کہ وہ متکبر و جبار نہیں ہے۔ متضعَّف بفتح العین وکسرہا یہ تاکید کے قبیل سے ہے جیسے "جنود مجندۃ" "القناطیر المقنطرۃ" "ظلٌّ ظلیلٌ" وغیرہ۔ اور تفعل کی ایک خاصیت طلب فعل بھی ہے۔ تو گویا مطلب یہ ہوا کہ جو ضعف (تذلل و تواضع) اس کا مطلوب ہے اگرچہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں قوی و مرد آہن ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے صحابہؓ کی تعریف فرمائی ہے۔ (حالانکہ وہ سب متواضع تھے) ارشاد فرمایا اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ، اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ بہر حال اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ جو جتنا متواضع ہوگا اتنا ہی اس کو مراتب مقربین میں سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوگا۔ اور جس میں جتنا تکبر ہوگا اتنا ہی وہ اسفل السافلین کا زیادہ مستحق ہے۔

حضرت امام نوویؒ نے فرمایا کہ متضعف کو محدثین نے عین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ لیکن مشہور عین کا فتحہ ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ (اس کی تواضع اور انکساری کی بنا پر) اس کو ناتواں وحقیر سمجھتے اور اس کے ضعفِ حال کی وجہ سے اس پر جرأت بے جا کرتے ہیں۔ اور تَضَعَّفَ وَاسْتَضْعَفَ دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور کسرہ کی صورت میں اس کے معنی متواضع و متذلل اور خامل (گمنام) کے ہوں گے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اہل جنت میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہوگی۔ جیسا کہ اہل دوزخ کی اکثریت متکبرین کی ہوگی۔ واللہ اعلم

لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ یعنی وہ اگر اللہ پر کسی فعل یا ترکِ فعل کی قسم کھا بیٹھے لَاَبَرَّہٗ تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کر دکھائیں اور اس کو اپنی قسم میں بار (بری) بنا دیں گے، حانث نہ ہونے دیں گے یعنی اس کی قسم نہ ٹوٹنے دیں گے۔

وقال الطیبی ای لو حلف یمینا طمعا فی کرم اللہ بابرارہ لابرّہٗ (اللہ کے بھروسہ پر کوئی قسم کھا بیٹھے اور یہ توقع رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی قسم کی لاج رکھیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی توقع کو کامیاب فرما دیں گے اور اس کی قسم پوری فرما دیں گے) عُتُلّ بضمتین وتشدید اللام ای جاف شدید الخصومۃ بالباطل (سنگدل، باطل پر جھگڑا کرنے والا) جَوَّاظٌ بتشدید الواو ای جموع منوع (جمع کرنے والا، اعلیٰ درجہ کا کنجوس) اور مختال الفاخر (اکڑنے والا) وقیل السمین من التنعم (موٹا عیاش) وقیل الفاجر بالجیم (بدکار) وقیل بالخاء (فخر کرنے والا) مستکبر ای متکبر علی الحق او علی اھلہ۔

مسلم شریف کی روایت میں کل جواظ زنیم متکبر ہے۔ زنیم اس کو کہتے ہیں جس کو اپنی قوم اور اپنے نسب میں ملا لیا گیا ہو حالانکہ وہ قوم ونسب سے الگ تھا۔ حرامی، لئیم جس کی کمینگی وبدی مشہور ومعروف ہو۔ یہی معنی یہاں مناسب ہیں۔ واللہ اعلم

(۷۶۲) تَاْخُذُ بِیَدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت تواضع اور خلق خدا کے ساتھ انتہائی شفقت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ضعفاء ومساکین کے ساتھ آپ کی تواضع، لطف وکرم اور اعلیٰ اخلاق کا یہ عالم تھا تو دوسروں کے ساتھ تو اس کا مظاہرہ بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا ۞ عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

ملا علی قاریؒ نے لفظ تَاْخُذُ سے پہلے "فرضا وتقدیرا" لکھا ہے یعنی حضرت انسؓ کا منشاء صرف آپ کی غایت تواضع کا بیان کرنا ہے۔ کہ اگر بالفرض مدینہ والوں کی باندیوں میں سے کوئی باندی بھی آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہیں مدینہ میں یا مدینہ سے باہر کسی کام کے لئے لیجانا چاہتی تو آپ

انکار نہ فرماتے۔ یہ نہیں کہ واقعۃً کسی باندی نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ کیونکہ آپ کے رُعب اور ہیبت کی وجہ سے اس کی نوبت نہیں آسکتی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعۃً ایسا کبھی ہوا بھی ہو کیونکہ اس خداداد رُعب کے ساتھ آپ کے عظیم اخلاق اور لطف وکرم نے ضعفاء کو یہ جرأت بخشدی تھی کہ اپنے آقا کے ساتھ وہ برتاؤ کریں جو ایک والہانہ محبت رکھنے والا غلام اپنے شفیق ومہربان آقا کے ساتھ کرسکتا ہے ؎

کرمہائے تو مارا کرد گستاخ ❊ وگرنہ ایں مجالِ ما کجا بود

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ ممتحنہ کی آیات کے مطابق ہجرت کرنے والی عورتوں کا امتحان فرماتے تھے۔ پھر جو عورت سورۂ ممتحنہ میں مذکورہ شرط کا اقرار کرلیتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبانی فرما دیتے کہ میں نے تجھ کو بیعت کرلیا۔ خدا کی قسم آپ کے دستِ مبارک نے کسی عورت کے ہاتھ کو بیعت میں کبھی نہیں چھوا۔ آپ تو عورتوں سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔ (بخاری شریف ص۳۲۵)
معلوم ہوا کہ بیعت کے وقت بھی آپ کسی اجنبیہ کو نہ چھوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بیعت کے علاوہ بدرجۂ اولیٰ آپ کسی اجنبیہ کو نہ چھوتے ہوں گے۔ اور اس روایت میں ہے کہ باندی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی۔ اس کا جواب اوپر آچکا ہے کہ اس سے حقیقتِ واقعہ کا ذکر مقصود نہیں، بلکہ آپ کی غایتِ تواضع کا اظہار ہے کہ اگر بالفرض کوئی باندی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی تو آپ اس کا کام بھی کر دیتے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ "اخذید" کنایہ ہے درخواست اور گذارش سے۔ اور یہ ایک عربی محاورہ ہے اُردو میں بھی بولا جاتا ہے کہ فلاں تو ایسا نرم ہے کہ اس کا پکڑ کر کہیں بھی لیجاؤ۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بیان کیا گیا ہے۔ اور یہاں تاخذ کا فاعل امۃ ہے۔

(۴۷۷) مشکوٰۃ شریف ص۴۳۳ میں بحوالہ مسلم شریف یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے اس طرح منقول ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ وَاحِدًا مِّنْھُمَا اَدْخَلْتُہُ النَّارَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَذَفْتُہُ فِی النَّارِ۔

(رواہ مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے۔ تو جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک چیز میں مجھ سے چھینا جھپٹی کریگا میں اس کو دوزخ میں داخل کر دوں گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس کو دوزخ میں پھینک دوں گا۔

وکذا رواہ ابن ماجۃ وابوداؤد واحمد عن ابی ھریرۃ وابن ماجۃ ایضاً عن ابن عباس ورواہ الحاکم
عن ابی ھریرۃ مختصراً بلفظ الکبریاء ردائی فمن نازعنی ردائی قصمتہٗ۔ حاصل یہ ہے کہ حدیث
مختلف الفاظ اور تقدیم وتاخیر واختصار کے ساتھ مروی ہے۔

اس حدیث پاک میں بطور تشبیہ بلیغ حق تعالیٰ کا ارشاد منقول ہے کہ جس طرح تمہاری چادر
اور لنگی تمہارے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ ان میں دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور نہ کوئی
دوسرا ان میں دخل اندازی کا حق رکھتا ہے۔ اگر بالفرض ان میں کوئی چھینا جھپٹی کرنے لگے تو اسکا
دفاع حسب طاقت کیا جاتا ہے۔ اور ایسے شخص کو سزا دیجاتی ہے۔ اسی طرح عزت وعظمت اور کبر
وکبریائی میری مخصوص صفات ہیں۔ ان میں کسی کو دخل اندازی کا حق نہیں۔ لیکن ان میں اگر کوئی
چھینا جھپٹی کرنے لگے اور ان صفات کو جو میری ذات عالی کے ساتھ خاص ہیں اپنے لئے ثابت
کرنے لگے تو میں اس کو اپنی شان اور قوت کے مطابق سزا دوں گا۔ جس کو قصمتہٗ (میں اس کی
گردن توڑ ڈالوں گا) عذبتہٗ (میں اس کو عذاب دوں گا) اور ادخلتہ النار، قذفتہٗ
فی النار (میں اس کو جہنم رسید کر دوں گا، اس کو نہایت ذلت کے ساتھ دوزخ میں ڈال دوں گا)
جیسے غضبناک الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ملا علی قاریؒ اس روایت کی شرح میں فرماتے
ہیں کہ: کبریاء میری ذاتی صفت ہے۔ جیسا کہ تمہارے نزدیک تمہاری چادر ہوتی ہے۔ اسی طرح عظمت
میری مخصوص صفت ہے۔ جس طرح تمہاری لنگی ہوتی ہے۔ جس میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہوتی۔
کبر وکبریاء چونکہ ذاتی چیز ہے۔ اسی لئے اوپر والے کپڑے سے اس کو تشبیہ دی ہے۔ اور عظمت
اللہ کی صفت ہے۔ اور صفت کا مرتبہ ذات کے نیچے ہوتا ہے، اسی لئے اس کو ازار سے تشبیہ دی ہے
کہ وہ بھی چادر کے نیچے ہوتی ہے۔ (اہل عرب کے یہاں لباس میں دو کپڑے ہوتے تھے۔ ان میں سے
ایک کی لنگی بنا لیتے تھے اور دوسرے کی چادر۔ جس طرح لباس میں آجکل کرتہ اور پائجامہ ہیں) اور
کیونکہ صفت کا مرتبہ ذات کے مرتبہ سے کم اور اس کے بعد ہوتا ہے۔ اسی لئے نماز کو کھڑے
ہوتے اور شروع کرتے وقت تکبیر (اللہ اکبر) کہنے کا حکم ہے۔ اور رکوع میں تعظیم (سبحان ربی
العظیم) کہنا مسنون ہے۔

فمن نازعنی میں فاء فصیحیہ ہے۔ ای فاذا عرفتم ذلک وعلمتم ما ھناک فمن نازعنی بان
تکبّر باعتبار ذاتہ وتعظّم من حیثیۃ صفاتہ واراد نوعاً من المشارکۃ فی نعوت ذاتی
وصفاتی ادخلتہ النار ای نار العذاب وعقاب الحجاب فانہ جزاء الکافرین
وبئس مثوی المتکبرین۔

(ف) بعض علماء کہتے ہیں کہ الکبر والکبریاء والعظمۃ یہ سب الفاظ مترادف ہیں جن کا مطلب

کمالِ ذات وکمالِ وجود ہے۔ اور چونکہ یہ شان صرف باری تعالیٰ کی ہے۔ اس لیے مخلوق پر انکا اطلاق جائز نہیں۔ امام فخرالدین رازیؒ فرماتے ہیں چونکہ حدیث شریف میں کبریاء کو رداء سے تشبیہ دی ہے اور عظمت کو ازار سے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبریاء عظمت سے ارفع اور بلندترین چیز ہے۔ کیونکہ مقامِ رداء مقامِ ازار سے ارفع ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دونوں میں فرق ہے۔ مترادف و متحد المعنی نہیں ہیں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ معنی یہ ہوں کہ وہ متکبر فی ذاتہٖ ہے یعنی یہ صفت ذاتی ہے۔ کوئی دوسرا اس کو تسلیم کرے نہ کرے۔ اور اپنے لیئے اس صفت کو ثابت کرے نہ کرے۔ اور عظمت اضافی صفت ہے کہ مخلوق کو اس کی عظمت پہچاننی چاہیئے۔

(اور ظاہر ہے کہ صفاتِ ذاتیہ، صفاتِ اضافیہ سے اعلیٰ وارفع ہیں۔ اور عزّت بھی الکبریاء کی طرح صفاتِ ذاتیہ میں سے ہے)

والحاصل انّ الکبر هو الاعراض عن الحق وتحقیر الناس وعکسه التواضع هو الاذعان للحق وتوقیر الناس وهو المعبر بالتعظیم لامر الله والشفقة علی خلق الله۔ فالمعنی من تکبّر علی الله وعلی الخلق ابتلاه الله فی الدّنیا بالذّلّ والهوان وفی الآخرة بقذفه فی اقصیٰ درکات النیران ومن تواضع لله مع الخلق رفع الله درجته فی الدّنیا والآخرة والله اعلم بمراد کلامه وکلام رسوله الاکرم صلی الله علیه وسلم۔

(۸۷۴م) لایدخل الجنّة من کان فی قلبه مثقال ذرّة من کبر۔ (وہ شخص جنّت میں نہ جائیگا جس کے دل میں ایک ذرّہ برابر تکبر ہوگا) ذرّہ سے مراد چھوٹی چیونٹی یا ذرّہ غبار ہے۔ مراد اس سے قلت ہے۔ یعنی جس کے دل میں نہایت کم درجہ کا تکبر ہوگا وہ بھی جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کبر مطلقاً نہ مذموم ہے اور نہ کفر، بلکہ تحقیر الناس کبر مذموم اور انکارِ حق کبر کفر ہے۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی قسم کا بھی کبر ہو اور اس کی کتنی ہی مقدار قلب میں ہو وہ دخولِ جنّت سے مانع ہے۔ پھر اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ذرّہ بھر ایمان والا دوزخ میں نہ جائیگا۔ حالانکہ بعض اقسامِ کبر کے ساتھ قلب میں ایمان جمع ہو سکتا ہے۔ تو اس اعتبار سے حدیث کے دونوں جملوں میں تعارض بھی ہوجاتا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں کبر کی ایک مخصوص نوع مراد ہے یعنی بطر الحق جو کفر و شرک ہے۔ اور بعض حق کا انکار بھی ایسا ہی ہے جیساکہ کل حق کا انکار ہے۔ (ولا شك ان الایمان ببعض ما یجب الایمان به کلا ایمان) اور اس مخصوص نوع کے مراد لینے پر قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایمان کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ کفر و شرک کا مرتکب شخص کبھی بھی جنت میں نہیں جا سکتا۔ اور اگر کبر سے مراد وہ کبر ہے جو کفر سے کم درجہ کا ہے یعنی صرف مذموم و گناہ ہے، تو اس صورت

میں مطلب ہوگا کہ متکبر جنت میں دخولِ اوّلی کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو سزا دے کر یا معاف فرما کر جنت میں داخل فرما دیں تو یہ ان کے عدل وفضل کا معاملہ ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں کبر ہوگا وہ اس کبر کے ہوتے ہوئے جنت میں نہ جائے گا۔ اگر وہ درجۂ کفر تک ہوگا تو جنت میں کبھی نہ جائے گا۔ اس سے کم ہوگا تو اس کے قلب کی صفائی سزا یا معافی سے کر کے اس کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ قلوبِ مؤمنین کو دوسرے رذائل وذمائم سے پہلے پاک کیا جائے گا۔ پھر ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ قال تعالیٰ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا۔ (الحجر، پ۱۴) یعنی ہم ایمان والوں کے سینوں کو کینے کپٹ سے پاک کر کے بھائی بھائی بنا کر جنت میں داخل کریں گے۔

ولا یدخل النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان۔ دخول سے مراد دخولِ مؤبد و مخلد ہے یعنی ہمیشہ کے لئے وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔ بلکہ بفضلِ خداوندی اول وہلہ میں، یا گنہگار ہے تو سزا بھگت کر یا عفوِ جرائم کے بعد جنت میں چلا جائے گا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اشارہ اور تنبیہ ہے کہ کبر صفاتِ کافرین میں سے ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب واجب ہے۔ اور تواضع مؤمنین کی صفات میں سے ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کو اپنایا جائے۔

مشکوٰۃ شریف میں اس روایت میں صرف جزءِ اول ہے۔ اور ولا یدخل النار الخ اس روایت میں نہیں ہے۔

فقال رجل۔ رجل سے مراد معاذ بن جبلؓ یا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ یا ربیعہ بن عامرؓ ہیں (فیہ اقوال)

انہ یعجبنی اور روایت مشکوٰۃ میں عبارت اس طرح ہے کہ:

انّ الرّجل یحبّ ان یکون ثوبہ حسنًا ونعلہ حسنًا قال انّ اللہ تعالیٰ جمیل یحبّ الجمال الکبر بطر الحق وغمط النّاس۔	آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو۔ فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ صاحبِ جمال ہیں۔ جمال کو پسند فرماتے ہیں۔ تکبّر تو حق کا انکار اور لوگوں کی تحقیر ہے۔

سائل کے سوال کا سبب یہ ہے کہ اکثر متکبرین کی عادت یہ ہوتی ہے کہ وہ عمدہ لباس پہنتے ہیں اور اس سے وہ اپنی بڑائی ظاہر کرتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ عمدہ لباس اور بہترین جوتا پہننا تکبر نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو جمال ہے۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ جمیل ہیں۔ وہ جمال کو پسند فرماتے ہیں۔ یعنی اپنی مخلوق میں صفتِ جمال کے ظہور کو پسند فرماتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مخلوق کو اپنی صفات کے اظہار کے لئے عطا فرمایا ہے۔ تو اللہ کی مخلوق صفاتِ خالق کی مظہر ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی ذات اپنی صفات، اپنے افعال میں جمیل ہیں۔ مخلوق میں صوری و معنوی ہر قسم کا

جمال انہی کے جمال کا پرتو ہے۔ فلا جمال ولا جلال ولا کمال فی الحقیقۃ الا للہ۔
جواب کی وضاحت یہ ہے کہ عمدہ لباس پہننے سے مقصد اگر اللہ کی نعمت کا استعمال واظہار ہے۔ مخلوق پر نظر نہیں تو یہ کبر نہیں۔ بلکہ شکر ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے۔ اور اگر اس سے مقصود خلقِ خدا پر اپنی برتری جتانا، ریا کاری، دکھلاوا وغیرہ ہیں تو یہ تکبر ہے۔ اور اس کی پہچان یہ ہے کہ خلوت میں بھی اس جمال کو پسند کرے جس طرح جلوت میں پسند کرتا ہے۔ اور جلوت میں بھی خلق پر نگاہ نہو جس طرح خلوت میں نہیں ہے۔

(ف) النعل ما وقیت به القدم وهی مؤنثة سماعیة ذکرها ابن حاجب فی رسالته فیما یجب تانیثه وفی المشارق ونعله حسنة فالتذکیر هنا باعتبار معناها وهو ما وقیت به القدم ویمکن ان یقال التقدیر ونعله ذات حسن اوعدل عن فعلاء الی فعل للمشاکلة مع قابلیة اللفظ ان یقرء کذلك۔ والله اعلم۔

ولکن الکبر الخ اس جملہ میں آپ نے تکبر کی حقیقت ارشاد فرمائی جس کی وضاحت اوپر آچکی۔
وغمص الناس دوسری روایت میں غمط الناس ہے۔ اور دونوں کے معنی تحقیر الناس کے ہیں۔

(۴۷۹) اس حدیث سے دو چیزیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ کسی کے متعلق خواہ مخواہ بدگمانی نہ کرنی چاہیئے کہ وہ متکبر ہے۔ چنانچہ حضرت جبیر بن مطعمؓ کے متعلق ان کی خودداری سے لوگوں کو تکبر کا شبہ ہوتا تھا جو واقعہ کے خلاف تھا۔ تکبر قلب میں ہوتا ہے۔ اور قلب کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تواضع کی نشانیاں گدھے پر سوار ہونا، معمولی لباس پہن لینا۔ بکری کا دودھ دوہنا بھی ہیں۔ جو شخص ایسے معمولی کام کر لیتا ہو اس میں کبر پیدا نہیں ہوتا۔ متکبرین یہ کام نہیں کرتے۔ یہ ظاہری علامات ہیں۔ اور حقیقت کا علم اللہ کو ہے۔ اسی لئے حضرت جبیرؓ نے فرمایا کہ لوگ مجھ کو متکبر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں گدھے پر سوار ہو جاتا ہوں، گدڑی پہن لیتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہ لیتا ہوں۔ یہ سب تواضع کی علامات میرے اندر موجود ہیں۔

الرِّفْعَةُ فِي الْأُمُوْرِ

چیزوں میں بلندی

(۴۸۰) عَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يُرْفَعَ شَيْءٌ مِّنَ الدُّنْيَا اِلَّا وَضَعَهٗ۔ (بخاری ص۹۶۳)

حضرت انسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ بیشک اللہ کے ذمہ ضروری ہے یہ بات کہ دنیا کی جو شئ بھی بلند ہو اس کو پست فرما دیں۔

تشریح یہ روایت کا اخیر ٹکڑا ہے۔ پوری روایت اس طرح ہے:

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ کَانَتْ نَاقَةٌ لِّرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُسَمّٰى الْعَضْبَاءَ وَكَانَتْ لَا تُسْبَقُ فَجَاءَ اَعْرَابِيٌّ عَلٰى قَعُوْدٍ لَّهٗ فَسَبَقَهَا فَاشْتَدَّ ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَقَالُوْا سُبِقَتِ الْعَضْبَاءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ حَقًّا الخ

(بخاری شریف ۲/۹۶۳ و ۴۰۵)

حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا اور وہ (اور اونٹنیوں سے) پچھڑتی نہ تھی تو ایک گاؤں والا اپنے ایک جوان اونٹ پر آیا اور وہ اس اونٹنی سے آگے نکل گیا تو یہ بات مسلمانوں پر گراں گذری اور (افسوس کے ساتھ) کہنے لگے کہ عضباء پچھڑ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ پر ضروری ہے یہ بات کہ دنیا کی جو شئے بلند ہو اُس کو پست فرمادیں

مطلب حدیث کا بالکل ظاہر ہے کہ ہر کمالے را زوالے۔ اس حدیث میں اس پر تنبیہ ہے کہ ترفع اس دنیا میں مناسب نہیں۔ بلکہ تواضع و عاجزی اور انکساری اختیار کرنی چاہیئے۔ اور اس بات کی تعلیم ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے۔ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ ہر کمال کو زوال ضروری ہے۔ اسی لئے کہ تمام امورِ دنیا ناقص ہیں۔ واصدق کلمۃ قالہا الشاعر کلمۃ لبید بن ربیعۃ العامریؓ ؎

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ ❊ وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مُحَالَةَ زَائِلٌ

نَعِيْمُكَ فِي الدُّنْيَا غُرُوْرٌ وَّحَسْرَةٌ ❊ وَعَيْشُكَ فِي الدُّنْيَا مُحَالٌ وَّبَاطِلٌ

اَلْغَضَبُ وَالْعَفْوُ بَعْدَ الْقُدْرَةِ

غصہ کرنا اور قابو پانے کے بعد معاف کر دینا۔

(۴۸۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِيْ قَالَ لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ ذٰلِكَ مِرَارًا قَالَ لَا تَغْضَبْ (بخاری شریف)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ کو وصیت (نصیحت) فرما دیجیے۔ آپ نے فرمایا غصہ نہ کرو۔ اس نے چند بار یہی الفاظ دہرائے آپ نے (ہر مرتبہ) فرمایا غصہ نہ کرو۔

(۴۸۲) عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ يُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا

حضرت بہز بن حکیمؒ اپنے باپ سے وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بیشک غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح

يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ۔ (مشکوٰۃ ص۴۳۴)

شہد کو ایلوا خراب کر دیتا ہے۔

(۴۸۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ أَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ جُرْعَۃِ غَيْظٍ

نہیں گھونٹ گھونٹ پیا کسی بندہ نے (کسی چیز کو) جو اللہ عزّوجل کے نزدیک افضل ہو غصّہ کے

يَكْظِمُهَا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰہِ۔ (مشکوٰۃ ص۴۳۴)

گھونٹ سے جس کو وہ اللہ کی خوشنودی کی جستجو میں پیتا ہے۔

(۴۸۴) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

قَالَ مُوْسَى بْنُ عِمْرَانَ يَا رَبِّ مَنْ أَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ قَالَ

موسیٰ بن عمران (علیہ السّلام) نے عرض کیا اے میرے رب آپکے نزدیک آپکے بندوں میں سے کون

مَنْ إِذَا قَدَرَ غَفَرَ۔ (مشکوٰۃ ص۴۳۴)

زیادہ صاحب عزت ہے؟ فرمایا وہ جو قابو پاکر معاف کر دے۔

(۴۸۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ فِيْ قَوْلِہٖ تَعَالٰى اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ

باری تعالیٰ کے قول "ادفع بالتی ہی احسن" کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے انہوں نے

قَالَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْإِسَآءَةِ فَإِذَا

فرمایا کہ غصّہ کے وقت صبر کرنا اور برائی کے وقت معاف کر دینا (عمدہ طریقہ ہے) پھر جب اس کو

فَعَلُوْهُ عَصَمَهُمُ اللّٰہُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ كَأَنَّهٗ

کرلیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمادیں گے اور ان کا دشمن ان کے لیے جھک جائیگا۔ پھر تو وہ ایسا

وَلِيٌّ حَمِيْمٌ۔ (مشکوٰۃ ص۴۳۴)

ہو جائے گا کہ گویا وہ مخلص دوست ہے۔

(۴۸۶) عَنْ أَبِيْ ذَرٍّؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ قَالَ

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب

إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَآئِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَإِنْ ذَهَبَ عَنْہُ

تم میں سے کسی کو غصّہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ پھر اگر غصّہ دُور ہو جائے

الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ ۔ (مشکوٰۃ صـ۴۳۳)
تو ٹھیک ہے ورنہ لیٹ جائے۔

تشریح (۴۸۱) انّ رجلاً اس رجل سے مراد ابن عمرؓ یا حارثہ بن قدامہؓ یا سفیان بن عبد اللہؓ ہیں۔ ان میں سے کسی نے یا اور کسی نے درخواست کی کہ مجھ کو کوئی ایسی مخصوص نصیحت فرما دیجئے۔ جو دین و دنیا میں مجھ کو نفع دے۔ آپ نے مختصر مگر جامع نصیحت فرمائی لَاتَغْضَبْ غصہ نہ کرو۔ اس شخص نے کئی بار یہی درخواست کی۔ اور درخواست بار بار کرنے کا منشاء یہ تھا کہ آپ اسکے ساتھ کچھ اور بھی ارشاد فرما دیں لیکن آپنے ہر بار یہی حکم فرمایا۔ لاتغضب۔ کیونکہ غضب کی حقیقت ہے ثورانُ دم القلب عند ارادۃ الانتقام اودفع الموذی (دل کے خون کا کھولنا انتقام لینے یا ایذاء رساں چیز کو دفع کرنے کے لیئے) اور یہ اکثر شیطانی وسوسہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انّ الغضب من الشیطان۔ (مشکوٰۃ صـ۴۳۴) جس سے انسان کا ظاہر و باطن مطلوب حدِّ اعتدال سے نکل جاتا ہے۔ اس کے اقوال و افعال راہِ راست سے ہٹ جاتے ہیں۔ عرفًا اور شرعًا وہ قابلِ مذمت اور باطل حرکات و اقوال کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ اسی کو سوء خلق سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس سے تمام رذائل و قبائح (بغض حسد، کینہ، دشمنی وغیرہ) پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ کفر تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اسی لیئے سائل کے اصرار کے باوجود آپ نے ایک ہی نصیحت فرمائی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے اخلاق درست کر لو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جوامع الکلم میں سے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب کو اس نصیحت وہدایت کی زیادہ ضرورت ہو۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ غضب کا علاج ایک معجون مرکب میں ہے۔ جس کی ترکیب ان اجزاء سے ہوتی ہے۔ (۱) علم صحیح۔ (۲) عمل صالح (۳) اس بات کا یقین کہ سب کچھ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ (انّ اللہ حاکم وحکیم۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے اور حکمت سے ہوتا ہے) (۴) اپنی کمزوری کو سامنے رکھے، اور یہ سوچے کہ اللہ کا غضب میرے غضب سے بہت بڑا اور اس کا فضل بہت زیادہ ہے۔ (۵) یہ خیال کرے کہ میں نے کتنی مرتبہ اللہ کے امر کی مخالفت کی مگر وہ پھر بھی ناراض نہیں ہوا۔ (۶) ان سب کے بعد وضو کرے اور اپنے آپ کو کسی کام میں مشغول کردے۔ اس کے علاوہ ایک علاج ۴۸۶ میں آرہا ہے۔

دراصل تمام مفاسد کی بنیاد شہوت کی زیادتی اور غلبۂ غضب ہے۔ اور اکثر غضب کا مدار شہوت ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان غضب مذموم میں اسی وقت مبتلا ہوتا ہے جبکہ اس کی

شہوت وخواہش فوت ہوتی ہے۔ یا اس کے فوت ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کی شہوت وخواہش زیادہ ہوتی ہے انہی لوگوں کو غصب زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے ملوک وامراء اور حکام کہ ان لوگوں کی خواہشات زیادہ ہوتی ہیں۔ تو غصہ بھی حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اور شہوت وغضب کی زیادتی اکثر مذموم ہوتی ہے۔ اسی لئے بے جا غصہ وغضب سے احتیاط واجب ہے۔

(۴۸۲) بہز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غضب ایمان کو خراب کر دیتا ہے۔ اکثر تو کمالِ ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔ اور اس کے نور ورونق کو ختم کر دیتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ ایمان کو بالکل ہی خراب کر دیتا ہے اور کفر تک نوبت آجاتی ہے۔ اور غضب کے بعض افراد کیونکہ ایسے خطرناک ہیں کہ کفر تک پہونچا دیتے ہیں۔ تو یہ فرمانا بالکل درست ہوا کہ كما يفسد الصَّبِرُ العَسَلَ (الصبر بفتح الصاد وكسر الباء وقد يسكن وقال صاحب القاموس الصبر ككتف ولا يسكن الا في ضرورة الشعر عصارة شجرة مرّ واما كسر الصاد وسكون الباء على ما اشتهر على الالسنة فلعله ماخوذ من قوله ككتف فان الكتف فيه لغتان۔ والله اعلم (مرقاۃ ۳۴۲ج۴) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غضب مفاسد کی بنیاد ہے۔ اور اس کے نتائج دنیاؤ آخرت میں خطرناک نکلتے ہیں۔ کہ اس سے دنیوی زندگی کی حلاوت میں تلخی آجاتی ہے۔ اور ایمان کی حلاوت جاتے رہنے سے آخرت کی تلخی مقدر ہوجاتی ہے۔

(۴۸۳) جب غصہ کی تلخی مسلم ہے تو اس کے تلخ گھونٹوں کو حلق سے اتارنا بھی بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب۔ (مشکوٰۃ ۴۳۳)	(پہلوان وہ نہیں جو پچھاڑ ڈالے پہلوان تو وہی ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو پالے۔

اور جب غصہ کے تلخ گھونٹوں کو پینا سخت مجاہدہ ہے۔ تو اللہ کے نزدیک بھی یہ عمل افضل ہوا۔ بشرطیکہ اس سے رضائے خداوندی کا جذبہ قلب میں ہو۔ ورنہ اور کسی دنیوی غرض یا مقابل کے زیادہ طاقتور ہونے کی وجہ سے اگر غصہ کو پیتا ہے۔ تو نہ یہ کوئی کمال ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت۔

(۴۸۴) حضرت موسیٰؑ نے پوچھا اے پروردگار آپ کے بندوں میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز اور بلند مرتبہ والا کون ہے؟ فرمایا کہ جو قابو پاکر بھی معاف کر دے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کے باوجود معاف کر دینا تخلق باخلاق اللہ ہے۔ اللہ جل شانہٗ قدیر ہیں۔ اور غفار بھی ہیں۔ قال تعالیٰ إِن تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَن سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا۔ اس حدیث میں اعتدال مطلوب پر تنبیہ ہے۔ اور اعتدال ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس لئے کہ

قدرت صفتِ جلال ہے۔ اور عفو صفتِ جمال۔ اور دونوں سے مل کر اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لئے قابو کے باوجود عفو کی صفت اختیار کرنے سے اعتدال حاصل ہوجائے گا۔ اور غلبۂ غضب سے جو اعتدال فوت ہوگیا تھا وہ واپس لوٹ آئے گا۔

(۴۸۵) آیت شریفہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ الخ میں دعوت الی اللہ کی خدمت انجام دینے والوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ دیں۔ بلکہ صبر اور احسان سے کام لیں۔ اور لوگوں کی بُرائی کو بھلائی کے ساتھ دفع کریں۔ یاد رکھیئے کہ کسی بُرائی پر جوابی کارروائی کے تین طریقے ہیں۔

(۱) بُرائی کا بدلہ برابر بُرائی سے دیا جائے۔ یہ انصاف ہے۔ اور اس کی اجازت بھی ہے۔ لیکن اس سے بُرائی مٹی نہیں۔ بلکہ دو بُرائیاں وجود میں آگئیں۔

(۲) بُرائی کو معاف کردیا جائے۔ یہ عمل حسن یعنی نیک کام ہے۔ کہ اس سے بُرائی آگے نہیں بڑھی بلکہ ختم ہوگئی۔

(۳) بُرائی کے بدلہ بُرائی کرنے والے کو معاف کر کے اس کے ساتھ مزید احسان وسلوک کا معاملہ کیا جائے۔ اس طریقہ سے بُرائی بھی مٹ گئی۔ مزید برآں محبت پیدا ہو کر تعلقات بھی استوار ہوگئے۔ اس لئے یہ تیسرا طریقہ افضل واحسن ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اَلَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ یعنی وہ بہترین خصلت جس سے عداوت ختم ہو کر محبت پیدا ہوجائے یہ ہے کہ جو شخص تم پر غصہ کا اظہار کرے تم اس کے مقابلہ میں صبر سے کام لو۔ جو تمہارے ساتھ جہالت اور بُرائی سے پیش آئے اس کو معاف کردو۔ اس حلم و بُردباری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ ایسا کرنے والوں کی ہر طرح حفاظت فرمائیں گے۔ اور ان کے دشمن کو ان کے سامنے پست کر کے نہایت مخلص دوست بنادیں گے۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو کسی نے بُرا بھلا کہا، آپ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں خطا وار اور بُرا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادیں۔ اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائیں۔ (معارف)

(۴۸۶) اس حدیث میں غصہ کا علاج بتایا گیا ہے۔ کہ جب غصہ آئے تو اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہے تو لیٹ جائے۔ یہ علاج بالضد تجویز فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ غصہ جو شیطانی وسوسہ سے پیدا ہوتا ہے اس کا تقاضا خفت وتعلّی ہے۔ اس لئے کہ شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے۔ اور آگ کا مزاج یہی (خفت وتعلّی) ہے۔ پھر غصہ میں قیام الی الانتقام ہوتا ہے۔ جلوس اس کی ضد ہے۔ گویا یہ قعود عن الفتنہ ہے۔ جلوس سے غصہ کا اثر ختم ہوجائے تو اتنا ہی کافی ہے لیکن اگر باقی رہے تو لیٹ جائے کیونکہ اس میں انسان اپنی اصل تراب کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

جس کا اثر تواضع ہے، تو اس صورت میں کبر سے تواضع کی طرف رجوع ہے۔ علاوہ ازیں غصہ کا تقاضا حرکت تھا، اور اضطجاع کا تقاضا سکون ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ غصہ شیطان (کے وسوسہ سے) پیدا ہوتا ہے۔ اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے۔ اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ لہٰذا تم میں سے جس کو غصہ آئے اس کو چاہیئے کہ وضو کر لے۔ (مشکوٰۃ ص۴۳۴)

اَلْبُخْلُ

کنجوسی

(۴۸۷) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ
حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَ
کہ دو عادتیں کسی مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور
سُوْءُ الْخُلُقِ۔ (ترمذی ص۱۸ ج۲ مشکوٰۃ ص۱۶۵)
بد اخلاقی۔

(۴۸۸) عَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا
قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ خِبٌّ وَلَا بَخِیْلٌ وَلَا مَنَّانٌ۔ (ترمذی ص۱۸ ج۲ مشکوٰۃ ص۱۶۵)
کہ جنت میں داخل نہ ہوگا دھوکہ باز اور نہ کنجوس اور نہ قطع رحمی کرنے والا (یا احسان جتانیوالا)

(۴۸۹) عَنْ قَتَادَۃَ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ اَبِیْہِ (عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ)
حضرت قتادہ حضرت مطرف سے اور وہ اپنے والد (عبد اللہ بن الشخیر) سے نقل کرتے ہیں کہ
اَنَّہٗ اِنْتَہٰی اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یَقُوْلُ
وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچے تو آپ الھکم التکاثر پڑھ رہے تھے۔
اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ قَالَ یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ مَالِیْ وَھَلْ لَکَ
آپ نے فرمایا کہ آدم کا بیٹا (انسان) کہتا ہے میرا مال میرا مال۔ اور تیرے مال میں سے تیرا اسکے
مِنْ مَّالِکَ اِلَّا مَا تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَیْتَ اَوْ اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ اَوْ
سوا کچھ نہیں کہ جو تو نے صدقہ دیکر آگے بھیجدیا، یا کھاکر ختم کر دیا
یا

لَبِسْتَ فَاَبْلَيْتَ ۔ (ترمذی ص۵۵ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۳۲)
پہن کر پرانا کردیا۔

(۴۹۰) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ

يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلٰثٌ فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَيَبْقٰى وَاحِدٌ يَتْبَعُهٗ اَهْلُهٗ
میت کے پیچھے تین چیزیں جاتی ہیں۔ پھر دو واپس ہوجاتی ہیں اور ایک رہ جاتی ہے۔ اسکے پیچھے گھروالے جاتے

وَمَالُهٗ وَعَمَلُهٗ فَيَرْجِعُ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَيَبْقٰى عَمَلُهٗ ۔ (ترمذی ص۶۱ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۴۰)
ہیں اور اس کا مال اور عمل جاتا ہے۔ پھر اسکے گھروالے اور مال تو لوٹ جاتے ہیں اور اسکا عمل باقی رہ جاتا ہے۔

(۴۹۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ
کہ تم میں سے کون ایسا ہے جس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زائد محبوب ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا اے رسول خدا

مَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ اَحَبُّ اِلَيْهِ قَالَ فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ
ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کو اس کا اپنا مال (وارث کے مال سے) زیادہ محبوب نہو۔ آپنے فرمایا کہ اس کا

وَمَالُ وَارِثِهٖ مَا اَخَّرَ ۔ (بخاری ص۹۵۱ مشکوٰۃ ص۴۴۰)
اپنا مال تو وہ ہے جو اس نے آگے بھیجدیا۔ اور اسکے وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑدیا۔

تشریح بخل کی حقیقت وَاٰتِی الزَّکٰوۃَ کے تحت جزء اول میں مفصّل گذر چکی ہے۔ اسی طرح "انفاق فی سبیل اللہ" کے بارے میں کافی نصوص مع تفصیلات وتشریحات آچکی ہیں۔ اس لیئے یہاں زیادہ توضیح وتشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴۸۷) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو خصلتیں بخل وسوءِ خلق کسی مؤمن میں جمع نہوں گی۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی مؤمن کامل میں یہ دونوں خصلتیں جمع نہوں گی۔

(۲) یا معنی ہیں لاینبغی ان یجتمعا فیہ۔ یعنی کسی مؤمن میں دونوں کا اجتماع نازیبا ونامناسب اور اس کی شانِ ایمان کے خلاف ہے۔ (۳) علامہ تورپشتیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں خصلتیں پورے طور پر کسی مؤمن میں اس طرح راسخ نہیں ہوسکتیں کہ اس سے جدا نہوں اور وہ ان خصلتوں پر راضی بھی ہوتا ہو۔ گاہے بخل اور کسی معاملہ میں اس طرح بداخلاقی کہ بعد میں اس کا نفس اس کو ملامت کرے۔ اور وہ اسپر پچھتائے ایمان کے منافی نہیں۔ اور نہ مؤمن کی

شان کے خلاف ہے۔ اور سوءِ خلق سے مراد احکامِ ایمان کی خلاف ورزی ہے۔ ورنہ مثلاً اللہ کے لئے غضب محمود ہے۔ یہاں دو باتیں یاد رکھئے (۱) البخل بضمّ الباء وسکون الخاء وبفتحهما ایسے ہی الخلق بضمهما وسکون الثانی دونوں طرح درست ہے۔ (۲) البخل وسوء الخلق معطوفین مبتدا مؤخر۔ اور خصلتان اپنی صفت لایجتمعان فی مؤمن سے ملکر خبر ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ خصلتان مبدل منہ البخل وسوء الخلق بدل۔ دونوں ملکر مبتدا ہے۔ اور معرفہ کی بدلیت نے اس کا مبتدا بننا صحیح کر دیا ہے۔ اور لایجتمعان خبر ہے۔ لیکن یہ ترکیب مغلق ہے۔ بلکہ سہل ترکیب یہ ہے کہ خصلتان موصوف ہے۔ اور جملہ لایجتمعان صفت نے اس میں تخصیص پیدا کر دی ہے اسلئے اس کا مبتدا بننا درست ہے۔ اور البخل وسوء الخلق خبر ہے۔

(۴۸۸) لایدخل الجنّة ای دخولاً اوّلیاً۔ خِبٌّ بفتح الخاء وکسرها دھوکہ باز۔ جو لوگوں میں اپنے دھوکہ سے فساد کرتا ہے۔ ولا بخیل الذی یمنع الواجب من المال۔ ولا منّانٌ یہ مِنّۃ سے ہے تو معنی احسان جتانے والا ہوں گے۔ یعنی جو عطاء کے بعد فقراء پر احسان جتاتا ہے۔ یا یہ منٌّ بمعنی القطع سے ماخوذ ہے۔ تو معنی ہوں گے الذی یقطع ما یجبُ ان یوصل جس میں رشتہ توڑنا بھی داخل ہے۔ بعض شراح نے اس حدیث کی یہ توجیہ کی ہے کہ انسان مؤمن ان صفات کے ساتھ جنت میں نہ جائے گا بلکہ ان سے پاک ہو کر جائے گا۔ پھر وہ یا تو دنیا میں توبہ کر لے یا آخرت میں سزا بھگت لے، یا حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے معاف فرما دیں اور اہلِ حقوق سے معاف کرا دیں۔ ویؤیدہ قوله تعالیٰ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴۸۹) عَنْ مُطَرِّفٍ بضمّ المیم وکسر الراء المشدّدة العامری البصری روی عن ابی ذرّ و عثمان بن ابی العاص مات سنة سبع وثمانین۔ الشخیر بکسر الشین وتشدید الخاء من ذکرہٗ انہٗ انتہی الخ مشکوٰۃ شریف میں ہے قال اتیتُ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقرءُ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو آپ سورۃ تکاثر پڑھ رہے تھے۔ آپ نے سورۃ کو پڑھکر فرمایا کہ) آدم کا بیٹا کہتا ہے میرا مال میرا مال یعنی اپنے آپ کو مال کا مالک بتاکر اس پر فخر کرتا ہے (حالانکہ آدم کا بیٹا اور خاک کا پتلہ ہونے کے ناطے اس کو فخر وغرور کی گنجائش نہیں) مشکوٰۃ میں ہے قال وھل لك یا ابن آدم الخ آپ نے فرمایا کہ اے ابن آدم تجھکو فائدہ وہی مال دے سکتا ہے جو تو نے صدقہ دے کر آگے پہنچا دیا۔ کہ وہی تیرے لئے اللہ کے پاس باقی رہا۔ قال تعالیٰ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہوگا وہی

باقی رہنے والا ہے) اور جو تو نے کھا کھپالیا، اور جو تو نے پہن پھاڑا۔ ان دونوں صورتوں میں دُنیوی فائدہ ہوا۔ اور جو یہاں باقی رہا وہ اوروں کے لیئے رہا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ وَاِنَّ مِنْ مَّالِهٖ ثَلٰثٌ مَا اَكَلَ فَاَفْنٰى اَوْلَبِسَ فَاَبْلٰى اَوْ اَعْطٰى فَاقْتَنٰى وَمَاسِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ۔

بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال۔ اور اسکے مال میں سے اسکے لیئے تین فائدے ہیں۔ جو اس نے کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر پُرانا کر دیا (یہ دُو ظاہری وفانی فائدے ہیں) یا دے کر (اللہ کے خزانے میں) جمع کر دیا (یہ حقیقی اور باقی فائدہ ہے) اور اسکے سوا اسکے ہاتھ سے جاتا رہیگا۔ اور وہ اس کو دوسروں کے لیئے چھوڑ جائے گا۔

(۴۹۰) میت کی قبر تک تین چیزیں جاتی ہیں۔ جن میں سے دُو واپس لوٹ آتی ہیں اور ایک میت کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے۔ اس کے اہل یعنی اولاد اور اقارب واحباب جاتے ہیں۔ اور مال یعنی اس کے غلام اور باندیاں وغیرہ۔ اور اس کے اعمال۔ اوّل دُو چیزیں واپس ہوجاتی ہیں۔ صرف عمل اس کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اس تیسری چیز کو بہتر سے بہتر بنانا چاہیئے۔ ولذا قیل القبر صندوق العمل وروضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النيران۔

(۴۹۱) مطلب ظاہر ہے کہ جب اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے۔ تو اپنا مال وہی ہے جو اللہ کے خزانہ میں جمع کر دیا گیا۔ اور جو چھوڑ دیا وہ تو وارث ہی کا مال ہے۔ قال تعالیٰ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (جو بھلائی تم آگے اپنے لیئے بھیجو گے اللہ کے پاس اسی کو پاؤگے)

اَلْاِسْرَافُ وَالتَّبْذِيْرُ

فضول خرچ کرنا اور بے جا خرچ کرنا

(۱۹۲) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور رشتہ دار کو اس کا حق دیتے رہیئے۔ اور محتاج و مسافر کو بھی اور بے جا مت اڑایئے۔ بیشک بیجا مال اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور اگر آپ کو ان سے بے رُخی کرنی

عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل آیت ۲۶ تا ۲۹)

الزام خوردہ ... تہی دست ہو بیٹھیں۔

تشریح اول دو آیات (۲۶، ۲۷) میں رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق کا بیان اور فضول خرچی کی ممانعت مذکور ہے۔ ان سے پہلی آیات میں والدین کے حقوق کا بیان ہے۔ ہر رشتہ دار کا حق ادا کیا جائے۔ جو کم از کم ان کے ساتھ حسن سلوک وعمدہ معاشرت ہے۔ اور اگر وہ محتاج ہوں تو بقدر وسعت ان کی مالی امداد بھی اس میں داخل ہے۔ یہاں سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ ہر شخص پر اس کے رشتہ داروں کے حقوق ہیں۔ لیکن ان کی تفصیل یہاں مذکور نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ اس فرمان اور دیگر نصوص کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ رشتہ دار ذی رحم محرم اگر عورت یا بچہ ہے اور ان کے پاس اپنے گذارہ کا سامان نہیں ہے اور کمانے پر بھی انکو قدرت نہیں ہے۔ اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم اپاہج یا نابینا ہو، اور اس کی ملک میں اتنا سامان نہیں جس سے اس کا گذارہ ہو سکے۔ اور ان کے قریبی رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں تو ان پر ان معذوروں کا نفقہ واجب ہے۔ اور اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر بقدرِ وراثت ان کے گذارہ کا نفقہ تقسیم ہوگا۔ سورۃ بقرہ کی آیت وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ سے بھی یہی حکم ثابت ہوتا ہے۔ (مظہری)

اس آیت (۲۶) میں اہل قرابت ومسکین ومسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی و ہمدردی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتلانے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا حق اس کے ذمہ فرض ہے۔ دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ پھر کسی پر احسان جتانے کا اس کو کیا حق ہے؟

فضول خرچی کی ممانعت ان دونوں آیتوں میں تبذیر یعنی فضول خرچی کی ممانعت بھی ہے۔ فضول خرچی کو قرآن پاک نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے۔ (۱) تبذیر (۲) اسراف۔ تبذیر کا ذکر تو مذکورہ آیات میں ہے۔ اور اسراف کا

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا میں بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ متحد المعنیٰ اور مترادف ہیں۔ کہ کسی معصیت میں یا بے موقع خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے دونوں میں فرق کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع خرچ کرنے کو تبذیر، اور جائز موقع پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو اسراف کہتے ہیں۔ اور چونکہ تبذیر اسراف سے اشد ہے۔ اسلئے مبذرین کو شیاطین کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال راہِ حق میں خرچ کردے تو یہ تبذیر نہیں۔ اور اگر باطل کے لیئے ایک مُد (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو یہ تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ غیر حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو حاصل تو حق کے مطابق کرے مگر خلافِ حق خرچ کرڈالے۔ اور اسی کا نام اسراف ہے۔ اور یہ حرام ہے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حرام و ناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے۔ اور جائز و مباح خواہشات میں حد سے زائد خرچ کرنا جس سے آئندہ فقیر و محتاج ہو جانے کا اندیشہ ہو تو یہ بھی تبذیر میں داخل ہے۔ ہاں اگر کوئی اصل رأس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع کو اپنی خواہشات پر وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں۔ (قرطبی ص۲۴۸ ج۱۰)

آیت (۲۸) میں یہ حکم ہے کہ اگر کسی وقت حاجتمندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقت بھی روکھا جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے، اور ان کی دلجوئی کرتے ہوئے ان سے وعدہ کرلیا جائے کہ انشاء اللہ کہیں سے مال حاصل ہوگا تو دیں گے۔ غرض دل آزار جواب نہ دیا جائے۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے امت کی عجیب اخلاقی تربیت فرمائی گئی ہے۔ کہ اگر کسی وقت حاجتمندوں کو دینے کے لیئے کچھ نہ ہو اور اعراض پر مجبور ہوں تو یہ پہلوتہی بے نیازانہ اور توہین آمیز نہ ہو۔ بلکہ اپنے عجز و مجبوری کے اظہار اور سائلین کی دلجوئی کے ساتھ ہو۔

اس آیت کے شانِ نزول میں ابن زید کی روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا سوال کرتے تھے۔ اور آپ کو معلوم تھا کہ اگر ان کو مال دیا جائے گا تو یہ لوگ اس کو فساد و گناہ میں خرچ کریں گے۔ تو آپ ان کو عطا فرمانے سے انکار کردیتے تھے۔ کہ یہ انکار ان کے فساد و گناہ کو روکنے کا ذریعہ تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مسند سعید بن منصور میں بروایت سیار بن حکم مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کپڑا آیا تھا۔ آپ نے وہ مستحقین پر تقسیم فرمادیا۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آئے

جبکہ آپ فارغ ہو چکے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم
آیت (۲۹) میں خرچ کرنے میں اعتدال کی تعلیم و ہدایت ہے۔ کہ سارے عالم کی حاجات کا پورا کرنا تو رب العلمین ہی کا کام ہے۔ آپ فکر میں کیوں پڑے کہ اپنے سے ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر سب کی حاجتیں پوری کریں۔ یہ صورت اس لیئے نامناسب ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی سب کی حاجتیں پوری کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کوئی کسی کا غم نہ کرے۔ اور اس کے لیئے تدبیر نہ کرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب کی حاجتیں پوری کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔ خواہ وہ اپنے اوپر کتنی ہی مصیبت برداشت کرنے کے لیئے تیار ہو جائے۔ یہ کام تو صرف مالکِ کائنات کا ہے۔ کہ وہ سب کی حاجتوں اور مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ کہ کس وقت کس کی کس حاجت کو کس مقدار میں پورا کیا جائے۔ اسلیئے انسان کا کام میانہ روی و اعتدال ہے۔ بخل بھی نہ کرے، اسراف و تبذیر سے بھی بچتا رہے۔ یہ ہدایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر پوری امت کو دی گئی ہے۔ کہ انفاق میں بھی توسط و اعتدال ملحوظ رکھ کر صراطِ مستقیم پر قائم رہیں۔
اس کے شانِ نزول میں ابن مردویہؒ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور امام بغویؒ نے بروایت حضرت جابر بن عبداللہ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لڑکا حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری والدہ آپ سے ایک کرتے کا سوال کرتی ہیں۔ اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے سوا کوئی اور کرتا نہیں تھا جو آپ کے بدنِ مبارک پر تھا۔ آپ نے اس لڑکے سے کہا کہ پھر اور کسی وقت آنا جب ہمارے پاس وسعت ہوگی ہم تمہاری والدہ کا سوال پورا کر دیں گے۔ لڑکا گھر گیا اور واپس آکر کہنے لگا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ وہی کرتا عنایت فرما دیں جو آپ کے بدنِ مبارک پر ہے۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرتا اُتار کر اس لڑکے کے حوالہ کر دیا۔ اور آپ ننگے بدن رہ گئے۔ نماز کا وقت آیا حضرت بلالؓ نے اذان دی مگر آپ حسبِ عادت نماز کے لیئے مسجد میں تشریف نہیں لائے، تو لوگوں کو فکر ہوئی۔ بعض لوگ اندر حاضر ہوتے تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برہنہ تن تشریف فرما ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا معیار

اس آیت سے بظاہر اس طرح خرچ کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ جس کے بعد خود پریشان اور فقیر و محتاج ہو جائے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم مسلمانوں کے عام حالات کے اعتبار سے ہے۔ کہ جو خرچ کے بعد تکلیفوں سے پریشان ہو کر خرچ کیئے ہوئے پر پچھتائیں۔ لفظ محسُوراً سے

اسی طرف اشارہ ہے۔ اور جو لوگ اتنے بلند حوصلہ ہوں کہ وہ بعد کی پریشانیوں سے نہ گھبرائیں۔ اور اہلِ حقوق کے حقوق بھی پورے طور پر ادا کرتے رہیں ان کے لیئے یہ پابندی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہ تھی کہ کل کے لیئے بچا کر نہ رکھتے، اور بسا اوقات فاقہ کی نوبت بھی پیش آتی۔ بعض مرتبہ پیٹ پر پتھر بھی باندھنے پڑ جاتے۔ صحابۂ کرامؓ میں بھی حضرت ابو بکرؓ وغیرہ بہت سے حضرات ایسے تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا تھا، آپ نے ان کو منع فرمایا نہ ملامت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مذکورہ ممانعت صرف ان لوگوں کے لیئے ہے جو بعد کی پریشانیوں کو برداشت نہ کر سکیں اور خرچ کیئے ہوئے پر ملال اور حسرت و افسوس ہو۔ کہ یہ صورت ان کے عمل کو فاسد کر دیتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں خرچ کرنے میں بدنظمی کو منع فرمایا گیا ہے۔ کہ آدمی کے پاس جو کچھ ہو فوراً خرچ کر دے۔ نہ آئندہ کے حالات پر نظر ہو، نہ اہلِ حقوق کے حقوق کا خیال ہو، نہ آئندہ آنے والے حاجتمندوں اور حاجتوں کا دھیان ہو۔

مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا کے الفاظ کے متعلق تفسیر مظہری میں ہے کہ مَلُوْمًا کا تعلق پہلی حالت یعنی بخل سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خرچ کرنے سے ہاتھ بالکل روک لے گا تو لوگ ملامت کریں گے۔ اور مَحْسُوْرًا کا تعلق دوسری حالت یعنی تبذیر (فضول خرچی) سے ہے۔ کہ سب خرچ کر کے تھکا ماندہ عاجز اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔ (معارف) واللہ تعالیٰ اعلم

مُحَقَّرَاتُ الذُّنُوْبِ

چھوٹے چھوٹے گناہ

(۴۹۳) عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّكُمْ تَعْمَلُوْنَ اَعْمَالًا هِيَ اَدَقُّ فِيْ اَعْيُنِكُمْ مِنَ الشَّعْرِ اِنْ كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ۔ (بخاری ص ۹۶۱ مشکوٰۃ ص [illegible])

حضرت انسؓ نے فرمایا کہ بیشک تم لوگ بہت سے ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نگاہوں میں بال سے بھی زیادہ باریک (اور حقیر) ہوتے ہیں۔ اور ہم ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہلاک کرنے والی چیزوں میں شمار کرتے تھے۔

(۴۹۴) عَنْ عَائِشَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

يَا عَائِشَةُ إِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ فَإِنَّ لَهَا مِنَ اللهِ طَالِبًا۔

اے عائشہؓ حقیر گناہوں سے (بھی) احتیاط رکھو کیونکہ اللہ کی طرف سے اُنکا مطالبہ کرنیوالا بھی ہے (ابن ماجہ ۳۱۳، مشکوٰۃ ۴۵۸)

(۴۹۵) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ فِيمَا يُرَى النَّاسُ عَمَلَ

بندہ لوگوں کے خیال میں اہل جنت کا عمل کرتا ہے

أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّهُ لَمِنْ أَهْلِ النَّارِ وَيَعْمَلُ فِيمَا يُرَى

حالانکہ وہ دوزخیوں میں سے ہوتا ہے۔ (اسی طرح) بندہ لوگوں کے خیال میں

النَّاسُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّمَا

دوزخیوں کا عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جنتیوں میں سے ہوتا ہے۔ اور بات یہی ہے

الْأَعْمَالُ بِخَوَاتِيمِهَا۔

کہ اعمال کا اعتبار ان کے خاتموں کا ہوتا ہے۔

التاسع (۹) ذی القعدۃ سنۃ ۱۳۹۰ھ ۴ فروری سنۃ ۱۹۷۱ء قبل صلوٰۃ الجمعۃ

تشریح (۴۹۳) ھی ادق من الشعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم بہت سے اعمال بڑے اہتمام سے بنا سنوار کر کرتے ہو۔ اُردو محاورہ کے مطابق گویا تم عمل کرتے میں بال کی کھال نکال لیتے ہو۔ اور ان کو خلافِ حقیقت اچھا سمجھتے ہو۔ حالانکہ ہم ان اعمال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مہلکات میں سے جانتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم بہت سے گناہوں کے کاموں کو معمولی اور بال سے زیادہ حقیر سمجھتے ہو۔ اور ہم ان کو مہلکات میں شمار کرتے تھے۔ اس ثانی مطلب کی تائید حضرت عائشہؓ کی آنے والی روایت سے ہوتی ہے۔

(۴۹۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اماں جان حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی احتیاط ضروری ہے۔ بسا اوقات آدمی چھوٹے گناہوں کو حقیر سمجھ کر توبہ وغیرہ سے ان کا تدارک نہیں کرتا، اور غفلت کی وجہ سے ان کی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ اور بار بار کرنے سے وہ کبیرہ بن جاتے ہیں۔ ولا صغیرۃ مع الاصرار۔ اور گناہ تو بہرحال گستاخی ہے وہ چھوٹا ہو کہ بڑا ہو۔ اور بڑی بارگاہ میں چھوٹی گستاخی بھی بڑی ہوتی ہے۔ تو اللہ کی بارگاہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے چھوٹا گناہ بھی بڑی گستاخی ہے۔ اسی لیے بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ کوئی گناہ صغیرہ نہیں سب گناہ کبیرہ ہی ہیں۔ علاوہ ازیں اللہ کی شان عجیب ہے۔

وہ چاہیں تو چھوٹے گناہوں پر مواخذہ فرمالیں، اور چاہیں تو بڑے گناہوں کو معاف فرمادیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ بہرکیف صغائر بھی وجوہ مذکورہ کی بناپر اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر کون ہے جو بڑے بچھو یا سانپ کو ماردیتا ہو اور چھوٹے کو اس کے چھوٹا ہونے کی بناپر نظرانداز کردیتا اور چھوڑدیتا ہو۔ یا بڑے انگارے بجھاکر چھوٹی چنگاری سامان میں رکھ کربے فکر ہوجاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ جس طرح آدمی بڑے سانپ بچھو سے خطرہ محسوس کرتا ہے اسی طرح وہ چھوٹے کو بھی خطرناک سمجھتا ہے۔ اور جس طرح بڑی آگ غضب ڈھاتی ہے چھوٹی چنگاری بھی بڑھکر اس سے کم خطرناک نہیں ہوتی۔

(۴۹۵) انّ العبد ای عبد مّن عباد اللّٰہ لیعمل عمل اھل النّار ای ظاھرًا اوصورۃً او اوّلًا او فی نظر الخلق وانّہ من اھل الجنّۃ (ای باطنًا ومعنًی او اٰخرًا او فی علم اللّٰہ تعالٰی (والواو حالیۃ وان مکسورۃ) مشکوٰۃ شریف میں بالخواتیم ہے۔ ای بما یختم علیہ امر عملھا۔ مطلب یہ ہے کہ خاتمہ کا اعتبار ہے۔ اگر خاتمہ حسنِ عمل پر ہوگیا تو جنتی ہے — اور خدانخواستہ خاتمہ بُرا ہوگیا تو دوزخی ہے۔ چنانچہ بہت سے کفار وفسّاق اخیر میں اپنے کفر وفسق سے توبہ کرکے مومنِ صالح بن جاتے ہیں۔ اور بہت سے مسلم ومومن کسی وجہ سے سوءِ خاتمہ کا شکار ہوکر دوزخی بن جاتے ہیں۔ حدیث پاک کا منشاء طاعت وحسنِ عمل کی پابندی پر اُبھارنا اور معاصی وسیئات سے تمام اوقات عمر بچنے کی ترغیب دینا ہے۔ کیونکہ اس بات کا اندیشہ تو ہر وقت ہے کہ یہ آخری وقت ہو۔ قال تعالٰی وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ بس آدمی ہر وقت فرمانبردار رہے۔ تاکہ جب بھی مرے تو وہ مسلم وفرمانبردار اور جنتی ہو۔

اسی طرح اس حدیث میں عجب وکبر سے بھی زجر ہے۔ جب خاتمہ کا علم نہیں تو پھر کس چیز پر اکڑا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے لیئے کسی کے دوزخی یا جنتی ہونے کی شہادت دینا جائز نہیں۔ ہاں جن کے دوزخی یا جنتی ہونے کا علم وحی کے ذریعہ ہوگیا وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اور حق تعالےٰ اپنے مُلک وملک میں جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں سب عدل وانصاف ہے۔ کسی کو دم مارنے یا اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ اور قضاء وقدرِ خداوندی کو تسلیم کیئے بغیر نجات نہیں ہوسکتی۔

وھٰذا اٰخر الجزء الثالث من مرآۃ الانوار شرح اردو مشکوٰۃ الاٰثار وبہٖ تمّ الشرح فی ثلٰثۃ اجزاءٍ فالحمد للّٰہ الذی بنعمتہٖ تتمّ الصّالحات بشکرہٖ تزید البرکات والخیرات وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ فخر الموجودات وسیّد الکائنات وعلٰی اٰلہٖ وصحبہٖ اولی الکرامات والکمالات کما یحبّ ویرضٰی ربّنا ربّ الارضین والسمٰوٰت۔

العبد
نسیم احمد الغازی المظاہری البجنوری
۲۴ ذوالحجۃ المکرمۃ سنہ ۱۴۱۰ھ الموافق ۸ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء یوم الاحد بعد صلوٰۃ الظہر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے۔

الاربعون من جوامع الكلم

چالیس جامع ارشادات

(۱) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَأَصْبَحْتُ يَوْمًا قَرِيبًا مِنْهُ وَنَحْنُ نَسِيرُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِي مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَأَلْتَنِي عَنْ عَظِيمٍ وَإِنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَتَصُومُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ ثُمَّ قَالَ أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوَابِ الْخَيْرِ الصَّوْمُ جُنَّةٌ وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ وَصَلٰوةُ الرَّجُلِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ تَلَا تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ حَتّٰى بَلَغَ يَعْمَلُونَ ثُمَّ قَالَ أَلَا أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ كُلِّهِ وَعَمُودِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ وَعَمُودُهُ الصَّلٰوةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ ثُمَّ قَالَ أَلَا أُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ الْأَمْرِ كُلِّهِ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ قَالَ كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُونَ

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا آپ کے ایک سفر میں۔ تو میں ایک دن آپ سے قریب ہوا درانحالیکہ ہم چل رہے تھے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو مجھ کو جنت میں داخل کر دے اور مجھ کو جہنم سے دُور کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھ سے بڑی چیز کا سوال کیا اور وہ آسان بھی ہے جس پر اللہ تعالیٰ آسان فرما دیں۔ تم اللہ کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی شئی کو شریک نہ کرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ اور رمضان کے روزے رکھا کرو۔ اور بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر فرمایا کیا میں بھلائی کے دروازوں پر تمہاری رہنمائی نہ کر دوں؟ روزہ ڈھال ہے، اور صدقہ گناہ کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اور آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا رات کے درمیان پھر آپ نے یہ آیت تتجافیٰ الخ تلاوت فرمائی (یعنی ان کے پہلو بستروں سے جُدا رہتے ہیں۔ اور وہ اپنے رب کو ڈر اور امید سے پکارتے ہیں۔ اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ ایک حصہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر کسی کو معلوم نہیں جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک (انتہائی خوشی کی چیز) چھپائی گئی ہے اُن کے اعمال کے بدلہ میں پھر فرمایا کہ میں تمکو اس سارے معاملہ کا سر اور اس کا ستون اور اسکے کوہان کی بلندی نہ بتا دوں؟ میں نے عرض کیا

بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ قَالَ ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ۔ أَوْ (قَالَ) عَلَى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ (ترمذی مشکوٰۃ)

ضرور بتادیجئے اے رسول خدا! آپ نے فرمایا کہ اس امر (دین) کا سر اسلام ہے۔ اور اس کا ستون نماز ہے۔ اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے۔ پھر فرمایا کیا میں اس سارے معاملہ کی بنیاد (اور دارومدار) نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا ضرور بتادیجئے یا رسول اللہ! تو آپ نے اپنی زبانِ مبارک کو پکڑا اور فرمایا کہ تم اس کو روک لو۔ تو میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی اور کیا ہم اپنی گفتگو میں بھی پکڑے جائیں گے؟ فرمایا تمہاری ماں تم کو روئے اے معاذ! کیا لوگوں کو دوزخ میں انکے چہروں کے بل یا فرمایا ناک کے نتھنوں کے بل ان کی زبان کی کٹی کھیتیوں کے علاوہ اور کوئی چیز ڈالے گی؟

تشریح یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے سفر کا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تصریح ہے۔ اس حدیث میں چند باتیں یاد رکھیئے۔

(۱) عمل دخولِ جنت کا سببِ ظاہری ہے۔ اصل سبب فضل و رحمتِ خداوندی ہے۔ (۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے پانچوں رکن نجات اور جنت میں دخولِ اوّلی کا ذریعہ ہیں۔ (۳) ابواب خیر سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے کرنے سے خیر کے دوسرے کاموں کی توفیق اور ہمت بھی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ صوم، شیطان کے حملوں سے بچنے کی ڈھال ہے۔ صدقہ سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور نمازِ تہجد سے تمام اعمال آسان ہوجاتے ہیں۔ (۴) پھر دین کو حیوان کے ساتھ تشبیہ دیکر فرمایا کہ اسلام یعنی اس کے ارکانِ خمسہ کا مرتبہ دین میں ایسا ہی ہے جیسا کہ حیوان کے بدن میں سر کا مرتبہ ہوتا ہے۔ کمالِ ایمان وحیاتِ ایمان انہی سے وابستہ ہے۔ پھر دینِ اسلام کو عمارت سے تشبیہ دیکر بتایا کہ نماز عمارت دین کا ستون ہے۔ جس طرح ستون پر عمارت قائم رہتی ہے اسی طرح نماز سے اسلام کی عمارت کا قیام ہے۔ نماز کا ستون ہٹ جائے تو یہ عمارت شکستہ و منہدم ہوجاتی ہے۔ لَا سَهْمَ فِي الْإِسْلَامِ لِمَنْ لَا صَلٰوةَ لَهُ۔ پھر اونٹ سے تشبیہ دیکر جہاد کو اس کے کوہان کی بلندی سے تشبیہ دی مطلب یہ ہے کہ اسلام و مسلمین کی سربلندی کا راز جہاد کے عمل میں مضمر ہے۔ بغیر اس عمل کے سربلندی حاصل نہیں ہوسکتی۔ (۵) پھر فرمایا کہ اس معاملہ دین کی جڑ بنیاد اور اصل طاقت نہ بتادوں؟ وہ زبان کی حفاظت میں ہے۔ (۶) "مِلَاكُ" لغت میں اس کے میم کا کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں مگر روایۃً کسرۂ میم ہی ثابت ہے ای بما تقوم بہ هٰذه العبادات (یعنی ان مذکورہ تمام عبادات کا قائم رہنا زبان کی حفاظت پر موقوف ہے۔ (۷) حَصَائِد کٹی ہوئی کھیتیاں جس طرح درانتی کٹائی کے وقت خشک و تر اور گھاس پھوس سب کچھ صاف کردیتی ہے اسی طرح زبان بھی ہر قسم کی اچھی بری باتیں بولتی ہے۔

(۲) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ خَطَبَنَا عُمَرُ بِالْجَابِيَةِ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قُمْتُ فِيكُمْ كَمَقَامِ رَسُولِ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فِينَا فَقَالَ أُوصِيكُمْ بِأَصْحَابِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ يَفْشُوا الْكَذِبُ حَتَّى يَحْلِفَ الرَّجُلُ وَلَا يُسْتَحْلَفُ وَيَشْهَدُ الشَّاهِدُ وَلَا يُسْتَشْهَدُ أَلَا لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا كَانَ ثَالِثَهُمَا الشَّيْطَانُ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ أَبْعَدُ مَنْ أَرَادَ بُحْبُوحَةَ الْجَنَّةِ فَلْيَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَتُهُ وَسَاءَتْهُ سَيِّئَتُهُ فَذَاكُمُ الْمُؤْمِنُ۔

(ترمذی ص۳۹ ج۲ مشکوٰۃ ص۵۵۴)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ہم کو مقام جابیہ میں خطبہ دیا۔ فرمایا: اے لوگو! میں تمہارے درمیان اسی طرح کھڑا ہوا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے تھے، اور فرمایا تھا کہ میں تم کو اپنے صحابہؓ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ پھر ان لوگوں کے بارے میں جو اُن کے بعد ہیں پھر ان کے بارے میں جو اُن کے بعد ہیں۔ پھر جھوٹ پھیل جائے گا یہاں تک کہ آدمی قسم کھائیگا اور اس سے قسم نہ لی جائے گی۔ اور گواہ گواہی دیگا اور اس سے گواہی نہ لی جائے گی۔ یاد رکھو کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت نہ کریگا مگر اُن میں تیسرا شیطان ہوگا۔ تم جماعت کو لازم پکڑو اور تفرقہ سے بچتے رہو۔ اسلئے کہ شیطان اکیلے کیساتھ ہوتا ہے۔ اور وہ دو سے زیادہ دُور ہوتا ہے۔ جو جنت کے وسط کا ارادہ کرتا ہے اس کو جماعت سے چمٹ جانا چاہیئے جس کو اس کی نیکی مسرور کردے اور اس کا گناہ غمگین کردے تو وہ واقعی مؤمن ہے۔

تشریح

مشکوٰۃ شریف کتاب المناقب میں ہے۔ اَكْرِمُوا أَصْحَابِي فَإِنَّهُمْ خِيَارُكُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ الخ (میرے صحابہؓ کا اکرام کرو، پھر اُن کے بعد والوں کا پھر اُن کے بعد والوں کا۔ صحیحین کی روایت میں ہے خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ الخ (میری امت میں سب سے بہتر میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر اُن کے بعد والے، پھر اُن کے بعد والے۔

قرن ایک زمانہ کے لوگوں کو کہتے ہیں۔ اس کو بعض نے مطلق زمانہ مانا ہے۔ کوئی تحدید نہیں کی۔ بعض نے چالیس اور بعض نے سو سال کی مدت بتائی ہے۔ اور سو سال ہی زیادہ مشہور ہیں۔

حدیث پاک میں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباعِ تابعینؒ کی فضیلت و بزرگی بیان کی گئی ہے۔ تینوں زمانوں میں اہل خیر میں صدق و اخلاص اور اعتدال ہوگا۔ بعد میں افراط و تفریط اور کذب و خیانت وغیرہ میں یہ اُمت مبتلا ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا ان تینوں طبقات کے حضرات کا اکرام و احترام کرو، ان کی قدر پہچانو۔ ان اسلاف کا اتباع کرو۔ لزومِ جماعت کے حکم میں

اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ جماعت وہی سوادِ اعظم ہے جو ان قرون ثلٰثہ کی اِتباع اور ان کا صحیح معنی میں اکرام و احترام کرتی ہے۔ اور وہ ائمہ اربعہ کے مقلدین ہیں۔ غیر مقلدین ان حضرات کا نہ اکرام کرتے ہیں اور نہ اِتباع۔ مودودی لوگ ان طبقات پر تنقید بلکہ شیعوں کی طرح تبراء کرتے ہیں۔ مودودی کی کتاب "خلافت و مُلوکیت" اس کی گواہ ہے۔ شیعہ بھی اَسلاف پر تبراء کرتے ہیں بدعتی اور رضاخانی لوگ بھی ان کے اِکرام و اتباع کے مُنکر ہیں۔ اُن کو اپنی خود ساختہ بدعات پسند ہیں۔ یہی دوسرے گمراہ فرق باطلہ کا حال ہے۔ تیسری بات اس میں یہ فرمائی گئی کہ اَجنبی و اَجنبیہ کے درمیان خلوت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ شیطان ایسے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُن کے دامانِ عفّت کو تار تار کر دیتا ہے۔ چوتھی بات، مؤمن کی علامت بتائی گئی ہے کہ نیکی سے جس کو مَسرّت و خوشی حاصل ہو جائے اور گناہ سے وہ رنج و غم اور ملال میں مُبتلا ہو جائے یہ اس کے مؤمن ہونے کی دلیل ہے۔ یاد رکھیے کہ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ کا مطلب یہ ہے کہ جو جماعت سے الگ تنہا ہو گیا اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں الواحد کی بجائے الفذ ہے جس کے معنی جماعت سے یکسو ہو کر تنہا رہ جانے کے ہیں۔ لہٰذا یہ جملہ السَّلامۃ فی الوحدۃ کے خلاف نہیں ہوگا جس سے خلوت و تنہائی مراد ہے کہ خلوت نشیں آدمی خرافات اور فتنوں سے محفوظ رہتا ہے۔

(۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَّاْخُذُ عَنِّیْ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ فَیَعْمَلُ بِهِنَّ اَوْ یُعَلِّمُ مَنْ یَّعْمَلُ بِهِنَّ فَقَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ قُلْتُ اَنَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَخَذَ بِیَدِیْ فَعَدَّ خَمْسًا فَقَالَ اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ وَاَحْسِنْ اِلٰى جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ فَاِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ۔

(ترمذی ص۵۴ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۴۰)

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کون ہے جو مجھ سے یہ کلمات حاصل کرکے ان پر خود عمل کرلے یا ایسے شخص کو سکھلا دے جو ان پر عمل کرلے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: میں ہوں یا رسول اللہ! تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر پانچ نمبر شمار کیے۔ پھر فرمایا کہ تو حرام کاموں سے بچتا رہ، سب سے بڑا عبادت گذار بن جائے گا۔ اور جو اللہ نے تیری قسمت میں لکھدیا ہے اس پر راضی ہوجا سب سے بڑا مالدار بن جائے گا۔ اور اپنے پڑوسی کیساتھ اچھا سلوک کر، مؤمنِ کامل ہو جائے گا۔ اور دوسرے لوگوں کے لیئے وہ پسند کر جو اپنے لیئے پسند کرتا ہے تو سچا پکا مسلمان بن جائے گا۔ اور زیادہ نہ ہنسا کر اسلیئے کہ زیادہ ہنسی دل کو مُردہ بنا دیتی ہے۔

تشریح یہ حدیث پانچ انمول موتیوں پر مشتمل ہے۔ جو دنیوی و اُخروی فلاح وبہبود کے ضامن ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام خمسہ کے بیان کے لیئے کئی اہتمام فرمائے (۱) مَنْ یَّاخُذُ سے مخاطب کے قلب میں طلب پیدا فرمائی۔ (۲) عمل اور تعلیم کی شرط لگائی۔ یاد رکھیئے کہ اَوْ یَعْمَلُ میں لفظ اَوْ بمعنی واو ہے۔ یعنی عمل اور تعلیم دونوں کو جمع کرے۔ بعض کہتے ہیں کہ اَوْ بمعنی بَلْ ہے۔ یعنی عمل کرے بلکہ دوسروں کو بھی سکھائے۔ لیکن اگر تنویع کے لیئے مانا جائے تو ظاہر یہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خود عمل کرے، اور اگر خود کسی وجہ سے نہ کرسکے تو کسی عمل کرنے والے کو سکھائے (۳) حضرت ابوہریرۃؓ کا ہاتھ پکڑا تاکہ طالب کی توجہ تام رہے۔ اور بیعت و معاہدہ کی صورت بھی ہے۔ گویا ان پانچ کلمات پر بیعت خاصہ اور عہد مخصوص ہے۔ (۴) شمار کرکے ان پانچوں باتوں کو سکھایا۔

پہلی بات:۔ اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ۔ محارم میں تمام محرمات و منہیات آگئے۔ ظاہر ہے کہ جب بندہ جملہ محرمات و ممنوعات سے پرہیز کرلیگا تو تمام فرائض و مامورات پر بھی عامل ہوجائیگا کیونکہ ان کا ترک ممنوع و محرم ہے۔ گویا محارم سے بچنے والا پورے دین پر عامل ہوگیا۔ پھر ایسے شخص کے سب سے بڑے عابد ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اگرچہ اس جامع نمبر میں سب کچھ آگیا مگر آگے دین کے چار اہم ترین امور کا بھی ذکر فرمایا گیا تاکہ ان کی اہمیت کا اظہار ہوجائے۔

دوسری بات:۔ اپنی قسمت پر راضی ہوجاؤ سب سے بڑے غنی ہوجاؤگے۔ غناؤ مالداری سے مقصود راحت و عزت ہے۔ اور دولتِ قناعت میں دونوں بیک وقت موجود ہیں۔ بلکہ قناعت ظاہری و باطنی دونوں قسم کے غنار کو حاوی ہے۔

تیسری بات:۔ پڑوسی بھلائی کرے یا برائی بہردو صورت اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو مؤمن کامل بن جاؤگے۔ اول تو یہ اعلیٰ اخلاق کی علامت ہے کہ جن کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے اُن سے اچھا برتاؤ کرتا ہے۔ اور بقدرِ اخلاق مؤمن کو ایمانی اور اُخروی بلندیاں ملتی ہیں۔ گویا یہ صفت مؤمن کا مل ہونے کی دلیل ہے۔ یا احسان الی الجارُ اللہ کے نزدیک ایسا محبوب عمل ہے کہ اس عمل پر حق تعالیٰ کی طرف سے کمالِ ایمان عطاء ہوتا ہے۔

چوتھی بات:۔ یہ ہے کہ قلب میں سارے انسانوں کی ہمدردی و خیرخواہی پیدا ہوجائے۔ یہ اللہ سے کمالِ محبت کی دلیل ہے۔ کہ اس کے کنبہ کے تمام افراد سے محبت کرتا ہے۔ اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ۔ اور کمالِ اطاعت کمالِ محبت ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ اور اسلام کمالِ اطاعت ہی کو کہتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ یہ صفت کامل مسلمان ہی میں ہوسکتی ہے۔ اور مسلم کامل ہی کو یہ صفت عطاء ہوتی ہے۔

پانچویں بات:۔ یہ پرہیز کا نمبر ہے۔ زیادہ ہنسنا انسان کے لیئے مضر ہے۔ اس سے بہت

سے نقصانات ہیں۔ چہرہ کا نور اور اس کی رونق جاتی رہتی ہے۔ رُعب و ہیبت ختم ہوجاتی ہے۔ زیادہ ہنسنے والے کی عزت ووقعت قلوب سے دُور ہوجاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات وہ ہے جو اس حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ کثرت ضحک دل کو مردہ کردیتی ہے اگر وہ زندہ تھا۔ اور اگر پہلے ہی مردہ تھا تو اس کی سیاہی اور مُردار پن کو اور زیادہ بڑھادیتی ہے۔ اور مُردہ قلب پر شیاطین کا اسی طرح تسلط ہوجاتا ہے جس طرح مُردہ جانور پر گِدھوں، کتّوں اور کوّوں کا تسلط ہوجاتا ہے پھر ایسے شخص سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی۔

(۴) عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنِ الْأَوْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهُ اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ۔

(مشکوٰۃ شریف ص۴۴۱)

حضرت عمرو بن میمون اودیؒ سے روایت ہے فرمایا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے درانحالیکہ آپ اس کو نصیحت فرمارہے تھے کہ پانچ حالات کو پانچ عوارض سے پہلے غنیمت جانو، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، اپنی تندرستی کو اپنی بیماری سے پہلے، اپنی مالداری کو تنگدستی سے پہلے، اپنی فرصت کو اپنی مشغولی سے پہلے۔ اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔

تشریح (۱) عمرو بن میمون اودیؒ (منسوب الی اَوْد بن صعب اَوْد بسکونِ الواو) نے زمانۂ جاہلیت واسلام دونوں پائے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود میں مسلمان ہوگئے تھے۔ مگر ملاقات کا شرف نہ حاصل ہوسکا اس لئے آپ کبارِ تابعینؒ میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث مُرسل ہے۔ امام حاکمؒ وامام بیہقیؒ وامام احمدؒ وغیرہ نے اس کو ابن عباسؓ سے مرفوعًا بھی روایت کیا ہے۔ (مرقاۃ ج۵ ص۲)

(۲) اغتنام بمعنی اخذ الغنیمۃ ہے۔ غنیمت مُفت کا مال ہوتا ہے۔ تو انسان کو جوانی، تندرستی، غنا، فراغت اور زندگی کی دولتیں بھی حق تعالیٰ شانہ، کی بارگاہ سے مُفت ملی ہیں مطلب حدیث کا ظاہر ہے۔ کہ ان پانچوں دولتوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ ان میں سے جو دولت چھن جاتی ہے کسی قیمت پر دوبارہ نصیب نہیں ہوسکتی۔ (۳) بعض شراح نے غناء کے معنی مطلق قدرت کے لئے ہیں۔ کہ ہر نوع کی طاعات وعبادات پر قدرت کو غنیمت جان لو۔ فوتِ قدرت سے پہلے۔

(۵) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ سَبْعًا هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا اِلٰى فَقْرٍ مُنْسٍ اَوْ غِنًى مُطْغٍ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات چیزوں سے پہلے پہلے اعمال جلدی کرلو۔ کیا تم انہی چیزوں کا انتظار کررہے ہو

أَوْ مَرَضٍ مُفْسِدٍ أَوْ هَرَمٍ مُفَنِّدٍ أَوْ مَوْتٍ مُجْهِزٍ أَوِ الدَّجَّالِ فَشَرٌّ غَائِبٌ يُنْتَظَرُ أَوِ السَّاعَةِ فَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ۔

(ترمذی ص ۲۵ ج ۲ مشکوۃ ص ۴۴۲)

یعنی مدہوش کردینے والی تنگدستی کا یا سرکش بنا دینے والی مالداری کا یا خراب کردینے والے مرض کا یا سٹھیا دینے والے بڑھاپے کا یا جلد آجانے والی موت کا یا دجال کا کہ وہ چھپی ہوئی شر ہے جس کا انتظار کیا جارہا ہے یا قیامت کا تو قیامت تو بڑی سخت اور بڑی تلخ (مصیبت) ہے۔

تشریح حدیث پاک میں فرصت حیات کو غنیمت سمجھنے اور اس سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے زندگی میں بھی ایسے حالات آتے ہیں کہ آدمی کچھ کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ مثلاً تنگدستی ومفلسی میں نہ مالی عبادت کی قدرت رہتی ہے نہ جانی عبادت سکون سے کرسکتا ہے ؎

شب چو عقد نماز بربندم ✿ چہ خورد بامداد فرزندم

اسی طرح مالداری میں جان کو بکھیڑے بہت لگ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں دولت سے سرکشی بھی عموماً پیدا ہوہی جاتی ہے۔ اور بیماری میں تو معذوری ظاہر ہے۔ اسی طرح بڑھاپے میں جب ہوش وحواس بھی طاقتوں کے ساتھ رخصت ہوجاتے ہیں۔ تو انسان بالکل نکما ہوجاتا ہے۔ اور اچانک موت کا آجانا تو عمل کی فرصت کو بھی ختم کردیتا ہے۔ اور توبہ ووصیت کا موقع بھی نہیں دیتا۔ اور فتنۂ دجال تو اتنا بڑا فتنہ ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود ہوں گے عمل تو ان سے کیا ہوگا اس فتنہ سے بچنا ہی ایک اہم کام ہوگا۔ اور قیامت کا دھماکا تو اتنا عظیم ہے کہ سب سے بڑی اور تلخ مصیبت ہے۔ وہ وقت اعمال کا نہیں، بلکہ حساب کا ہوگا۔ بہرحال ان مشاغل وحوادث سے پہلے کا وقت اعمال کے لئے بسا غنیمت ہے۔ وفقنا اللہ وایاکم۔

(۶) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ هٰذَا الْخَيْرَ خَزَائِنُ وَلِتِلْكَ الْخَزَائِنِ مَفَاتِيْحُ فَطُوْبٰى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللهُ مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ وَوَيْلٌ لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللهُ مِفْتَاحًا لِلشَّرِّ مِغْلَاقًا لِلْخَيْرِ۔

(ابن ماجہ ص ۲۱ مشکوۃ ص ۴۴۴)

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس خیر کے بہت سے خزانے ہیں۔ اور ان خزانوں کی بہت سی کنجیاں ہیں۔ پس شادمانی ہے ایسے بندہ کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ خیر کی کنجی اور شر کا تالا بنادیں۔ اور ہلاکت ہے اس بندہ کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے شر کے لئے کنجی اور خیر کے لئے تالا بنادیا۔

تشریح انسان دو قسم کے ہیں۔ (۱) خیر کو پھیلانے والے شر کو مٹانے والے۔ (۲) شر کو پھیلانیوالے خیر کو مٹانے والے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خیر اور شر کے خزانے یعنی ان کی بہت سی انواع واقسام ہیں۔ یہاں صرف خیر کے ذکر پر اکتفار کرلیا گیا، مراد شر بھی ہے۔ جیسا کہ بعد والے تفصیلی جملوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ بِيَدِكَ الْخَيْرُ مع ان الامر کلہ للہ۔ وکمافی الحدیث الخیر کلہ بیدیك والشر لیس الیك۔ بہرحال خیر وشر دونوں کے خزانے ہیں۔ اور بندوں کو گویا ان کی کنجیاں دیدی گئیں۔ وہ اپنے اختیار سے جس خزانے کو چاہیں کھولیں۔ اور دوسروں تک پہونچائیں۔ جعلہ اللہ سے معلوم ہوا کہ اخلاق وافعال بھی اللہ نے پیدا فرماکر بندوں کے درمیان تقسیم فرمائے ہیں۔ اور سعادت وشقاوت کا فیصلہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ جیساکہ دوسری نصوص میں اس کی صراحت ہے۔ مثلاً طبرانی نے اوسط میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً نقل فرمایا ہے ان ھٰذہ الاخلاق من اللہ فمن اراد اللہ تعالیٰ بہ خیراً منحہ خلقاً حسناً ومن اراد بہ سوءً امنحہ سیئاً۔ (مرقاۃ ص۲۳ ج۵)

ہماری کتاب "حدیث جبریل" میں مسئلہ تقدیر کی خوب وضاحت ہے۔ طالبین اس کا مطالعہ کریں۔ لان بحر القضاء والقدر عریض عمیق لایغوص فیہ الا من لہ تحقیق بتوفیق یتحیر فیہ ارباب السواحل ویبعدون منہ بمراحل ویمضی منہ اصحاب السفن الکوامل۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ خیر وہ ہے جس میں سب لوگ رغبت کریں۔ جیسے عقل، عدل، فضل اور ہر نافع چیز اور شر اس کی ضد ہے۔ جیسے حماقت، ظلم اور ہر مضر چیز۔ اور کبھی خیر وشر دونوں ایک ہوجاتی ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک شئی ایک کے لئے خیر ہے دوسرے کے لئے شر۔ مثلاً مال حرام زید کے لئے خیر ہے۔ کیونکہ دنیادار ہے۔ اور عمرو کے لئے شر ہے کہ وہ دیندار ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اِنْ تَرَكَ خَيْرًا میں مال کو خیر سے تعبیر فرمایا۔ اور اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ہ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ میں مال کے شر ہونے کا اظہار ہے۔ اسی طرح علم بعض کے لئے نقصان وخسران کا سبب ہے۔ بعض کے لئے فوز وفلاح کا۔ عبادت بعض کے لئے عجب وغرور کا بعض کے لئے نور وسرور کا سبب ہے۔ اور جنگی سروسامان بعض کے لئے جنت کا اور بعض کے لئے جہنم کا سبب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۷) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنْ اَجْمَعَ الْمَالَ وَاَكُوْنَ مِنَ التَّاجِرِيْنَ۔ وَلٰكِنْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ

حضرت جبیر بن نفیرؓ سے مرسلاً روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم نہیں ہوا کہ میں مال جمع کروں اور تاجروں میں شامل ہوجاؤں۔ لیکن میرے پاس یہ حکم آیا ہے کہ اپنے

وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ (مشکوٰۃ ص۱۷۶)

رب کی پاکی وحمد وثنا بیان کیا کرو۔ اور نمازیوں میں شامل رہو۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت تا دمِ واپسیں کرتے رہو۔

تشریح وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ سے مراد كُنْ مِّنَ الْمُصَلِّيْنَ ہے۔ یعنی جزءِ اہم (سجدہ) بول کر کل (نماز) مراد ہے۔ اور سجدہ کے جزءِ اہم ہونے پر دلیل مسلم شریف کی حدیث ہے کہ اقرب مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ۔

دوسری بات یہ یاد رکھئے کہ یہاں لفظ الیقین سے باجماعِ مفسّرین موت مراد ہے۔ اور ولکن اوحی الی ان سبّح الخ سورۃ حجر کی آخری دو آیتوں کا اقتباس ہے۔

(۸) عَنْ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ يَوْمًا فَقَالَ فِيْ خُطْبَتِهٖ اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَاْكُلُ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ اَلَا وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ اَجَلٌ صَادِقٌ وَيَقْضِيْ فِيْهَا مَلِكٌ قَادِرٌ اَلَا وَاِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ وَاِنَّ الشَّرَّ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي النَّارِ اَلَا فَاعْمَلُوْا وَاَنْتُمْ مِّنَ اللّٰهِ عَلٰى حَذَرٍ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مَعْرُوْضُوْنَ عَلٰى اَعْمَالِكُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (وَقَالَ شَدَّادٌ فِيْمَا رَوٰى عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) كُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَةِ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلَّ اُمٍّ يَّتْبَعُهَا وَلَدُهَا۔

(مشکوٰۃ شریف ص۴۴۵)

حضرت عمروؓ سے روایت ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا تو اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ۔ یقیناً دنیا ایسا وقتی اور عارضی سروسامان ہے جس سے نیک و بد سب کھاتے (اور فائدہ اٹھاتے) ہیں، یاد رکھو کہ یقیناً آخرت ایک سچی مدّتِ مقررہ ہے۔ اور ایک قدرت والا بادشاہ فیصلہ کرے گا۔ یہ بات یاد رکھو کہ بھلائی تمام کی تمام جنت میں اور برائی سب کی سب دوزخ میں ہے۔ خبردار تم ایسی حالت میں عمل کرو کہ اللہ سے ڈر رہے ہو۔ اور اس کا یقین رکھو کہ تم اپنے اعمال پر پیش کیے جاؤ گے۔ پھر جو ذرہ بھر بھلائی کریگا اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو ذرہ بھر برائی کریگا اس کو بھی دیکھ لیگا۔ (اور حضرت شدادؓ نے اس حدیث میں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی فرمایا ہے کہ) تم آخرت کے بیٹوں میں سے ہو جاؤ اور دنیا کے بیٹوں میں سے نہ بنو۔ پھر اس میں شک نہیں کہ ہر ماں کے پیچھے اس کی اولاد جاتی ہے۔

تشریح عَرَضٌ بفتح العین والراء مالِ حادث اور حالِ عارض کو کہتے ہیں۔ اَلْبَرُّ سے مراد مؤمن اور الفاجر سے مراد کافر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا چند روزہ و ناپائیدار

دولت ہے۔ اور اس عام دستر خوان سے نیک و بد اور مومن و کافر سب ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؎

کہ روئے زمیں سفرۂ عامِ اوست ❋ بریں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

اور آخرت ایک وقت مقرر و موعود ہے۔ جس کے آنے میں شبہ نہیں ہے۔ (صادق بمعنی واجب محقق ہے) اور آخرت میں دو ہی مقام ہیں۔ اہلِ سعادت کا جنت جہاں ہر نعمت و راحت موجود ہے۔ اور اہلِ شقاوت کے لیے دوزخ جہاں ہر مصیبت و آفت موجود ہے۔ اور وہاں کی راحت و مصیبت ہر اک غیر فانی ہے۔ (حَذَافِيْرُ حَذْفِيْرٌ اور حَذْفُوْرٌ بمعنی جانب کی جمع ہے۔ حذافیر بمعنی بجوانب) لہٰذا تم اللہ سے ڈرتے ہوئے عمل کرو یعنی شر سے بچکر خیر کا عمل کرو، اور عدمِ قبولیت و ناپسندیدگی کا بھی اندیشہ رکھو تاکہ عُجب و غرور سے حبطِ عمل نہ ہو جائے۔

اِنَّكُمْ مُعْرَضُوْنَ عَلٰى اَعْمَالِكُمْ باب قلب سے ہے۔ جیسے عرضت الناقۃ علی الحوض مطلب یہ ہے کہ تم پر تمہارے اعمال پیش ہوں گے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ معرضون بمعنی مُقَابَلُوْنَ ہے۔ یعنی تم اپنے اعمال کے مقابل ہوگے۔ اور تم کو تمہارے اعمال کے مطابق بدلے ملیں گے ومنہ قولہ تعالیٰ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ۔ یا تقدیر یہ ہے اَنْتُمْ مُعْرَضُوْنَ عَلٰى مُجَازُوْنَ عَلٰى اَعْمَالِكُمْ اِنْ خَيْرًا فَخَيْرٌ وَاِنْ شَرًّا فَشَرٌّ۔ لہٰذا جو ایک ذرہ برابر اچھا عمل کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا اور اس کی جزا پالے گا۔ اور اگر ذرہ برابر برا عمل کرے گا تو اس کو بھی دیکھ لے گا اور اس کی سزا پالے گا۔ قال تعالیٰ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ الخ

حضرت شدادؓ کی پوری روایت اس طرح ہے کہ:

قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَاْكُلُ مِنْهَا الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ وَعْدٌ صَادِقٌ يَحْكُمُ فِيْهَا مَلِكٌ عَادِلٌ قَادِرٌ يُحِقُّ فِيْهَا الْحَقَّ وَيُبْطِلُ الْبَاطِلَ كُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَةِ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلَّ اُمٍّ يَتْبَعُهَا وَلَدُهَا۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۴۴۵)

حضرت شدادؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اے لوگو! بیشک دنیا عارضی اور وقتی دولت ہے جس سے ہر نیک و بد کھاتا (اور نفع اٹھاتا) ہے۔ اور آخرت سچا وعدہ ہے اس میں انصاف کرنے والا صاحبِ قدرت بادشاہ فیصلہ کرے گا جس میں وہ حق کا حق اور باطل کا باطل کر دکھائیگا (یعنی حق و باطل میں امتیاز کر دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ حق و اہلِ باطل کو جدا جدا کر دے گا) (فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ) تم آخرت کے بیٹے بنو۔ اور دنیا کے بیٹے نہ بنو۔ پھر ہر ماں کے پیچھے اس کی اولاد جاتی ہے۔

یعنی انسان کی اُفتادِ طبع یہی ہے۔ لہٰذا جو آخرت کا بیٹا بن گیا وہ آخرت کی طرف متوجہ رہے گا اور جو دنیا کا بیٹا بن گیا وہ دنیا کے پیچھے جائے گا۔ فالدنیا باطلۃ مقرھا النار وبئس القرار والاٰخرۃ حقۃ فنعم الدار۔

(۹) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّؓ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِظْنِیْ وَاَوْجِزْ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلٰوتِکَ فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ وَلَا تَکَلَّمْ بِکَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْہُ غَدًا وَاَجْمِعِ الْاِیَاسَ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ۔

(ابن ماجۃ ص۳۱۷ مشکوٰۃ ص۴۴۵)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے مروی ہے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھ کو نصیحت فرمایئے اور مختصر فرمایئے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز میں کھڑے ہوا کرو تو رخصت کرنے والے کی نماز پڑھا کرو۔ اور ایسی بات نہ کہو جس کی کل معذرت چاہنی پڑے۔ اور تم اس سے مایوسی کا پختہ عزم کر لو جو لوگوں کے پاس ہے۔

تشریح

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مختصر نصیحت کی درخواست کی۔ اختصار اس لئے مطلوب تھا کہ خوب یاد ہو جائے اور اس پر بسہولت عمل ہو جائے۔ تو آپ نے اس کو مختصر نصیحت میں تین مختصر مگر جامع احکام عطا فرمائے۔

(۱) رخصت کرنے والے کی سی نماز پڑھا کرو۔ یعنی ایسے استغراق و انہماک سے نماز ادا کرو کہ ماسوی اللہ کو تکبیر تحریمہ کے وقت رخصت کر دو، اور مکمل توجہ اپنے مولائے حقیقی کی جانب کر لو۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایسی نماز پڑھو کہ تم گویا نماز کو رخصت کر رہے ہو۔ یعنی آخری نماز ادا کر رہے ہو۔ کسی عزیز قریب کو رخصت کرتے ہوئے آدمی کا کیا حال ہوتا ہے۔ دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ اور اس کی آمد کا انتظار رہتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایسی نماز پڑھو کہ یہ آخری نماز ہے۔ اور اگر آدمی کو معلوم ہو جائے کہ یہ میری آخری نماز ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کو کس قدر جی لگا کر پڑھے گا۔ اس صورت میں اس ایک ہی جملہ سے دو حکم ثابت ہوئے۔ (۱) حَسِّنْ خَاتِمَۃَ عَمَلِکَ (اپنا آخری عمل عمدہ بناؤ) (۲) قَصِّرْ اَمَلَکَ لِاِحْتِمَالِ قُرْبِ اَجَلِکَ (اپنی امید کو کوتاہ کر لو کیونکہ تمہاری موت کے قرب کا احتمال ہے۔

(۲) دوسری نصیحت یہ ہے کہ گفتگو میں احتیاط ضروری ہے۔ ایسی بات نہ کہو کہ کل قیامت کے دن معذرت کرنے اور معافی مانگنے کی ضرورت پیش آئے۔ ولذا قال علیہ السلام مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ۔

(۳) تیسری نصیحت کا حاصل یہ ہے کہ طمع اور لالچ ختم کر کے قناعت اختیار کر لو۔ جو اپنی قسمت میں ہے اس پہ راضی رہو۔ اور دوسروں کے مال پر رال نہ ٹپکاؤ۔ بلکہ دوسروں کے اعمال پر بھی نہ ریکھو کہ ہم

فلاں بزرگ کے یا دوست کے یا باپ دادوں کے عمل کی وجہ سے نجات اور جنت کے درجات پاجائیں گے۔ خود عمل کرو۔ اور اپنے رب پر بھروسہ رکھو۔ مخلوق سے طمع نہ رکھو۔ ؎

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است ✤ رفتن بہ پائمردیِ ہمسایہ در بہشت

(خدا کی قسم جہنم کے عذاب کی برابر ہے ـــــــ ہمسایہ کے طفیل میں جنت میں جانا)

(۱۰) كَتَبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى عَائِشَةَ أَنِ اكْتُبِي إِلَيَّ كِتَابًا تُوصِينِي فِيهِ وَلَا تُكْثِرِي فَكَتَبَتْ سَلَامٌ عَلَيْكَ أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللَّهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللَّهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللَّهِ وَكَلَهُ اللَّهُ إِلَى النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ۔

(ترمذی ص۶۷ ج۲ مشکوٰۃ ص۴۳۵)

حضرتِ معاویہؓ نے حضرتِ عائشہؓ کے پاس تحریر فرمایا کہ آپ مجھ کو ایک والا نامہ تحریر فرمایئے جس میں آپ مجھ کو نصیحت فرمائیں اور بہت نہیں (مختصر) تو اماں جان نے لکھا تم پر سلام ہو اسکے بعد (واضح ہو کر) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کی رضا طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے دباؤ سے بچالیتے ہیں۔ اور جو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کی خوشنودی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے حوالہ فرمادیتے ہیں۔ والسّلام علیک۔

تشریح حضرتِ امیر معاویہؓ نے اماں جان حضرتِ عائشہ صدیقہؓ سے ایک مختصر وجامع نصیحت کی تحریری درخواست کی، اور تحریری جواب طلب کیا۔ اماں جان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع ترین نصیحت لکھ بھیجی جس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کا کام اللہ کو راضی رکھنا ہے۔ اگر کوئی موقعہ ایسا پیش آجائے کہ اللہ کو راضی کریں تو لوگ ناراض ہوجائیں، اور لوگوں کو راضی کریں تو اللہ کی ناراضگی کا اندیشہ ہے۔ تو ایسے موقع پر مخلوق کی ناراضگی کی پرواہ نہ کی جائے اللہ کو راضی رکھا جائے۔ اب رہا لوگوں کے شر کا اندیشہ تو حق تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔ وہ لوگوں کے ظلم و زیادتی اور شر سے اپنے بندہ کی حفاظت فرمائیں گے۔ لیکن اگر کوئی اللہ کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر مخلوق کو راضی کرنا چاہتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو مخلوق ہی کے حوالہ کردیتے ہیں۔ یعنی انسانوں کو اس پر مسلط کردیتے ہیں جو اس کو تکلیف پہنچائیں اور اس پر ظلم وزیادتی کیا کریں۔ اور حق تعالیٰ پر ان کے شر کو دفع کرنے کی کوئی ذمّہ داری اور وعدہ نہیں۔ اس والا نامہ کا شروع سلام سے اور ختم بھی سلام پر ہے۔ اوّل سلام تو سلامِ ملاقات کے درجہ میں ہے۔ اور ثانی سلام، سلامِ رخصت کے درجہ میں ہے۔ یا مطلب یہ ہے والسّلام علیك اوّلاً وآخرًا او فی الدنیا والعقبیٰ

وفی تکرار السلام اشارۃ خفیۃ الی تاکید طلب السلامۃ وترک مایؤدی الی الملامۃ۔

واللہ اعلم۔

(۱۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ خَشْیَۃِ اللّٰہِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ وَکَلِمَۃِ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا وَالْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنٰی وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَ اُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ وَاَنْ یَکُوْنَ صَمْتِیْ فِکْرًا وَنُطْقِیْ ذِکْرًا وَ نَظْرِیْ عِبْرَۃً وَاٰمُرُ بِالْعُرْفِ وَقِیْلَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (مشکوٰۃ ص۴۵۸)

حضرت ابوہریرۃؓ نے فرمایا، ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھ کو میرے رب نے نوؔ باتوں کا حکم دیا ہے۔ (۱) باطن وظاہر (یا خلوت وجلوت) میں اللہ سے ڈرنے کا (۲) ناراضگی وخوشی میں انصاف کی بات کہنے کا (۳) تنگدستی وفراخدستی میں میانہ روی کا (۴) اور اس بات کا کہ جو مجھ سے توڑے میں اس سے جوڑوں (۵) اور جو مجھ کو محروم کرے میں اس کو عطا کروں (۶) اور میں اس کو معاف کردوں جو مجھ پر زیادتی کرے (۷) اور اس بات کا کہ میری خاموشی فکر ہو (۸) اور میرا بولنا ذکر ہو (۹) اور میری نظر عبرت ہو (۱۰) اور میں بھلائی کا حکم کیا کروں۔

تشریح اس حدیث کے اندر اجمال میں نوؔ کا ذکر ہے مگر تفصیل میں دسؔ امور مذکور ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نوؔ امور کی تفصیل بیان فرماکر دسویں نمبر پر امر بالمعروف ایک ایسی چیز بیان فرمادی جو امورِ مذکورہ تسعہ کو جامع اور حاوی ہے۔ کیونکہ معروف ایسا اسم ہے جو اطاعتِ خداوندی، تقرب الی اللہ، احسان الی النّاس اور ہر اُس چیز کو شامل ہے جو شریعت میں مندوب ومعروف ہو۔ بلکہ جن ذمائم ورذائل اور قبائح سے شرع نے منع فرمایا ہے ان کا محرم وممنوع ہونا اور ان سے منع کرنا بھی معروف شرعی میں داخل ہے۔ گویا اس ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہوا کہ میرے رب نے مجھ کو ان نوؔ خصال کے ساتھ متصف ہونے کا اور ان صفات کا دوسروں کو انصاف کے ساتھ حکم دینے کا حکم فرمایا ہے۔ علامہ طیبیؒ کے قول کے مطابق تمام واؤوں کا عطف عطفُ المفرد علی المفرد کے قبیل سے ہوگا۔ اور وَاٰمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ کا عطف عطف المجموع من حیث المعنی علی المجموع بحسب اللفظ پر ہوگا۔

لیکن بندۂ ناتواں کی رائے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ تو کسی عام آدمی کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ ان نوؔ صفات کو اپنانے اور اختیار کرنے کے مکلّف صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آپ نے صرف برسبیل تذکرہ ان اُمور کا ذکر فرمادیا ہے۔ آپ نے وَاٰمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ سے اس وہم واشکال کو دُور فرمادیا کہ ان اُمورِ تسعہ میں سے

ہر ایک امر معروفِ شرعی ہے۔ جس کا مکلف ہر امتی ہے۔ اور یہ تذکرہ برائے تذکرہ نہیں۔ بلکہ مجھ کو یہ حکم ہے۔ کہ معروفِ شرعی کا دوسروں کو حکم کروں۔ اسلیئے یہ ذکر نہیں بلکہ امر اور تبلیغ کے فریضہ کی ادائگی ہے۔ اور اس کو باندازِ عطف بیان فرماکر مزید فائدہ یہ ہوا کہ دسویں ایک اہم چیز بھی آگئی۔ اور اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جیسے امت امر بالمعروف کی مکلف ہے۔ اور اس میں میری پیروی امت پر لازم ہے اسی طرح امورِ تسعہ مذکورہ میں بھی میری پیروی امت پر لازم ہوگی۔ کیونکہ اکثر جو حکم امام کو دیا جاتا ہے وہ سب خواص و عوام کو بھی ہوتا ہے۔ فافہم۔

یہ لفظ وَآمُرُ بِالعُرفِ اور اٰمر بالمعروفِ دونوں طرح منقول ہے۔ اور مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھیئے کہ خشیۃُ اللّٰہ اور اس کے معطوفات کو مرفوع پڑھیں گے تو مبتدا احدھا، ثانیھا، ثالثھا الخ محذوف مان کر ان میں سے ہر ایک کو اس کی خبر بنائیں گے اور اگر مجرور پڑھیں تو تمام معطوفات کو لفظ تِسْعٍ سے بدل بنائیں گے۔ اور منصوب پڑھیں تو اعنی فعل محذوف کا مفعول بہ بنائیں گے۔

یہ بھی یاد رکھیئے کہ (۱) خشیت خوف مع العظمۃ والمحبۃ کو کہتے ہیں۔ سر و علانیہ سے مراد قلب و قالب ہے (یعنی خشوع و خضوع) یا خلوت و جلوت (یعنی ہر حال میں خوفِ خدا رہے)۔ (۲) ناراضنگی و غضب میں یا خوشی میں حدود سے نہ نکلا جائے۔ بلکہ عدل و اعتدال پر قائم رہیں۔ اور انصاف کی بات کہیں۔ (۳) تنگدستی اور فراخی دونوں حالات میں اعتدال کو قائم رکھا جائے۔ تنگدستی میں مایوس ہو بیٹھنا جزع ہے۔ اور فراخی میں آپے سے باہر ہوجانا سرکشی۔ اور حالتِ اعتدال تنگدستی میں صبر اور فراخی میں شکر ہے۔ (۴) قطع رحمی اور تعلقات توڑنے کے باوجود صلہ رحمی اور تعلقات مامور بہا کو قائم رکھنا نہایت حلم اور نہایت تواضع ہے۔ جو عند اللّٰہ بہت محبوب و محمود ہے۔ (۵) محروم کرنے والے کو بھی نوازنا کمالِ کرم وجود اور مومن کامل و متبع سنت کا نشان ہے۔ (۶) انتقام پر قدرت کے باوجود معاف کر دینا انتہائی صبر اور کمالِ شکر نیز خلقِ خدا پر رحمت و احسان کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ (۷) حالتِ سکوت میں اللّٰہ تعالیٰ کے اسماء و صفات، آیاتِ نفس و آفاق اور حق تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر معرفتِ خداوندی کا عظیم باب ہے۔ اسی طرح حال و مآل اور ماضی کے احوال کے فکر سے زبردست عبرت حاصل ہوتی ہے۔ قرآنِ مقدس کی ہزارہا آیات میں ان کی تفاصیل مذکور ہیں۔ اور بہت سی آیات میں فکر کا حکم بھی ہے۔ (۸) یہ مرآۃ میں اور اس اربعین کی پہلی حدیث میں معلوم ہوچکا کہ زبان کی خطرناکیاں اور فتنہ سامانیاں بے شمار ہیں۔ اس لیئے زبان کو اس کے مقصود میں استعمال کرنا ضروری ہوا یعنی ذکرِ خداوندی جس میں تسبیح و تحمید، تقدیس و تمجید، تکبیر و تہلیل، تلاوت و دعوت

وغیرہ جملہ وہ امور آجاتے ہیں جن کا تعلق زبان سے ہے۔ اور شرعاً و عرفاً وہ محمود ہیں۔ (۹۱) جو نظر اٹھے وہ نصیحت و معرفت کا سبق لیکر واپس ہو۔ آیات آفاق و انفس اور آسمان و زمین سے جس چیز پر نظر پڑے وہ عبث نہو، خلاف شرع نہو۔ آخری چیز امر بالمعروف کا حکم ہے۔ یہاں نہی عن المنکر کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ کیونکہ اول تو برائی سے نہی خود معروف کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں العرف یشمل المعروف فی الشرع ارتکابا و اجتنابا۔ دوسرے متقابلین یا قرینین میں سے ایک کے ذکر پر اکتفاء کرلیتے ہیں کہ دوسرا خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ واللہ اعلم

(۱۲) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ اَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَاَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْمَا فِيْ اَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ۔

(ابن ماجۃ فی باب الزھد فی الدنیا۔ مشکوٰۃ ص۴۴۲)

حضرت سہل بن سعدؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا اے رسول خدا مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ جب میں اس کو کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت فرمائیں اور لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ فرمایا دنیا سے بے رغبتی (زہد) اختیار کرو تم سے اللہ تعالیٰ محبت فرمائیں گے۔ اور لوگوں کے ہاتھوں میں جو کچھ (مال و دولت) ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ تو انسان تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

تشریح زھد فی الدنیا کا مطلب یہ ہے کہ اس سے ضرورت سے زائد محبت ترک کردی جائے۔ اور زوائد دنیا کو ترک کرکے ضروریات پر اکتفاء کیا جائے۔ اور آخرت کو بنانے کی فکر کے ساتھ وہ اعمال اختیار کیئے جائیں جس سے جنت و رضائے خداوندی حاصل ہو۔ اور اللہ کی نظر میں جو حقیر و ناپسندیدہ چیز ہے، اور اللہ سے غافل بنا دینے والی ہے جب اس کو ترک کردے گا تو حق تعالیٰ کا محبوب بن جائے گا ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یہاں ازھد فیما فی ایدی الناس اور مشکوٰۃ شریف میں ازھد فیما عند الناس ہے۔ حاصل دونوں کا یہ ہے کہ حب مال و حب جاہ سے بچ جاؤ لوگوں کے محبوب بن جاؤ گے۔ کیونکہ مال و جاہ انسانوں کی محبوب چیزیں ہیں۔ جو ان کا طالب ہو گا وہ ان کا رقیب و مزاحم اور عدو ہو گا۔ اور جو ان کو چھوڑ دے گا اور وہ لوگوں سے ان کے مطلوب میں مزاحمت ترک کردے گا تو وہ ان کا محبوب بن جائے گا۔ والشد بعضہم ؎

وما الزهد الا فی انقطاع العلائق ٭ وما الحق الا فی وجود الحقائق

وما الحبّ الاحبّ من کان قلبهٗ ٭ عن الخلق مشغولاً بربّ الخلائق

بعض صوفیہ کا قول ہے کہ حصولِ دنیا پر قدرت ہوتے کے باوجود خود کو اس سے الگ رکھنا خواہ حصولِ آخرت کی وجہ سے یا دوزخ کے خوف سے یا جنّت کی طمع کے لیئے یا دنیا کو ناقابلِ التفات سمجھکر زہد ہے۔ اور یہ مرتبہ بالکل اخیر میں حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ کمالِ نورِ یقین سے مقامِ شرحِ صدر حاصل ہوجائے۔ اور جس کو مال وجاہ پر قدرت ہی حاصل نہیں اُس کے لیئے زہد کا تصور ہی عبث ہے۔ حضرتِ امامِ عبداللہ بن المبارکؒ کو کسی نے یا زاہد کہکر خطاب کیا تو آپ نے فرمایا کہ زاہد تو عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں کہ دنیا ان کے پاس ذلیل وخوار ہوکر آئی مگر انہوں نے اس کی طرف التفات بھی نہیں فرمایا۔ تم مجھے کس وجہ سے زاہد کہتے ہو۔ اس سے کمالِ زہد مراد ہے۔ ورنہ تو زہد کی حقیقت عدم المیل الی الشئی ہے۔ اور یہ سالک کو امورِ فانیہ سے ہٹ کر احوالِ باقیہ میں مشغول ہوجانے سے حاصل ہوجاتی ہے۔ ہاں اس کا صدق وکذب مال وجاہ کے موجود ہوجانے پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور نہ ہونے پر معاملہ مشتبہ رہتا ہے۔ پھر زہد کے مراتب ودرجات ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ قال الطیبی وفیه دلیل علی انّ الزهد اعلی المقامات وافضلها لانهٗ جعلهٗ سببًا لمحبّة الله وان محبّ الدنیا متعرض لبغض الله سبحانهٗ۔

(۱۳) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰکِنَّ الزَّهَادَةَ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَّا تَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْكَ اَوْثَقَ بِمَا فِیْ یَدَیِ اللّٰهِ وَاَنْ تَکُوْنَ فِیْ ثَوَابِ الْمُصِیْبَةِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِهَا اَرْغَبَ فِیْهَا لَوْ اَنَّهَا اُبْقِیَتْ لَكَ۔

(ترمذی ج۲ ص۵۵ مشکوٰۃ ص۴۵۲)

حضرتِ ابوذرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا آپ نے فرمایا کہ زہد فی الدنیا نہ حلال کو حرام کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور نہ مال کو برباد کرنے سے۔ لیکن زہد فی الدنیا کی حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارے پاس جو کچھ موجود ہے اس پر اس سے زائد بھروسہ نہ ہو جو اللہ کے پاس موجود ہے۔ اور جب تم کو مصیبت پہونچ جائے تو تم کو اس کے ثواب میں اس سے زائد رغبت ہو کہ وہ مصیبت تم کو نہ پہونچتی۔

تشریح اس حدیث میں زہد فی الدنیا کی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے۔ جس کا بیان یہ ہے کہ دنیا سے ترکِ رغبت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حلال کو اپنے اوپر حرام کرلو۔ اور طیبات ولذائذ سے برطرف ہوجاؤ۔ (جیسا کہ جاہل صوفیوں اور بے عمل عاملوں کا طریقہ ہے۔ بلکہ تحریم الحلال کی بعض صورتیں کفر ہیں۔) قال تعالٰی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا

طَيِّبَاتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ٥ (المائدۃ آیت ۸۷)
اور نہ زہد اس کا نام ہے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتِ مال کو برباد کر دو۔ مال ضائع کر کے محتاج بن بیٹھو اور مخلوق کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ بلکہ زہد کا مدار قلب پر ہے۔ زہد و اتقاء کا محل قلب ہے۔ دنیا سے ہاتھوں کو خالی کرنے کی بجائے اس سے قلب کو خالی کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و اعمال وغیرہ ہیں ان پر اتنا اعتماد اور بھروسہ نہ ہو جتنا اس پر اعتماد ہو جو اللہ کے پاس اُس کے خزانوں میں ہے۔ کیونکہ اللہ کے خزانوں کی بقاء یقینی ہے۔ اور تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ یقیناً فانی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔ اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ یقینی اور باقی چیز پر اعتماد کیا جائے۔ اور مشتبہ الوجود اور فانی چیزوں پر بھروسہ نہ رکھا جائے۔ اور زہد یہ ہے کہ تنعم و تلذذ میں اتنا انہماک نہ ہو جائے کہ ثوابِ مصیبت کی طرف التفات نہ ہو۔ اور جو مصیبت آگئی اس کے نہ آنے کو ثواب و اجر کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جاننے لگو۔ بلکہ اجر و ثواب تمہاری نظر میں زیادہ محبوب و مرغوب ہو۔ (اُبْقِيَتْ اى مُنِعَتْ لِاَجْلِكَ وَاُخِّرَتْ عَنْكَ فَوَضَعَ اُبْقِيَتْ مَوْضع لَمْ تُصِبْ۔ فافهم)

گویا یہ دونوں مذکورہ چیزیں دعویٰ زھد فی الدنیا کے ثبوت کے لیئے دو عادل گواہ ہیں۔ ان کی شہادت پر دعویٰ زہد ثابت اور قابلِ تسلیم اور بغیر ان کے دعویٰ محض ناقابلِ التفات ہوگا۔

(۱۴) عَنْ مُجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِيْ فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْعَابِرُ سَبِيْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ فَقَالَ لِي ابْنُ عُمَرَ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ قَبْلَ مَوْتِكَ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِيْ يَا عَبْدَ اللّٰهِ مَا اسْمُكَ غَدًا۔ (ترمذی ص۵۷ ج۲ بخاری ص۹۴۹ مشکوٰۃ ص۴۵۱)

حضرتِ مجاہدؒ حضرتِ ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کے ایک حصہ کو پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ دنیا میں مسافر بلکہ رہگذر کی طرح رہو۔ اور خود کو مُردوں میں شمار کرو۔ پھر حضرت ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا جب تم صبح کر لو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اور جب شام کر لو تو اپنے دل میں صبح کا خیال نہ کرو۔ اور اپنی صحت سے اپنے مرض کے لیئے اور اپنی زندگی سے اپنی موت کے لیئے (توشہ) لے لو۔ اے بندۂ خدا تم نہیں جانتے ہو کہ کل تمہارا نام کیا ہوگا (زندہ یا مُردہ)

تشریح ببعض جسدی میرے جسم کا کوئی ایک حصہ پکڑا۔ بخاری شریف میں ہے بمنکبی میرا کاندھا پکڑا۔ کسی کے کاندھے پر ہاتھ رکھنے یا پکڑنے سے یا ہاتھ وغیرہ پکڑ کر

بات کہنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب پورے طور پر توجہ سے بات سُنے، اور اس کو وہ بات اچھی طرح محفوظ ہو جائے۔ کیونکہ متکلم کو اس بات کا بہت اہتمام ہے۔ پھر اس میں اظہارِ شفقت و محبت بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے آپ نے حضرتِ ابن عمرؓ کا کاندھا پکڑ کر یہ نصیحت فرمائی کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو۔ گویا کہ تم مسافر ہو جس کو اپنے سفر کا اہتمام ہوتا ہے وہ نہ اپنا سر و سامان پھیلاتا ہے نہ تعلقات بڑھاتا ہے۔ بلکہ اس طرح جیو جیسے راستہ پر چلنے والا مسافر کہ اس کو ہر قدم پر منزل تک پہونچ جانے کی فکر اور سفر کی دُھن ہوتی ہے۔ پورے سکون و اطمینان اور آرام کو بھی تلاش نہیں کرتا۔ بلکہ سوچتا ہے کہ منزل پر پہنچکر آرام کرلیں گے۔ اور اطمینان سے منشا کے موافق کھا لیں گے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کی طرف مائل نہو۔ اس کو وطن نہ بناؤ۔ اور حالتِ سفر میں جس طرح زائد تعلقات سے مسافرِ بے وطن کنارہ کش رہتا ہے دُنیا میں اسی طرح رہو۔ کیونکہ دنیا دارِ مُرور (گذرگاہ) اور جسرِ عُبور (پار ہونے کا پل) ہے۔ لہٰذا مسافر کو ہر وقت منزل پر نظر رکھتے ہوئے سر و سامان کو تیار رکھنا اور وطنِ حقیقی کے شوق میں مستعدی سے سفر طے کرنا چاہیے۔ محنتوں اور مشقتوں کو برداشت کرتا رہے۔ لایعنی سے بچتا رہے۔ لمبی امیدوں اور زائد حرص سے پرہیز کرتا رہے۔

اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ میں اَوْ بمعنی بَلْ ہے۔ ای بل کن کانّک مارٌ علٰی طریق قاطع لہا بالسیر واوبلا رفیق (ترقی کرکے فرمایا بلکہ راہگیر کی طرح رہو) کیونکہ مسافر تو کہیں ٹھہر بھی جاتا ہے۔ مگر راستے پر چلنے والے کو اس سے زیادہ فکر و اہتمام اور مشقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اَوْ تنویع کے لئے ہو۔ واللہ اعلم۔

وَعُدَّ بضمّ العین وفتح الدّال المشدّدۃ۔ باب نصر سے امر حاضر کا صیغہ ہے۔ یعنی خود کو شمار کرو اہلِ قبور میں سے۔ کیونکہ آج نہیں تو کل اہلِ قبور میں شامل ہونا ہی ہے۔ اسی سے حضراتِ صوفیہ کا یہ مقولہ ماخوذ ہے کہ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا وَحَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے اس حدیث کو فی اھل القبور تک ذکر کرکے رواہ البخاری فرمایا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ کیونکہ بخاری میں بعض جسدی کی بجائے ہمت کہی ہے۔ اور عابر سبیل پر حدیث ختم ہے۔ احمدؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے وعدّ نفسک من اھل القبور زیادہ نقل کیا ہے۔ اور آگے کا حصہ جو ابن عمرؓ کا قول اِذَا اَصْبَحْتَ سے لِمَوْتِکَ تک ہے وہ امام نوویؒ نے اپنی اربعین میں ذکر فرمایا ہے۔ اور امام غزالیؒ نے اپنی اربعین میں فانّک یا عبد اللہ لا تدری ما اسمک غدًا کا اضافہ ذکر فرمایا ہے۔ اور اذا اصبحت سے لموتک تک کو مرفوع روایت کیا ہے۔ بان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعبد اللہ بن عمرؓ اذا

اصبحت الخ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (مرقاۃ ج۹ ص۲۷) اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نہ صاحب مشکوٰۃ المصابیح کا حوالہ درست ہے نہ صاحب مشکوٰۃ الآثار کا۔

(۱۵) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ لِابْنِ اٰدَمَ حَقٌّ فِي سِوٰى هٰذِهِ الْخِصَالِ بَيْتٌ يَسْكُنُهُ وَثَوْبٌ يُوَارِي عَوْرَتَهُ وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَاءِ۔

(ترمذی ج۲ ص۵۷ مشکوٰۃ ص۴۴۱)

حضرت عثمان بن عفانؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے (انسان) کا حق ان چیزوں کے سوا کچھ نہیں (۱) ایک گھر جس میں وہ رہے (۲) کپڑا جس سے ستر ڈھانک لے (۳) خشک (بغیر سالن کی) روٹی (۴) پانی۔

تشریح بیت بالجر ودوی بالرفع وکذا المعطوفات۔ یسکنہ ای دفعا للحر والبرد۔ جِلْفُ۔ بکسر الجیم وسکون اللام وبفتح الجیم ففی القاموس الجلف بالکسر الغلیظ الیابس من الخبز بغیر ادام او حرف الخبز (بے سالن سوکھی روٹی یا روٹی کا کنارہ) ویروی بکسر الجیم وفتح اللام جمع جلفۃ وھی الکسرۃ من الخبز۔ او الظرف والوعاء (برتن جس میں روٹی رکھی جائے) واراد بالظرف المظروف ای الخبز۔ والاظہر انہ اراد الظرف المظروف واکتفی بذکر احدھما من الآخر لتلازمھما فی الحاجۃ۔ الماء بظاہر مجرور ہے جلف یا الخبز پر عطف ہے۔ اور بعض نے اس کو مرفوع پڑھا ہے علی انہ احد الخصال۔ واللہ المتعال اعلم بحقیقۃ الحال۔

مطلب حدیث کا ظاہر ہے کہ آدمی محتاج ہونے کی وجہ سے ان چاروں چیزوں کا مستحق ہے۔ اور ان سے اس کی حاجت پوری ہو کر زندگی گذر سکتی ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان چاروں چیزوں میں انسان بے حساب ہے۔ اور زائد نعمتوں کا حساب ہوگا۔ والمقصود من الحدیث غایۃ القناعۃ ونہایۃ الکفایۃ۔

(۱۶) عَنْ اَبِي اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ اَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَيْرٌ لَّكَ وَاَنْ تُمْسِكَهُ شَرٌّ لَّكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ وَابْدَاْ بِمَنْ تَعُوْلُ وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى۔

(ترمذی ج۲ ص۵۷ مشکوٰۃ ص۱۶۳)

حضرت ابو امامہؓ نے فرمایا، ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اے آدم کے بیٹے بیشک تیرا ضرورت سے زائد کو خرچ کر دینا تیرے لئے بہتر ہے اور تیرا اس کو روک لینا تیرے لئے برا ہے۔ اور برابر سرابر میں تجھ پر کوئی ملامت نہیں۔ اور ان سے شروع کر جنکی تو کفالت کرتا ہے۔ اور اوپر کا (دینے والا) ہاتھ نیچے کے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

تشریح اَنْ مصدریہ جملہ بتاویل مفرد مبتدا خَیْرٌ لَّکَ خبر۔ اسی طرح اگلا جملہ ہے۔ فضل سے مراد قدرِ حاجت سے زائد ہے۔ فضل سے تعبیر فرمایا گیا، مطلق مال کے خرچ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ سارا مال ضائع کردینا مناسب نہیں۔ حدیث میں ہے کفٰی بالمرء اثمًا ان یضیع من یقوت (آدمی کے گنہگار ہونے کے لیئے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنی روزی برباد کردے) خَیْرٌ لَّکَ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے بہتر ہے۔ دنیا میں تو لوگوں کے قلوب میں محبت اور آخرت میں ثواب کی دولت میسّر ہوگی۔ اسی طرح شَرٌّ لَّکَ کا مطلب عند اللہ وعند الناس ہے۔ ولا تلام علی کفافٍ کفاف وہ روزی جو حاجت پوری کردے اور دوسروں سے سوال کرنے سے روکدے۔ مطلب یہ ہوا کہ حاجت کی مقدار اگر کوئی روکتا ہے تو وہ قابلِ ملامت ولائقِ مذمت نہیں ہے۔

وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ اور اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنْ یَدِ السُّفْلٰی کی پوری تشریح مرآۃ الانوار ج۱ میں نمبر (۴۰) پر "وَاٰتی المال علٰی حُبّہٖ" کے تحت گذر چکی ہے۔

(۱۷) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْكَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيًا مِّنْ ذَهَبٍ لَاَحَبَّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ ثَانِيًا وَ لَا يَمْلَاُ فَاهُ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ۔

(بخاری ۹۵۲ ترمذی ۵۶ ج۲ مشکوٰۃ ۴۵۱ عن ابن عباسؓ)

حضرتِ انس بن مالکؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ابن آدم (انسان) کے لیئے سونے کی ایک وادی (جنگل) ہو تو وہ یہ چاہے گا کہ دوسری بھی ہو۔ اور اس (کی طمع) کا منہ خاکِ (گور) کے سوا کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔ اور اللہ تعالٰی اس کی توبہ قبول فرمالیں گے جو توبہ کرے گا۔

تشریح یہ الفاظ ترمذی شریف کے ہیں۔ بخاری شریف میں یہ روایت ابن عباسؓ سے منقول ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

لَوْ اَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ مِثْلُ وَادٍ مَّالًا لَاَحَبَّ اَنَّ لَهٗ اِلَيْهِ مِثْلَهٗ وَلَا يَمْلَاُ عَيْنَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ الخ

اگر ابن آدم کے لیئے ایک جنگل کی برابر مال ہو تو وہ یہ چاہے گا کہ اس کے اس مال میں اتنا ہی اور اضافہ ہو جائے۔ اور ابن آدم کی آنکھ مٹی ہی پر کر سکتی ہے۔ اور جو توبہ کریگا اللہ تعالٰی اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ قرآن کی آیت تھی جسکی تلاوت منسوخ ہوگئی یا نہیں اور عبد اللہ بن زبیرؓ تو یہ بات منبر پر فرماتے تھے۔ حضرتِ انسؓ و حضرتِ ابی بن کعبؓ سے بھی حضرتِ ابن عباسؓ کے قول کے مثل منقول ہے۔ ان حضرات سے یہ بھی منقول ہے کہ سورۃ تکاثر کے نزول

تک ہم اس کو قرآن کی آیت ہی سمجھتے رہے۔ (مرقاۃ)

بخاری شریف ص ۹۵۲ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے۔ جس میں یہ ہے کہ:

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَىٰ مَنْ تَابَ۔	اگر ابن آدم کے لئے مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ ضرور تیسری تلاش کریگا۔ اور ابن آدم کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ اور جو توبہ کریگا اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول فرمائیں گے۔

مشکوٰۃ شریف ص ۴۴۲ میں اسی روایت کو لیا ہے۔ حدیث کی دوسری کتب میں بھی یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حرص و حبِ مال اور فقر سے خوف انسانی جبلت میں مرکوز ہے۔ انہی سے بخل پیدا ہوتا ہے۔ قال تعالیٰ

قُلْ لَّوْ أَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْ إِذًا لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنْفَاقِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُوْرًا۔ (بنی اسرائیل آیت ۱۰۰)	آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مختار ہوتے تو تم خرچ ہوجانے کے اندیشہ سے ضرور ہاتھ روک لیتے۔ اور آدمی ہے ہی بڑا تنگدل۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ابن آدم کی حرص اور خوفِ فقر اس پرندے سے بھی بڑھے ہوئے ہیں جو سمندر کے ساحل پر پیاسا مرجاتا ہے اور اس اندیشہ سے پانی نہیں پیتا کہ سمندر کا پانی ختم نہ ہوجائے۔ اور اس کیڑے سے بھی جس کی غذا مٹی ہے۔ اور وہ اس لئے نہیں کھاتا کہ زمین کی مٹی ختم نہ ہوجائے۔ اور بھوکا مرجاتا ہے۔ کیونکہ سمندر کا پانی اور زمین کی مٹی کی حیثیت تو اللہ کے خزانوں کے مقابلہ میں پانی کے ایک قطرہ کی برابر بھی نہیں ہے۔ یہ حال اکثر انسانوں کا ہے۔ مگر بعض حضرات ایسے بھی ہیں جن کو حق تعالیٰ قناعت کی دولت سے مالا مال فرما کر اس فطری حرص سے انکی حفاظت فرما لیتے ہیں۔ جس کو وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَىٰ مَنْ تَابَ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور قرآن پاک میں وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ سے اسی کو بیان فرمایا گیا ہے کہ شح کی نسبت و اضافت نفس کی طرف کر کے بتا دیا کہ حرص و بخل پرنفسِ انسانی کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور لفظ يُوْقَ سے بتا دیا گیا کہ اس کا ازالہ ممکن ہے۔ اور وہ صرف توفیقِ خداوندی سے ہوسکتا ہے۔

نکتۂ عجیبہ

حدیث میں لفظ ابن آدم ذکر فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہے۔ اور مٹی کی طبیعت میں قبض و یبس (سختی اور خشکی) ہے۔ اور اس کی ان طبعی چیزوں کا ازالہ بارانِ رحمت سے ہوجاتا ہے کہ بارش سے وہ پُر رونق و گل و گلزار ہوجاتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا (اور جو زمین اچھی ہوتی ہے اس کی پیداوار خدا کے حکم سے بہت نکلتی ہے۔ اور جو خراب ہوتی ہے اُس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے)

اسی طرح اس خاک کے پتلے پر جب حق تعالیٰ کی نظرِ کرم اور نگاہِ رحمت و توفیق متوجہ ہوجاتی ہے تو وہ حرص و بخل کے رذائل سے پاک ہوجاتا ہے۔ اور اخلاقِ حمیدہ و خصائلِ زکیہ و عاداتِ مرضیہ سے پُربہار ہوجاتا ہے۔ اور جس کی سرزمینِ قلب خبیث ہوتی ہے تو توفیق خداوندی اسکی دستگیری نہیں کرتی۔ اس لئے وہ اخلاقِ رذیلہ و عاداتِ خبیثہ میں اور ترا ندختہ ہوکر حرص و بخل اور جمعِ مال میں اپنی بیش بہا زندگی کھپا دیتا ہے۔ وَلَا یَمْلَاُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِیْ وَلَا یَشْبَعُ مَنْ خُلِقَ مِنَ التُّرَابِ اِلَّا بِالتُّرَابِ اس جملہ میں اصل جبلّت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس سے رجوع کو وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ تَابَ سے اِیْ ذٰلِکَ الرُّجُوْعُ لَعَسِیْرٌ وَّلٰکِنْ یَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ یَّسَّرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ ھُوَ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ ھُوَ فَوْقَکُمْ فَاِنَّہٗ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ۔

(ترمذی ۲۷ مشکوٰۃ ۴۴۷)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم اُس پر نظر کرو جو (دنیوی اعتبار سے) تم سے نیچا ہے۔ اور اُس کو نہ دیکھو جو (دنیا میں) تم سے اُونچا ہے۔ کیونکہ یہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ تم اپنے رب کی اُس نعمت کو حقیر نہ سمجھو جو اُس نے تم کو دی ہے۔

تشریح حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (اگر تم شکر کروگے تو میں نعمتوں میں ضرور ترقی دوں گا اور ناشکری کروگے تو میری سزا سخت ہے) شکر نعمتوں کی قدردانی کو کہتے ہیں۔ اور یہ چیز عظمت نعمت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ناشکری تحقیر سے پیدا ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفت شکر کے ساتھ متصف ہونے کی ایک لاجواب ترکیب ارشاد فرمائی کہ اپنے سے اونچے مرتبہ والے کو نہ دیکھو بلکہ خود سے کم مرتبہ والوں پر نظر ڈالو۔ اس سے نعمتوں کی عظمت و قدر اور شکر کی صفت قلب میں پیدا ہوجائے گی۔ اور نعمتوں کی تحقیر سے محفوظ رہوگے جس کے نتیجہ میں دُنیا و آخرت میں حق تعالیٰ کی نعمتیں زیادہ سے زیادہ تم کو حاصل ہوں گی۔ اور اونچے مرتبہ اور نیچے مرتبہ سے مُراد دنیوی مراتب ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

مذکور ہے کہ:

اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلُ مِنْکُمْ. (رواہ البخاری ومسلم مشکوٰۃ ص۴۴۷)

جب تم میں سے کسی کی نظر اس شخص پر پڑ جائے جو مال وخلق میں تم سے افضل ہے تو تم اس کو بھی دیکھ لو جو (مال وجمال میں) تم سے کم مرتبہ کا ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ مال سے مراد دنیوی دولت ہے۔ اور خلق سے مراد صورت، خدم وحشم ہیں۔ اس حدیث میں صاحب نظر کو اعتدال کی تعلیم بھی دی ہے۔ کہ افضل کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوئی اس میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے اسفل پر بھی نظر کرنی چاہیئے۔ تاکہ طبیعت سے عظمت نعمت رخصت ہوکر شکر سے محرومی نہ ہوجائے۔ بالفرض اگر کسی شخص کو من جمیع الوجوہ فضیلت اور بڑائی حاصل ہے تو اس کو البتہ نیچے والوں پر نظر کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ عُجب وغرور اور کبر ونخوت نہ پیدا ہوجائے۔ بلکہ وہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانے اور ان کو اللہ کی جانب سے جانے۔ اس کے بعد کم مرتبہ مخلوق پر نظر ڈالے گا تو شکر کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص ہر طرح سب سے کم مرتبہ ہے تو اس کو اس نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس فانی وناپائیدار بے وفا پُرجفا دنیا سے محفوظ رکھا جس میں محنت ومشقت اور نقصان وخسران ہے۔ اور مجھ کو اسکی چوکیداری سے فارغ رکھکر اپنی عبادت گذاری کا موقع مرحمت فرمایا۔ حضرت شبلی جب کسی دنیا دار کو دیکھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْعُقْبٰی۔

(حکایت ۱) ایک تنگدست فقیر ایک اللہ والے واعظ کی مجلس میں پہنچا اور برملا فقر وفاقہ کی شکایت کی کہ میں نے اتنی مدت سے نہ تنہائی میں کچھ کھایا اور نہ کسی کے سامنے۔ واعظ نے فرمایا دشمن خدا تو جھوٹا ہے۔ حق تعالیٰ اتنی سخت بھوک تو اپنے برگزیدہ بندوں ولیوں اور نبیوں کو عطاء فرماتے ہیں۔ اور وہ حضرات شکایت نہیں کرتے۔ اور تو شکایت کرتا ہے۔ اس لئے تو برگزیدہ بندوں میں سے نہیں ہے۔ تو فاقہ کی دولت تجھ کو کیسے میسّر آسکتی ہے۔ وخلاصة المقال ان المؤمن اذا سلم دینه من الخلل والزوال فلا یبالی بنقصان الجاه والمال وسائر المشقات الکائنة فی الحال والاستقبال. کما روی عن الغزالی مع صاحبه.

(حکایت ۲) کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کے ایک شاگرد نے امام سے ضرب وحبس کی شکایت کی۔ امام نے فرمایا شکر ادا کرو کہ مصیبت اس سے بھی بڑھکر ہوتی ہے۔ پھر اسکو کنوئیں کے اندر جیلخانہ میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے پھر امام سے شکایت کی، امام نے وہی پہلا جواب دیا۔ پھر ایک ایسے یہودی مجرم کو لاکر اس کے ساتھ زنجیر میں باندھ دیا گیا جس کو تھوڑی تھوڑی دیر میں دست ہو رہے تھے۔ اور اس کو اس کے ساتھ تنگ جگہ میں رہنا

اور ہر وقت اس کی بدبو کو سونگھنا پڑتا تھا۔ اس نے پھر امام غزالیؒ سے شکایت کی، امام نے پھر اس کو حسبِ سابق شکر و صبر کی تلقین فرمائی۔ اس نے بے قراری و بے صبری میں جواب دیا کہ اس سے بڑھکر اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے؟ امام غزالیؒ نے جواب دیا کہ اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ تیرے گلے میں کفر و حجاب کا طوق ڈال کر راہِ راست سے ہٹا دیا جائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ (مرقاۃ ۵/۵۲)

دینی اعتبار سے نظر کا اصول

یہ تو معلوم ہوچکا کہ دنیوی اعتبار سے اپنے آپ سے بلند مرتبہ پر نظر نہ ڈالی جائے۔ بلکہ کم مرتبہ لوگوں کو دیکھا جائے لیکن دینی اعتبار سے نظر کا اصول اس کے برعکس ہوگا کہ علم و عمل اور اخلاق و عبادات میں اپنے سے بلند مرتبہ لوگوں پر نگاہ رہے تاکہ ہمت بلند ہو اور ترقی کی راہیں کھلیں۔ اور کم مرتبہ لوگوں کو نہ دیکھیں تاکہ عجب و غرور سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اصولِ نظر کی مکمل تفصیل مذکور ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا۔ مَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاقْتَدٰى بِهٖ وَنَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهَ عَلٰى مَا فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَنَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاَسِفَ عَلٰى مَا فَاتَهٗ مِنْهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللّٰهُ شَاكِرًا وَّلَا صَابِرًا۔

(رواہ الترمذی مشکوۃ ص۴۴۷)

حضرت عمرو بن شعیب اور ان کے باپ دادا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتیں جس میں ہوں گی اللہ تعالیٰ اس کو شاکر وصابر لکھدیں گے جو شخص اپنے دین میں خود سے بلند مرتبہ کو دیکھے اور اس کی اقتداء کرلے۔ اور اپنی دنیا میں اپنے سے کم مرتبہ والے کی طرف دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس (کم مرتبہ والے) پر فضیلت عطا فرمائی تو اللہ تعالیٰ اس کو شاکر وصابر لکھدیں گے۔ اور جس شخص نے اپنے دین میں اپنے سے کم مرتبہ والے کو دیکھا اور اپنی دنیا میں اپنے سے بلند مرتبہ والے کو دیکھا اور اس پر افسوس کیا جو (دنیا کا مال وجاہ) اس کو نہیں ملا تو اللہ تعالیٰ اس کو نہ شاکر لکھیں گے نہ صابر۔

دراصل دُنیا اَسفل ہے دین افضل ہے نظر بھی ہر ایک کے مزاج کے اعتبار سے اس کے مناسب ہوگی۔ دنیا میں اسفل پر نظر، دین میں افضل پر نظر۔ کیونکہ دُنیا و دین کے مزاج کے مناسب یہی ہے۔ اس لئے یہ مفید ہوگی اور اس کے خلاف مضر ہوگی۔ فافہم۔

فَاقْتَدٰى بِهٖ کی قید شاید اس لئے ہے کہ اگر اقتدار نہیں کرتا تو یہ نظر عبث ہے۔ اور اگر

اقتدار بھی نہیں کرتا بلکہ حسد کرتا ہے تو وہ بہت بڑا جرم بھی ہے، اور دنیوی و دینی اعتبار سے تباہ کن بھی ہے۔

(۱۹) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَغْبَطَ اَوْلِیَآئِیْ عِنْدِیْ لَمُؤْمِنٌ خَفِیْفُ الْحَاذِ ذُوْحَظٍّ مِّنَ الصَّلٰوۃِ اَحْسَنَ عِبَادَۃَ رَبِّہٖ وَاَطَاعَہٗ فِی السِّرِّ وَکَانَ غَامِضًا فِی النَّاسِ لَا یُشَارُ اِلَیْہِ بِالْاَصَابِعِ وَکَانَ رِزْقُہٗ کَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰی ذٰلِکَ ثُمَّ نَقَرَ بِیَدِہٖ فَقَالَ عُجِّلَتْ مَنِیَّتُہٗ قَلَّتْ بَوَاکِیْہِ قَلَّ تُرَاثُہٗ۔

(ترمذی ص۲۲ مشکوٰۃ ص۴۴۱)

حضرت ابو امامہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا کہ بیشک میرے دوستوں میں سب سے زائد قابلِ رشک وہ مؤمن ہے جو ہلکی پشت والا (قلیل العیال والمال) ہو، نماز سے اس کو ایک بڑا حصہ ملا ہو، اپنے رب کی عمدہ عبادت کرتا ہو اور دل سے اللہ کی اطاعت کرتا ہو، لوگوں میں گمنام ہو، اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہ کیا جاتا ہو، اور اس کی روزی بس برابر سرابر ہو اور وہ اس پر صبر کرتا ہو، پھر آپ نے اپنے ہاتھ سے چٹکی بجائی اور فرمایا کہ جلدی ہی اس کو موت آگئی ہو، رونے والیاں کم ہوں (اور) میراث بھی کم چھوڑی ہو۔

تشریح لفظ اَغْبَطُ اسم تفضیل بمعنی المغبوط ہے ای احسنہم حالاً وافضلہم مالاً۔ عِنْدِیْ کا مطلب ہے فی دینی ومذہبی۔ الحاذ پشت خفیف الحاذ ہلکی پشت والا، جس کا مطلب ہے قلیل المال وقلیل العیال۔ دنیا کے علائق وعوائق کم ہونے کی وجہ سے عبادتِ خداوندی وخدمتِ دین کا اس کو خوب موقع میسر آسکتا ہے۔

حاصل اِس حدیث کا یہ ہے کہ میرے نزدیک میرے دوستوں میں سب سے زیادہ قابلِ رشک وہ مؤمن ہے جس میں یہ چند صفات موجود ہوں۔

(۱) جس کے پاس دُنیوی علائق (سروسامان، مال ومتاع، بال بچے) کم ہوں (کیونکہ زیادہ بکھیڑوں میں پھنس کر عموماً آدمی نہ دنیا کا رہتا ہے نہ دین کا)

(۲) نماز سے اس کو خاص طور پر ایک بڑا حصہ ملا ہو اُس کو نماز میں راحت ولذّت، حاصل ہوتی ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص نسبت کی علامت ہے۔ آپؐ نے فرمایا قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی انتہائی خوشی نماز میں ہے) اور اَرِحْنَا بِہَا یَا بِلَالُ (اے بلال نماز پڑھوا کر ہمیں راحت پہنچاؤ) پھر نماز سب سے دشوار عبادت ہے۔ جس پر یہ آسان ہوگئی سارا دین اس پر آسان ہوگیا۔

(۳) اَحْسَنَ عِبَادَۃَ رَبِّہٖ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے یعنی نماز کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو

اول علیحدہ بیان فرمایا۔ پھر عام عبادات کا ذکر فرمایا کہ تمام امور میں وہ اللہ کے احکام کو خوشدلی سے مان کر ان پر عمل کرتا ہو۔ اور ہر حال میں وظائف بندگی پر کاربند رہتا ہو۔

(۴) وَاَطَاعَهٗ فِی السِّرِّ۔ ای فی السّرّ والعلانیۃ۔ یعنی خلوت وجلوت اور ظاہر وباطن میں اللہ کا فرمانبردار ہو۔ والعلانیۃ کو یہاں حذف کردیا گیا۔ یہ باب الاکتفاء باحد المتقابلین سے ہے۔ بہرکیف یہ اَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهٖ کی تاکید اور بقول علامہ طیبیؒ اس کی تفسیر ہے۔ یعنی یہ عطف تفسیری ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اطاعہ فی السّرّ کا مطلب یہ ہو کہ وہ اپنی طاعات وعبادات کا اخفاء کرتا ہو۔ اس کا خلق خدا کے سامنے اظہار واعلان نہ کرتا ہو۔ اگلے جملے وَكَانَ غَامِضًا (وہ گمنام رہتا ہو) سے اسی مطلب کی تائید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ فی السّرّ کے معنی فِی الْقَلْبِ ہوں۔ یعنی پورے اخلاص کے ساتھ اطاعت کرتا ہو۔ واللہ اعلم۔

(۵) وَكَانَ غَامِضًا الخ گمنام رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہرت کو پسند نہ کرتا ہو۔ فی الناس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام الناس اُس کو نہیں پہچانتے۔ اس سے کوئی حرج نہیں کہ علماء، صلحاء اور اولیاء اُس کو پہچانتے ہوں۔

(۶) لَا یُشَارُ اِلَیْهِ بِالْاَصَابِعِ یہ بھی کان غامضا کی صفت اور اسی کا تتمہ وتاکید ہے۔ اور اس کو مستقل وصف بھی کہا جاسکتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ علم وعمل، بیان وتقریر وغیرہ میں اس کو ایسی شہرت حاصل نہیں کہ لوگ انگلیوں سے اس کی طرف اشارے کریں۔ یہ مقام بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اس منزل پر عام طور پر عوام الناس کو انگلیوں پر نچا دیتے ہیں۔ اس مرحلہ میں آدمی کے اندر عُجب وکبر وغرور اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ نعوذ باللہ۔

وَكَانَ رِزْقُهٗ كَفَافًا۔ اس کو بقدر کفایت روزی ملی ہو۔ نہ تنگی وپریشانی اور نہ ایسی فراخی وفراوانی کہ حفاظت اور چوکیداری کی اُلجھن ہو۔ قصیر لیکن اس کے ساتھ ہی صبر وقناعت کی دولت بھی ملی ہو۔ اس کے بغیر اس صفت میں کوئی خوبی نہ ہوگی۔

(۷) ثُمَّ نَقَرَ۔ ترمذی میں بالتاء ہے اور مشکوٰۃ میں نَقَدَ بالنُّوْنِ وَالقَافِ وَالدَّالِ الْمَفْتُوحَاتِ ہے ای صَوَّتَ بِاُصْبُعِهٖ ایک انگلی کا پورا دوسری انگلی کے پورے پر رکھ کر رگڑا جس سے آواز ہوئی اُردو میں اس کو چٹکی بجانا کہتے ہیں جو قلت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یعنی آپ نے چٹکی بجاکر فرمایا عُجِّلَتْ مَنِیَّتُهٗ (جلدی کردی گئی ہو اس کی موت) جلدی کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ عمر نہ ہوئی یا زیادہ دنوں بیمار ومعذور نہ رہا۔ چلتے ہاتھوں پیروں چلا گیا ہو۔ یا قلت علائق وشوقِ لقائے مولیٰ میں اُس کی روح ایک دم پرواز کرگئی۔

(۸) بَوَاکِی جمع بَاکِیَۃٌ کی (رونے والی عورتیں) جب زیادہ بکھیڑے نہ تھے تعلقات کم تھے تو رونے

والی عورتیں بھی کم ہی ہوں گی۔

(۹) اور بقدر کفایت روزی ملی تھی تو میراث بھی کم ہونا لازمی ہے۔ نیز آخرت میں حساب کتاب میں بھی ایسے شخص کو کوئی دقت و پریشانی نہ ہوگی۔ ان مذکورہ صفات میں سے ہر صفت بہت عمدہ ہے اور جس میں یہ سب جمع ہوجائیں تو اس کے قابلِ رشک ہونے میں کیا شک ہے۔

(۲۰) عَنْ عَبْدِ اللهِ (ابْنِ مَسْعُوْدٍ) نَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِيْ جَسَدِهٖ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ لَوِ اتَّخَذْنَا لَكَ وِطَاءً فَقَالَ مَالِيْ وَلِلدُّنْيَا مَا اَنَا فِي الدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا۔

(ترمذی ج۲ ص۶۰، مشکوٰۃ ص۴۴۲)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بوریئے پر سوتے پھر آپ بیدار ہوئے تو آپ کے جسمِ اطہر پر بوریئے نے نشان ڈال دیئے تھے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے لئے کوئی نرم بستر تیار کر دیں؟ ارشاد فرمایا میرا دنیا سے کیا تعلق ہے؟ میں تو دنیا میں ایسا ہی ہوں جیسے کوئی مسافر کسی درخت کے نیچے (ٹھہر کر) سایہ لینے لگا ہو پھر اس کو چھوڑ کر چلدے۔

تشریح مَالِيْ وَلِلدُّنْيَا اي لَيْسَ لِيْ اُلْفَةٌ وَمَحَبَّةٌ مَعَ الدُّنْيَا وَلَا لِلدُّنْيَا اُلْفَةٌ وَمَحَبَّةٌ مَعِيْ حَتّٰى اَرْغَبَ اِلَيْهَا۔ اس میں لفظ مَا نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور استفہامیہ برائے انکار بھی ہو سکتا ہے۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا۔ اس ارشاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کمالِ زہد معلوم ہوتا ہے۔ اور تشبیہ کراکب الخ سے دنیا کے جلد فنا ہو جانے اور زندگی چند روزہ ہونے کا بیان بطور تمثیل فرمایا گیا۔ جیسے کوئی سوار دوپہر کے وقت کسی سایہ دار درخت کے نیچے ٹھہر کر آرام کرلے اور پھر کوچ کر جائے۔ مدتِ عمر بھی ایسی ہی قلیل ہے ؎

قَلِيْلٌ عُمْرُنَا فِيْ دَارِ دُنْيَا ⁂ وَمَرْجِعُنَا اِلٰى بَيْتِ التُّرَابِ

(۲۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِي الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ فَاَمَّا الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِي الْاٰخِرَةَ وَهٰذِهِ الدُّنْيَا مُرْتَحِلَةٌ ذَاهِبَةٌ وَهٰذِهِ الْاٰخِرَةُ مُرْتَحِلَةٌ قَادِمَةٌ وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا بَنُوْنَ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تَكُوْنُوْا

حضرت جابرؓ نے فرمایا ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سب سے زائد خوفناک چیز جس سے میں اپنی امت پر ڈرتا ہوں خواہشِ نفس اور امید کی درازی ہے۔ بہرحال خواہشِ نفس تو حق سے روک دیتی ہے اور دراز امید آخرت کو بھلا دیتی ہے۔ اور یہ دنیا کوچ کر رہی ہے جا رہی ہے اور آخرت کوچ کر رہی ہے آ رہی ہے۔ اور دنیا و آخرت دونوں میں سے

مِنْ بَنِي الدُّنْيَا فَافْعَلُوْا فَإِنَّكُمُ الْيَوْمَ فِي دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ وَأَنْتُمْ غَدًا فِي دَارِ الْآخِرَةِ وَلَا عَمَلَ۔
(مشکوٰۃ ۴۴۴)

ہر ایک کے بیٹے ہیں تو اگر تم یہ کر سکو کہ دنیا کے بیٹے نہ بنو تو ایسا کر لو۔ کیونکہ تم آج دار العمل میں ہو (یہاں) حساب نہیں ہے۔ اور تم کل دار آخرت میں ہوگے۔ (وہاں) عمل نہ ہو سکے گا۔

تشریح شہوت، وخواہشِ نفس گمراہی کی بنیاد ہے۔ عموماً گمراہی کا سبب یہی خواہشِ نفس ہوتی ہے۔ اور طولِ امل کی وجہ سے آدمی لیت ولعل یعنی ٹال مٹول کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اور زندگی کی امید پر عمل کو مؤخر کر کے آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ اور دنیا چل چکی ہے۔ اور غیر محسوس رفتار سے منزل فنا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جیسے کشتی اور گاڑی کا بیٹھنے والا اس کی رفتار کو صحیح طور پر محسوس نہیں کرتا، مگر وہ چلتی ہوتی ہے۔ اسی طرح آخرت بھی چل چکی ہے۔ آرہی ہے۔ جانے والی جانے گی اور آنے والی آئے گی۔ یہ غافل کو برباد کر جائے گی۔ اور وہ عامل کو آباد و دلشاد کر دے گی۔۔ اخیر میں فرمایا کہ دونوں کی اولادیں ہیں، دنیا کی بھی آخرت کی بھی۔ تو دنیا کے بیٹے (دنیا دار) نہ بنو تو بہت ہی اچھا ہے یعنی آخرت کے بیٹے (دیندار) بن جاؤ۔ آج اس دنیا میں جو دار العمل ہے تم سے عمل کا مطالبہ ہے۔ اس دنیا میں حساب (اور جزا و سزا) نہیں ہے۔ اور کل حساب کا دن ہوگا وہاں آخرت میں عمل نہ کر سکو گے۔ بنون الدنیا اور بنونِ آخرت کی تفصیل (۸۱) میں آچکی ہے۔

(۲۲) عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ۔
(ترمذی ج ۲ ص ۶۹ مشکوٰۃ ص ۴۵۱)

حضرت شداد بن اوسؓ نے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سمجھدار وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو فرمانبردار بنا لیا اور موت کے بعد (والی زندگی) کے لئے اس نے عمل کیا۔ اور احمق وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو خواہشِ نفس کے پیچھے لگا دے اور اللہ سے امید باندھے۔

تشریح الكَيِّسُ بفتح الكاف وتشديد الياء المكسورة العاقل الحازم المحتاط في الأمور۔ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ أي جعلها مُطِيعَةً لِأَمْرِ اللّٰهِ مُنْقَادَةً لِحُكْمِهِ وَقَضَائِهِ وَقَدَرِهِ وفي النهاية أذلّها واستعبدها وقيل حاسبها أي حاسب أعمالها وأحوالها وأقوالها في الدنيا فإن كانت خيرًا احمد الله تعالى عليها

وَاِنْ کَانَتْ شَرًّا تَابَ مِنْہَا۔ وَعَمِلَ عَمَلاً نَافِعًا۔ والعاجز ای عن استعمال العقل والاحتیاط فی الامور۔ اعلم اَنّ العاجز یستعمل فی مقابلۃ الکیّس و المقابل الحقیقی للکیس البلید لانّ الکیاسۃ تستلزم القدرۃ و الرّائ والتجارب وتمشیۃ الامور و البلادۃ تستلزم العجز فیھا۔

مَنْ اَتْبَعَ باب افعال سے ہے یعنی عاجز وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اس کی خواہش کا تابع بنادیا۔ اور اس کو ترک فرائض وواجبات اور شہوات ولذات میں ڈال کر شبہات ومحرمات کا عادی بنادیا۔ حاصل یہ ہے کہ کیس (مؤمن قوی وعاقل) وہ ہے جو محتاط رہے۔ اور موت کے بعد کام آنے والے اعمال میں مصروف رہے۔ اور اپنے نفس سے محاسبہ کرتا رہے۔ اور عاجز (ضعیف وبلید) وہ شخص ہے جو خواہشات ولذات اور شبہات ومحرمات میں پڑجاتے۔ اور فکر آخرت سے بیگانہ وآزاد رہے۔ وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ یعنی یہ کہتا رہے کہ میرا رب بڑا کریم ہے غفور رحیم ہے۔ حالانکہ وہ قہار وجبّار اور ذوعِقاب الیم بھی ہے۔ قال تعالیٰ نَبِّیٔ عِبَادِیْ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۝ دونوں پہلو سامنے رکھنے ضروری ہیں۔ اللہ جل شانہٗ رحیم ہیں مگر ان کی رحمت نیکوں کے قریب ہے۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ لہٰذا اچھے کام کرکے ہی امیدیں باندھنا درست ہوسکتا ہے۔ قال تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤمنین مہاجرین اور مجاہدین کو اللہ کی رحمت کا امیدوار ہونا درست اور مناسب ہے۔ بہرحال بغیر نیک عمل کیئے اللہ کے رحم وکرم کی امید اور جنت کی تمنّا اسی طرح نامناسب ہے جیسے کوئی بغیر نکاح کیئے ہوئے اولاد کی تمنّا کرتا ہے۔ اور بغیر بوئے فصل کاٹنے کا متمنّی ہے۔ یہاں لفظ رجاء کے بجائے لفظ تمنّا لایا گیا ہے۔ جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا وقوع محال ہے۔ گو ربّ کریم ومتعال کے افضال سے بعید نہیں (کیونکہ توقع اور رجاء کا تعلق صرف ممکنات سے ہوتا ہے۔ اور تمنّا کا تعلق ممکنات و محالات دونوں سے ہوتا ہے) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ عاجز وہ شخص ہے جس پر اس کا نفس غالب ہوگیا۔ اور وہ اپنے نفس سے مغلوب اور اس کا محکوم ہوگیا۔ تو یہ شخص اپنے نفس سے عاجز وبے بس ہوا۔ عاجز کو کیس کے مقابلہ میں لاکر اسی حقیقت پر مطلع فرمایا گیا ہے۔ کہ اپنے نفس پر قابو پانے والا ہی عاقل ہے۔ اور جو اپنے اوپر اپنے نفس کو قابو دیدے وہ بے بس اور سفیہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا	(۲۳) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَاذَرٍّ لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ وَلَا وَرَعَ كَالْكَفِّ وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔

(مشکوٰۃ شریف ص۴۲۹)

کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ابوذر کوئی عقل تدبیر کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اور پرہیزگاری (نفس کو خواہشات سے) باز رکھنے کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اور کوئی شرافت اچھے اخلاق کے مثل نہیں۔

تشریح

قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خطاب خاص میں زیادتِ اہتمام ہے۔ نہ کہ مخاطب کے ساتھ تخصیصِ احکام۔

لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ۔ امام راغبؒ نے کہا العقل يقال للقوة المتهيئة لقبول العلم ويقال للعلم الذى يستفيده الانسان بتلك القوة۔۔۔۔ (یعنی عقل وہ قوت ہے جو قبول علم کیلئے مہیا اور تیار ہے۔ اور اس علم کو بھی عقل کہہ دیتے ہیں جس کو انسان اس قوت مذکورہ سے حاصل کرتا ہے) پہلی قسم (اس قوتِ خاص) کو عقلِ مطبوع کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم (اس قوتِ خاص کے ثمرہ یعنی علم) کو عقلِ مسموع کہتے ہیں۔ ولھٰذا قیل ؎

فان العقل عقلان ؞ مطبوع ومسموع ؞ فلا ينفع مسموع ؞ اذ لم يكن بك مطبوع ؞ كما لا تنفع الشمس ؞ وضوء العين ممنوع (عقل دو قسم کی ہے۔ مطبوع (بصیرت) اور مسموع (علوم) اگر تیرے پاس عقلِ مطبوع نہیں تو مسموع بھی مفید نہیں۔ جیسا کہ سورج کی روشنی بغیر بصارت مفید نہیں اسی طرح علوم کے انوار بغیر بصیرت نافع نہیں ہو سکتے (والی القسم الاول اشار عليه السلام بقوله ما خلق الله خلقا اكرم عليه من العقل والى القسم الثانى اشار بقوله عليه السلام ما كسب احد شيئا افضل من عقل يهديه الى هدى اويرده عن ردى وهٰذا العقل هو المراد بقول رب العباد وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ اس کے بعد یہ سمجھیے کہ عقل کی شرافت و فضیلت صرف اسی لیئے ہے کہ وہ سبب علم ہے۔ اور علم کا نتیجہ عمل ہے۔ اور عمل کا ثمرہ سعادتِ ابدیہ ہے۔ اگر عقل سے علم تک رسائی نہ ہو تو وہ بانجھ ہے۔ اور اگر علم تک رسائی ہوئی مگر علمِ صحیح تک نہ ہوئی تو ایسی عقل نالائق و ناہنجار اولاد کی ماں ہے۔ عقل (ض) کے معنی باندھنے کے ہیں۔ کیونکہ عقل صاحبِ عقل کو نامناسب امور سے باندھتی اور بند کرتی ہے۔ اس لیئے عقل کو عقل کہتے ہیں۔ جیسے عقل کو نُہیہ اسی لیئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے صاحب کو فحشاء و منکر سے منع کرتی ہے۔ (النهية ينهى صاحبه عن الفحشاء والمنكر)

اس تمہید کے بعد اس جملہ مذکورہ کا مطلب سمجھیئے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں عقل سے مراد عقلِ مسموع ہے، اور تدبیر سے مراد عقلِ مطبوع ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عقلِ مسموع (علم محض) عقلِ مطبوع (بصیرتِ انسانی) دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ بلکہ اصل بصیرت ہے۔ جو علم تک پہنچاتی ہے اور علم کو نافع بناتی ہے۔ بے عقل کو علم سکھانا ایسا ہی ہے جیسا کہ سور کے گلے میں ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کا ہار پہنانا، یا نادان بچہ کے ہاتھ میں تلوار، بندوق اور ریوالور دیدینا کہ وہ خودکشی بھی کرسکتا ہے۔ اور اس سے کسی دوسرے کی جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ حضرتِ شیخ سعدیؒ نے تو فرمایا ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل باید"۔

مُلا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ مطبوع (بصیرت) بغیر عقلِ مسموع (علم نبوی) مفید نہیں ہوسکتی۔ بلکہ بعض مرتبہ عقلِ مسموع بغیر عقلِ مطبوع کارآمد و مُفید ہوجاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنی ذاتی رائے اور بصیرت کے بغیر محض تقلیداً ایمان لے آیا تو یہ ایمان بالاجماع مقبول ہے۔ مُلا علی قاریؒ کے قول کے موافق جملہ مذکورہ کا مطلب یہ ہوگا لاعقل کعقل التدبیر (عقل محض اس عقل کی برابر نہیں ہوسکتی جس عقل کے ساتھ تدبیر بھی ہو) تدبیر کے معنی ہیں النظر فی دبر الامر وعاقبتہ لیتمیز المحمود عن المذموم (معاملہ کے انجام اور اس کے نتیجہ میں غور و فکر کرنا تاکہ امرِ محمود و امرِ مذموم میں امتیاز پیدا ہوجائے)۔ ولا شک ان مدارہٗ علی العقل المسموع واللہ اعلم۔

ولا ورع کالکف۔ ورع اور تورع کے معنی ہیں نامناسب کاموں سے رُک جانا، یا ز رہنا اور یکسو ہوجانا۔ مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ لوگوں کو ایذاء پہنچانے سے رُک جانا اور زبان کو لایعنی سے محفوظ رکھنا سب سے بڑی پرہیزگاری ہے۔ کیونکہ جب لفظِ کف مطلق استعمال ہوتا ہے تو کف اللسان اور کف عن اذی الناس ہی ذہن میں آتا ہے۔ گویا کہ فرمایا لاورع کالصمت والکف عن اذی المسلمین۔ مُلا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ورع سے اُس کے اصلی معنی (کف عن المحارم والشبہات) مراد ہیں۔ اور کف سے اس کے عرفی معنی (الکف عن المباحات الغیر الضروریۃ) مراد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ درجہ کا تقویٰ یہی ہے کہ شبہات میں وقوع کے اندیشہ سے مباحاتِ غیر ضروریہ کو بھی ترک کردیا جائے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ محرمات و شبہات اور لوگوں سے معاملات اور امورِ مباحات کا ترک اس سے مراد ہے۔ والحسب عام شامل لجمیع المکارم وحسن الخلق اخص و اشرف جمیع المکارم۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ولا حسب کحسن الخلق۔ یعنی کوئی شرافت و بزرگی اس سے بڑھکر نہیں کہ آدمی کے

اخلاق اچھے ہوں۔ اور حسنِ خلق کا خلاصہ ہے مداراۃ الخلق مع مراعاۃ الحق۔ شریعتِ مطہرہ کے خلاف خلق کی رعایت اور ان کے ساتھ مدارات کا برتاؤ حسنِ خلق سے خارج ہے۔

(۲۴) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ اَلَا اَدُلُّکَ عَلٰی خَصْلَتَیْنِ اَخَفُّ عَلَی الظَّھْرِ وَاَثْقَلُ فِی الْمِیْزَانِ قَالَ قُلْتُ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ طُوْلُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِھِمَا (مشکوٰۃ شریف ص۴۱۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر کیا میں تم کو دو ایسی عادتیں نہ بتا دوں جو پشت پر تو ہلکی پھلکی ہوں اور میزان میں سب (اعمال) سے بھاری ہوں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور بتا دیجئے آپ نے فرمایا زیادہ خاموش رہنا اور حسنِ خلق، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ساری مخلوق نے اِن دونوں کے مثل کوئی عمل نہیں کیا۔

تشریح اخفّ علی الظھر ای ظھر المکلف وبدنہ او علی ظھر اللسان۔ مطلب یہ ہے اس میں زائد مشقت نہیں۔ واثقل فی المیزان فیہ تشبیہ المعقول بالمحسوس کما فی قولہ علیہ السّلام کلمتانِ خفیفتانِ علی اللسانِ حبیبتانِ الی الرحمٰنِ ثقیلتانِ فی المیزانِ۔ الخ طول الصمت۔ زیادہ خاموشی۔ یعنی غیر ضروری کلام سے زبان کو بند رکھنا کما قال علیہ السّلام علیک بطول الصمت فانہ مطردۃ للشیطٰن وعونٌ لک لامر دینک (مشکوٰۃ ص۴۱۵) (زیادہ خاموش رہنے کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ کیونکہ وہ شیطان کے دفع ہونے کا ذریعہ ہے اور تیرے دین کے کام پر مددگار ہے)

مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِھِمَا۔ یعنی جملہ اعمال سے یہ دونوں چیزیں افضل ہیں۔ ان کی برابر کوئی کوئی دوسرا عمل نہیں ہے ؎

سینہا را خامشی گنجینۂ گوہر کند ❊ یاد دارم از صدف ایں نکتہ سربستہ را

(۲۵) عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِضْمَنُوْا لِیْ سِتًّا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَضْمَنْ لَکُمُ الْجَنَّۃَ اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُّمْ وَاَدُّوْا اِذَا ائْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَکُمْ وَغُضُّوْا اَبْصَارَکُمْ وَکُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے کہنے سے تم چھ چیزوں کی ذمہ داری اپنے (نفع کیلئے) قبول کرلو میں تمہارے لیئے جنت کا ضامن ہوجاؤنگا (۱) جب بات کرو سچ بولو (۲) اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو (۳) اور امانت ادا کردو جب تمہارے پاس

(مشکوٰۃ شریف ص۴۱۵)

امانت رکھی جائے (۴) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھو (۵) اور اپنی نگاہوں کو (ناجائز سے) پست رکھو (۶) اور اپنے ہاتھوں کو ظلم سے روکے رکھو۔

تشریح امام حاکم نیشاپوریؒ نے اس حدیث کو صحیح الاسناد فرمایا ہے۔ حدیث میں مندرجہ امور کی تفصیلات اسی کتاب میں گذر چکی ہیں چنداں اب وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اور جامع صغیر میں ہے کہ:

اِضْمَنُوْا لِیْ سِتَّ خِصَالٍ اَضْمَنْ لَکُمُ الْجَنَّۃَ لَا تَظَالِمُوْا عِنْدَ قِسْمَۃِ مَوَارِیْثِکُمْ وَاَنْصِفُوا النَّاسَ مِنْ اَنْفُسِکُمْ وَلَا تَجْبُنُوْا عِنْدَ قِتَالِ عَدُوِّکُمْ وَلَا تَغُلُّوْا غَنَائِمَکُمْ وَامْنَعُوْا ظَالِمَکُمْ مِّنْ مَّظْلُوْمِکُمْ۔

(مرقاۃ المفاتیح ص۶۳۹/۴۲)

میرے کہنے سے تم چھ عادتوں کے ضامن بن جاؤ۔ میں تمہارے لئے جنت کا ضامن بن جاؤنگا (۱) میراثوں کی تقسیم میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو (۲) لوگوں کے ساتھ تم خود انصاف کرو (۳) اپنے دشمن سے جنگ کے وقت بزدل نہ بنو۔ (۴) اور اپنے غنیمت کے مالوں میں خیانت نہ کرو (۵) اور اپنے ظالموں کو اپنے مظلوموں سے روکو۔

مرقاۃ میں یہ پانچ خصال ہی مذکور ہیں چھٹی خصلت کا ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ چھٹی خصلت کُفُّوا ایدیکم و السنتکم ہو۔ واللہ اعلم۔

(۲۶) عَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا النَّجَاۃُ قَالَ اَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ وَلْیَسَعْکَ بَیْتُکَ وَابْکِ عَلٰی خَطِیْئَتِکَ

(ترمذی ص۶۳/۲۲ مشکوٰۃ ص۴۱۳)

حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! نجات کا سبب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اور تمہارا گھر تم کو اپنے اندر سما لے۔ اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔

تشریح اَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ ای اَمْسِکْ لِسَانَکَ حَافِظًا عَلَیْکَ اُمُوْرَکَ۔ و فی النہایۃ ای لاتجرہ الا بما یکون لک لا علیک وھو حاصل المعنی کما لا یخفی۔ حاصل یہ ہے کہ اپنی زبان پر قابو پالو۔ اس سے ایسی کوئی بات سرزد نہو جو تمہارے دین یا تمہاری دنیا کے لئے مضر ہو۔

ولیسعک بکسر اللام ویسکن بَیْتُکَ یعنی تم اپنے گھر کے اندر بیٹھے رہو، اور خلوت میں بیٹھنے میں ملول اور تنگدل نہ ہو۔ بلکہ اس کو اپنے لئے وسیع اور غنیمت سمجھ لو۔ کیونکہ وہ شر و فتنہ سے

چھٹکارہ کا سبب ہے۔ ولذا قیل

هٰذَا زَمَانُ السُّكُوْتِ وَمُلَازَمَةِ الْبُيُوْتِ وَالْقَنَاعَةِ بِالْقُوْتِ اِلٰى اَنْ تَمُوْتَ۔ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ اى ابْكِ وَاِلَّا فَتَبَاكِ نَادِمًا عَلٰى مَعْصِيَتِكَ فِيْمَا سَبَقَ فِىْ اَيَّامِ حَيَاتِكَ۔

(مرقاۃ) (یعنی رو۔ اگر رونا نہ آئے تو بتکلف رو۔ اپنے گناہوں پر نادم و پشیمان ہو کر جو تجھ سے اپنی پچھلی زندگی میں سرزد ہو چکے ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں بُکاء کی ندامت کے معنیٰ میں تضمین کر کے اُس کو علیٰ کے ذریعہ متعدی کیا گیا ہے۔ معنیٰ یہ ہیں کہ:

اِنْدَمْ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ بَاكِيًا۔ (اپنے گناہ پر شرمندہ ہو درانحالیکہ تو رو رہا ہو)

(۲۷) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا بُنَىَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِىَ وَلَيْسَ فِىْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافْعَلْ ثُمَّ قَالَ لِىْ يَا بُنَىَّ وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِىْ وَمَنْ اَحْيٰى سُنَّتِىْ فَقَدْ اَحْيَانِىْ وَمَنْ اَحْيَانِىْ كَانَ مَعِىْ فِى الْجَنَّةِ۔

(ترمذی ص۹۲ ج۲ مشکوٰۃ ص۳۰)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ مجھ سے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اے میرے بیٹوا اگر تم کو اس بات پر قدرت ہو کہ تم صبح اور شام ایسی حالت میں کرو کہ کسی کی طرف سے تمہارے دل میں بالکل کھوٹ نہ ہو تو ایسا کر لو پھر آپؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے میرے بیٹوا یہ میری سنت ہے۔ اور جو شخص میری سنت کو زندہ کریگا تو وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

تشریح مشکوٰۃ شریف ص۳۰ پر یہ روایت بحوالہ ترمذی شریف مذکور ہے۔ مگر اس کا اخیر حصہ اس طرح ہے۔

وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِىْ وَمَنْ اَحَبَّ سُنَّتِىْ فَقَدْ اَحَبَّنِىْ وَمَنْ اَحَبَّنِىْ كَانَ مَعِىْ فِى الْجَنَّةِ۔

اور یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

قال لی ای وحدی او مخاطبًا لی من بین اصحابی۔ یَا بُنَیَّ بضم الباء ابن کی تصغیر برائے لُطف و مرحمت ہے۔ اور معنی یہ ہیں انك عندی بمنزلۃ ولدی فی الشفقۃ۔ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ کسی ایسے بچہ کو جو اپنا ابن نہیں ہے۔ بلکہ شاگرد، خادم یا اور کوئی ہے تو بطور شفقت اس کو ابنی کہنا جائز ہے۔ اِنْ قَدَرْتَ کا مطلب یہ ہے کہ جتنی تم میں اس کی طاقت ہو اتنی اس کام کو کرنے کی کوشش کرو۔ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِىَ کہ تم صبح میں اور شام میں اس طرح

داخل ہو یعنی ہمیشہ شب و روز اس طرح رہو کہ تمہارے دل میں کسی کی طرف سے کھوٹ نہ ہو۔ غش ضد ہے
نصح کی جس کے معنی ہیں منصوح لہ کے لیے خیر کا ارادہ کرنا تو غش کے معنی ہوں گے مغشوش لہ
کے لیے شر کا ارادہ کرنا۔ لِاَحَدٍ یہ لفظ عام ہے مومن و کافر کو یعنی ہر مومن و ہر کافر کے لیے
کہ سب کی خیر خواہی دل میں ہونی چاہئے۔ اور کافر کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو گمراہی سے نکال کر ایمان
کی طرف لانے کی کوشش کرے۔ ہاتھ سے، زبان سے، الغرض قلب سے، دعا سے، مال سے
غرض ہر ترکیب، ہر تدبیر سے اس کی ہدایت کی سعی کرے۔ [illegible]
وَذٰلِكَ اسم اشارہ بعید لاکر اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ کھوٹ سے دل کا خالی ہونا بلند ترین
مرتبہ ہے جس کا حصول آسان نہیں۔ اس کے لئے عظیم مجاہدہ کی ضرورت ہے۔
مَنْ اَحْيٰى سُنَّتِىْ فَقَدْ اَحْيَانِىْ: دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری
وحیات طیبہ کا مقصود مکارم اخلاق و اعمال صالحہ اور پاکیزہ طریقوں کو دنیا میں رواج دینا تھا۔
تو جس نے آپ کے کسی طریقہ اور سنت کو زندہ کر دیا تو درحقیقت یہ آپ کی زندگی ہے جس کو اس نے
دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور سنت کو زندہ کر دینا ایسا بلند ترین اور محبوب عمل ہے۔ کہ اللہ کے
محبوب نے جو کام کیا تھا وہی احیائے سنت کی محنت کرنے والے نے کیا۔ اسی لئے اس کو جنت میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور ہمراہی نصیب ہوگی۔ (معیت سے مراد یہاں معیت
مقاربہ ہے معیت متحدہ نہیں یعنی یہ شخص آپ کے مقربین میں سے ہوگا اور آپ کے درجہ
کو نہیں پہونچیگا۔ کیونکہ آپ کے سوا کے لئے آپ کے درجہ پر رسائی ناممکن ہے)
اور مشکوٰۃ میں جو مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِىْ ہے اس کا مطلب ہے سنت پر عمل کیونکہ سنت سے
محبت کی دلیل اس پر عمل کرنا ہی ہے۔ فَقَدْ اَحَبَّنِىْ ای محبتا کاملا۔ کیونکہ آثار نشانات سے محبت
ذات سے محبت کی علامت ہے۔ كَانَ مَعِىَ فِى الْجَنَّةِ۔ کیونکہ حدیث میں فرمایا گیا المرءُ مع من احبّ
(آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرتا ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔

اور جو اللہ اور رسول کا خوشدلی کے ساتھ کہنا مانیں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (خصوصی) انعام فرمایا یعنی وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور اولیاء کے ساتھ ہوں گے۔

(۲۸) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ يَا ابْنَ اٰدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِىْ اَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى

حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے آدم کے بیٹے (انسان) میری عبادت

وَاَسُدَّ فَقْرَكَ وَاِنْ لَا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَيْكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ۔

(ترمذی ج۲ مشکوٰۃ)

کے لئے فارغ ہوجا میں تیرے سینہ کو غنا سے بھر دوں گا۔ اور تیری تنگدستی کو بند کر دوں گا۔ اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو تیرے دونوں ہاتھوں کو کام سے بھر دونگا اور تیری محتاجی کو دور نہ کروں گا۔

تشریح ترمذی میں مَلَأْتُ يَدَيْكَ ہے۔ اور مشکوٰۃ میں بحوالہ احمد و ابن ماجہ یَدَ لَكَ ہے ندا میں یا انسان وغیرہ کی بجائے ابْنَ آدَمَ فرما کر انسان پر اپنے احسانات و انعامات یاد دلائے ہیں نیز آدم علیہ السلام کی توبہ مشہور ہے۔ اس میں اتباع کی ترغیب بھی دی گئی ہے یعنی اپنے قلب کو اپنے رب کی عبادت کے لئے غیر اللہ سے خالی کر لو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے سارے کاموں کو چھوڑ دو۔ کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو کوئی کام جائز نہ ہوتا، اور تجارت، زراعت، صنعت اور ملازمت وغیرہ کے احکام شریعت میں نہ ہوتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ "دست بکار دل بیار" ہو۔ یعنی ہر کام میں حکم خداوندی کے موافق لگے۔ اور اس کو اسی کے حکم کے مطابق انجام دے تو ہر کام عبادت بن جائے گا۔ اور ظاہر و باطن سب کچھ عبادت ہی میں صرف ہوگا۔ اس طرح پورے طور پر زندگی کا ہر لمحہ عبادتِ خداوندی کے لئے خالی اور فارغ ہوجائیگا۔ اَمْلَأُ صَدْرَكَ غِنًى۔ یعنی میں تیرے سینہ کو ایسے علوم و معارف کی دولتوں سے بھر دونگا۔ کہ پھر حقیر دنیا کی دولتوں کی طرف زائد التفات نہ رہے گا۔ اس طرح غنائے نفس و استغنائے قلب حاصل ہوجائے گا۔ جو اصل غنی ہے۔ "اِنَّمَا الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ"

وَاَسُدَّ فَقْرَكَ۔ اور مخلوق کی احتیاج قلب سے نکل جائے گی۔ اور غنائے نفس و زہد کی برکت سے دنیا جتنی مقدر ہے وہ ذلیل و خوار ہو کر خود اُس کے قدموں میں آجائے گی۔ تو لوگوں کی محتاجی تو دبخود اس کے دل سے ختم ہوجائے گی۔ وَاِنْ لَا تَفْعَلْ۔ یعنی اگر میرے اس حکم کو تو نہ مانے گا اور دنیا سے اعراض کر کے میری عبادت میں مشغول نہ ہوگا تو میں تیرے ہاتھ کو یعنی جوارح (ظاہری اعضاء) کو مشغولیت سے بھر دوں گا (کہ مرتے دم تک فرصت ہی نہ ملے گی)

وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ اور تیری محتاجی دور نہ کروں گا۔ بلکہ جتنی دولت ملے گی اس سے زیادہ کی احتیاج سامنے آجائے گی۔ دوسرے یہ فکر ہمہ وقت سر پر سوار رہے گی۔ کہ مال و دولت کم یا ختم نہ ہوجائے، اور میں محتاج نہ رہ جاؤں۔ دونوں طرح محتاجی نگاہوں کے سامنے آکر مقیم ہوجائے گی۔ اور دمِ آخر تک محتاجی اور محتاجی کا تصور وبالِ جان بن جائے گا۔

(۲۹) عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ۔

(ترمذی ص ۶۲ ج ۲ مشکوٰۃ ص ۴۴۴)

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ غنا سروسامان کی بہتات نہیں ہے۔ بلکہ غناء تو نفس کا غناء ہے۔

تشریح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (ارباب بصیرت واصحاب حقیقت کے نزدیک) سروسامان کی کثرت کا نام غناء نہیں ہے۔ (عَرَض بفتح العین و الرّاء سروسامان، متاع البیت والاَمْوَالِ والنقود وبسکون العین لایتناول النقود) وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ یعنی اصلی اور حقیقی غناء تو یہ ہے کہ آدمی کا نفس مخلوق سے مستغنی ہو جائے۔ اور احتیاجِ خلق دِل سے نکل جائے۔ حاصل یہ ہے کہ غنائے حقیقی عطائے رب پر قناعت کر لینا ہے۔ لہٰذا جس کو قناعت نہیں ملی اور اُس کا دِل جمعِ مال پر حریص رہا تو وہ درحقیقت فقیر و محتاج ہے۔ اگرچہ اُس کے پاس دولتوں کے انبار ہی کیوں نہ ہوں۔ بہرکیف غنائے نفس سے مراد قناعت ہے۔

ومَنْ کَانَ لَهٗ قلبٌ قانعٌ بالقوتِ وراضٍ بعطیّةِ مالِکِ الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ فَهُوَ غَنِیٌّ بقلبِهٖ مستغنٍ عن الغیر بربِّهٖ سواءٌ کان فی یدهٖ مالٌ اَوْلَا وهو فی کل حالٍ لایطلب الزیادةَ علی القوتِ ولا یتعبُ نفسهٗ فی طلب الدّنیا الیٰ ان یموت وفی الحدیث القناعة کنز لایفنٰی۔ وما احسن من قال من ارباب الحال ؎

عزیز النفس من لزم القناعه ؞ ولم یکشف لمخلوق قناعه

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ غنائے نفس سے مراد کمالاتِ علمیہ وعملیہ کا حصول ہے۔ قال ابوالطیب معناہ ؎

ومن ینفق السّاعاتِ فی جمع مالهٖ ؞ مخافةَ فقرٍ فالذی فعل الفقر

لہٰذا مناسب یہی ہے کہ تمام اوقاتِ حیات کو غنائے حقیقی کے حصول میں صرف کیا جائے۔ اور وہ طلبِ کمالات ہے جو غنیٰ بعد الغنیٰ ہے۔ اور طلبِ مال سے کنارہ کش رہے۔ جو فقر بعد فقر کا مصداق ہے۔ وقد قال بعض ارباب الکمال۔

رَضِیْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِیْنَا ؞ لَنَا عِلْمٌ وَّلِلْاَعْدَآءِ مَالٌ

فَاِنَّ الْمَالَ یَفْنٰی عَنْ قَرِیْبٍ ؞ وَاِنَّ الْعِلْمَ یَبْقٰی لَایَزَالُ

اور یہ معلوم ہے کہ مالِ فرعون، قارون اور تمام کفار و فجار کی میراث ہے۔ اور علم انبیاء، اولیاء اور علمائے ابرار کی میراث ہے۔

(مرقاۃ)

(۳۰) عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتِ الْاٰخِرَةُ هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهٗ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهٗ وَلَمْ يَأْتِهٖ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا مَا قُدِّرَ لَهٗ۔

(ترمذی ص۷۲ مشکوٰۃ ص۴۵۴)

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص کا مقصود (اپنی مساعی سے) آخرت ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کا غنا اس کے دل میں پیدا فرمادیں گے۔ اور اس کے بکھرے ہوئے کاموں کو جمع فرمادیں گے اور دنیا ذلیل وخوار ہوکر اس کے پاس آئے گی۔ اور جس کا مقصود دنیا ہوگی تو اللہ تعالیٰ محتاجی کو اس کی نگاہوں کے سامنے کردیں گے اور اسکے مجتمع کاموں کو متفرق کردیں گے اور دنیا اسکو اتنی ہی ملے گی جتنی اس کی قسمت میں ہے۔

تشریح مشکوٰۃ شریف ص۴۵۴ میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الدُّنْيَا جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَشَتَّتَ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ وَلَا يَاْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ۔

جس کی نیت طلب آخرت کی ہوگی اللہ تعالیٰ اس کا غناء اس کے دل میں پیدا فرمادیں گے اور اس کے متفرق کام اس کے لیے جمع فرمادیں گے۔ اور دنیا ذلیل وخوار ہوکر اس کے پاس آئے گی۔ اور جس کی نیت طلب دنیا کی ہوگی اللہ تعالیٰ فقر کو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کردیں گے۔ اور اس کے کام کو اسپر منتشر کردیں گے۔ اور دنیا اس کو اتنی قدر ملے گی جتنی اس کے لیے لکھدی گئی ہے۔

روایات کے الفاظ مختلف ہونے کے باوجود مضمون ایک ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی علمی و عملی مساعی اور دیگر اعمال آخرت یعنی رضائے خداوندی کے لیئے کرے گا تو حق تعالیٰ اس کو دولت قناعت عطاء فرمادیں گے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا کی طلب میں ضرورت سے زیادہ پریشان وسرگرداں نہوگا۔ اور اس کا قلب مطمئن ہوگا۔ دوسرے اس کے کاموں کو بنانے کے لیئے حق تعالیٰ غیب سے اسباب مہیا فرمادیں گے۔ جن سے اس کے کام بسہولت اور باعزت طریقہ پر انجام پذیر ہوتے رہیں گے۔ اور دنیا بقدر قسمت ذلیل وخوار ہوکر اسکے پاس آئے گی۔ اور جو اس دنیا ہی کو مقصود بناکر محنت وکوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ فقر ومحتاجی کو اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا کردیں گے۔ کہ وہ ہمہ وقت محتاجی سے ڈرتا رہیگا۔ اور اس کے کام کو اللہ تعالیٰ منتشر فرمادیں گے۔ اور دنیا اس کے پاس اتنی آئے گی جتنی مقدر ہے۔

مگروہ اس کو ذلیل وخوار کرکے آئے گی۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا لفظ شمل اضداد میں سے ہے۔ متفرق کو بھی کہتے ہیں۔ یقال جمع اللہ شملہ ای ما تشتّت من امرہ اور مجتمع کے معنی میں آتا ہے۔ کما یقال فرّق اللہ شملہ ای ما اجتمع من امرہ۔ اور یہ حدیث تقابل ومطابقت کے قبیل سے ہے چنانچہ جعل اللہ غناہ فی قلبہ کا مقابل جعل اللہ الفقر بین عینیہ ہے اور جمع لہ شملہ کا مقابل فرّق علیہ شملہ ہے۔ اور اتتہ الدنیا وھی راغمۃ کا مقابل ولم یأتہ من الدنیا الا ما قدّر لہ ہے۔ مقابلہ کے قرینہ کی بنا پر وھی راغمۃ کے مقابلہ میں وھو راغم معنی میں ملحوظ ہوگا۔

واللہ اعلم۔

(۲۱) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا وَقَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَلَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَاِنَّ رُوْحَ الْاَمِيْنِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اِسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَاِنَّهٗ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ۔

(مشکوٰۃ ص۴۵۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! کوئی چیز ایسی نہیں جو تم کو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر سکتی ہو مگر میں نے وہ تم کو بتا دی ہے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تم کو دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کر سکتی ہے۔ مگر میں نے تم کو اس سے منع کر دیا ہے۔ اور روح الامین نے اور ایک روایت میں ہے کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک ہرگز مر نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنا (مقدر) رزق پورا نہ کرلے خبردار! تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور طلب رزق میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ اور روزی کی تاخیر تم کو ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس کو اللہ کی نافرمانیوں کے ذریعہ حاصل کرنے لگو اس لئے کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ اس کی فرمانبرداری ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تشریح

لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ میں لفظ مِنْ زائدہ مبالغہ کے لئے ہے۔ ای لیس شیءٌ من الاشیاء اور یقرّبکم دونوں جگہ بتشدید الرّاء باب تفعیل سے ہے۔

روح الامین اور روح القدس (بضم القاف والدّال وبسکون الدّال) دونوں جبرئیل علیہ السلام

کے القاب ہیں۔ قال تعالیٰ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ - وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط نفث (ن) پھونکنا، پھونک مارنا، تھوکنا۔ روع یضم الراء الجلد والنفس والقلب والذہن و العقل۔ نفث فی روعی ای اوحیٰ الیٰ وحیًا۔ نفسًا۔ اَنَّ نَفْسًا بفتح الھمزۃ ویجوز الکسر لان الایحاء فی معنی القول۔ اور نفس سے مراد ذات نفس یعنی مخلوق حی ہے۔ حدیث پاک کا مضمون ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات چھپائی نہیں۔ مفید و مضر، خیر و شر سب کچھ بیان فرما دیا (جتنے اعمال خیر کے تھے اور جنت میں لیجانے والے تھے سب کا حکم فرما دیا اور جتنے اعمال دوزخ میں لیجانے والے تھے ان سب سے منع فرما دیا ہے۔ اب انسانوں کو اختیار ہے جو چاہے جنت اور نجات کی راہ اختیار کرلے یا دوزخ میں جا گرے۔ انسان عام طور پر پیٹ کی خاطر یا اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے غلط راہیں اختیار کرتا ہے۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل امینؑ نے میرے دل میں یہ پیغام خداوندی و وحی ربانی پہنچائی ہے کہ رزق مقدر ہے ہر انسان کو وہ ضرور پہنچکر رہے گا۔ اور اس وقت تک وہ مر نہیں سکتا جبتک کہ وہ اپنے مقدر کا ایک ایک دانہ اور ایک ایک قطرہ نہ لے لے۔ اور جب رزق طے ہو چکا ہے تو انسان کا قلب مطمئن رہنا چاہیئے۔ اور طلب و تدبیر بھی چونکہ ایک فریضہ ہے۔ اس لئے اس فریضہ کی ادائیگی عمدہ طریقہ پر ہونی چاہیئے۔ کہ کسب رزق میں شریعت مطہرہ کی ہدایات کے مطابق عمل کرے۔ اور سرمو بھی قانون شکنی و نافرمانی نہ کرے۔ اور اس کی طاقت تقویٰ سے پیدا ہوگی۔ لہٰذا تم اللہ کی عظمت کا دھیان رکھو۔ اور اس کے جلال وجبروت سے ڈر کر اس کے امر کی مخالفت سے باز رہو۔ اور طلب رزق کا احسن طریقہ اختیار کرو۔ اور اگر رزق میں تنگی و تاخیر پیش آجائے تو صبر و قناعت اختیار کرتے ہوئے رحمت خداوندی کا انتظار کرو۔ کیونکہ اللہ کے خزانوں سے فائدہ اٹھانا ہے تو اس کی اطاعت ہی اس کا ذریعہ ہے۔ نافرمانی کر کے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑے اور طاقتور کے ہاتھ سے تملق اور خوشامد کیذریعہ اس کی رضامندی و مہربانی حاصل کر کے ہی کچھ لیا جا سکتا ہے۔ زبردستی کوئی چیز چھینی نہیں جا سکتی۔ وفی ھٰذا الحدیث دلیل بیّن لاھل السنّۃ ان الحرام کالحلال یسمّی رزقًا وکلّہ من عند اللہ خلافًا للمعتزلۃ فانھم یقولون ان الحرام لیس برزق ولا یخفی بطلانہ

(۳۲) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوست سے محبت کرو اعتدال کے ساتھ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ

مَا وَابْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَا عَسٰى اَنْ يَكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَّا۔
(ترمذی ۲/۲۲)

ایک دن تمہارا دشمن ہوجائے۔ اپنے دشمن سے دشمنی اعتدال کے ساتھ کرو ہوسکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہارا دوست ہوجائے۔

تشریح هَوْنَ نرمی و آہستگی۔ مَا تقلیل کے لیئے ہے۔ ای مقتصدًا بلا افراط مطلب حدیث پاک کا یہ ہے کہ تم حُب و بُغض میں اسراف و افراط سے کام نہ لو۔ بلکہ ایسا اعتدال و میانہ روی اختیار کرو کہ اگر دوستی و محبت ختم ہوجائے تو تم کو ندامت و شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے۔ اور قلب پر ناقابلِ برداشت بار نہ پڑجائے۔ اسی طرح بُغض میں بھی اعتدال رکھو۔ ہوسکتا ہے کہ بُغض محبت سے تبدیل ہوجائے تو دشمنی کے زمانہ میں جو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ اور مقابل کے ساتھ جو ناروا سلوک کیئے تھے اُن پر حسرت و افسوس نہو۔ اور اس سے ہمیشہ شرمندہ نہ ہونا پڑے بہرحال اعتدال ہی میں احتیاط ہے۔

(۳) عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ۔
(ترمذی ۲/۶۲ مشکوٰۃ ۴۴۱)

حضرت کعب بن مالک انصاریؓ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے گلہ میں چھوڑدیئے جائیں وہ اتنی بربادی نہیں کرسکتے جتنی آدمی کی مال و جاہ کی حرص سے اس کے دین کی بربادی ہوجاتی ہے۔

تشریح عن کعب بن مالک عن ابیہ۔ مشکوٰۃ کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ یا تو عن ابن کعب بن مالک عن ابیہ ہوگا یا صرف عن کعب بن مالک بدون عن ابیہ کے ہوگا۔ بہرحال یہ چوک ہے، خواہ کاتب سے ہوئی یا اور کسی سے۔ چنانچہ ترمذی شریف ۲/۶۲ میں عن ابن کعب بن مالک الانصاری عن ابیہ ہے اور وہ صحیح ہے والابن المذکور ھو عبد اللہ کما ھو مصرح فی جامع الاصول۔ بِاَفْسَدَ لَهَا میں تانیثِ ضمیر اس لیئے ہے کہ غنم بمعنی القطعۃ (ریوڑ) ہے۔ یا باعتبار جنس۔ اور لِدِيْنِهٖ اَفْسَدَ کے متعلق ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دو بھوکے بھیڑیوں کو اگر بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ پورے ریوڑ کا ستیاناس کردیں گے۔ لیکن اس سے زیادہ خطرناک اور آدمی کے دین کو برباد کردینے والی دو چیزیں خود انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور وہ دونوں چیزیں حرصِ مال اور حرصِ جاہ ہیں جس انسان کے اندر یہ دو

چیزیں آجاتی ہیں تو یہ اس کے دین کو برباد کر دیتی ہیں۔ بہر حال جس طرح دو ظاہری بھیڑیئے بکریوں کے گلہ کو برباد کر دینے کے لیئے کافی ہیں۔ اسی طرح دو روحانی بھیڑیئے ہیں جو ایمانی و انسانی متاع (دین) کو برباد کر دینے کے لیئے کافی ہیں۔ ایک حرصِ مال؛ دوسرا حرصِ جاہ۔ چونکہ ان دونوں خطرناک رذیلوں کی خطرناکی کو محسوس مفسدوں سے تشبیہ دے کر سمجھایا گیا ہے۔ اسی لیئے ذِئْبَانِ تثنیہ لایا گیا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ فساد کے لئے تو ایک بھیڑیا بھی کافی ہے۔ پھر بظاہر ذئبان سے مؤنث و مذکر کا جوڑا مراد ہے۔ اور بھیڑیئے کی مادہ نر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اسی طرح حرصِ جاہ بھی حرصِ مال سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جب انسان کو مال ملتا ہے تو وہ تنعم و عیاشی میں مبتلا ہو جاتا اور شہوات و لذات میں غرق ہو جاتا ہے۔ پھر اگر کبھی اس کی عیاشی و خواہشات میں مال نہونے کی وجہ سے کمی آتی ہے تو شبہات و محرمات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور کم از کم خیالِ مال میں جو گرفتار ہو جاتا ہے وہ عبادت و ذکرِ خداوندی سے غافل ضرور ہو جاتا ہے۔ جو ہلاکت و بربادی کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔ اور جاہ تو مال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جاہ پر مال قربان کر دیتا ہے۔ مگر شریف آدمی مال پر جاہ کو قربان نہیں کر سکتا۔ جاہ درحقیقت شرکِ خفی اور سب سے بڑا مرض ہے۔ اس سے آدمی ریا و نمود و مداہنت، نفاق اور تمام اخلاقِ ذمیمہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حضرات صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ آخری وہ رذیلہ جو صدیقین کے سر سے خارج ہوتا ہے وہ حبِّ جاہ ہے۔ بلکہ انسان کے بدن سے جان نکلنے کے بعد بھی حبِّ جاہ کا اثر باقی رہتا ہے۔ چنانچہ حضرتِ عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آدمی ریاکار ہوتا ہے۔ اپنی حیات میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فرمایا یحبّ ان یکثر الناس فی جنازتہ (وہ اس بات کو چاہتا ہے کہ لوگ اس کے جنازہ میں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ (تاکہ معلوم ہو کہ ہم بڑے حضرت ہیں) (مرقاۃ جلد ۵ صفحہ ۳)

(۳۴) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ أَسْفَارِهٖ فَقَالَ بَعْضُ أَصْحَابِهٖ أُنْزِلَتْ فِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ لَوْ عَلِمْنَا أَيُّ الْمَالِ خَيْرٌ فَنَتَّخِذَهٗ فَقَالَ أَفْضَلُهٗ لِسَانٌ ذَاكِرٌ وَقَلْبٌ شَاكِرٌ وَزَوْجَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُعِيْنُهٗ عَلٰى إِيْمَانِهٖ۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ جب آیت والذین یکنزون الآیۃ (یعنی جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر دیدیجئے الخ) اُتری تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک سفر میں تھے تو آپ کے بعض صحابہؓ نے دریافت کیا کہ سونے چاندی کے بارے میں تو یہ آیت اُتر گئی کاش ہمیں یہ

(ترمذی ص۱۳۷ ج۲ مشکوٰۃ ص۱۹۸)

معلوم ہوتا کہ کونسا مال اچھا ہے، تو ہم اُس کو جمع کرلیتے آپنے فرمایا کہ بہترین دولت ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور ایسی ایمان والی بیوی ہے جو دین پر اپنے شوہر کی مددگار ہو۔

تشریح سوال کا منشا یہ ہے کہ سونے چاندی جمع کرنے کی مذمت و وعید تو اس آیت سے معلوم ہو گئی تو آپ یہ فرمایئے کہ کونسی دولت ایسی ہے جس کو ہم جمع کرلیں۔ اور اس پر مذمّت و وعید نہ ہو۔ (لَوْ عَلِمْنَا میں لَوْ تمنی کے لیئے ہے) لیکن مال و دولت سے مقصود راحت و سکونِ دل اور نفع ہوتا ہے۔ تو جواب میں آپ نے انہی چیزوں کا ذکر فرمایا جس سے انسان کو دُنیا و آخرت کے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ گو وہ عرفی طور پر مال نہیں ہیں۔ (اسی لئے افضلہ کی ضمیر مال بمعنی نافع کی طرف راجع ہے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب بڑا حکیمانہ جواب ہے۔ جواب میں جن چیزوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک ذکر کرنے والی زبان ہے۔ اولاً لسانِ ذاکر کو اس لیئے ذکر فرمایا کہ زبانی ذکر سے قلب متاثر اور ذکر کے رنگ سے رنگین ہوجاتا ہے۔ پھر ابتداء ذکر کی زبان سے ہوگی۔ اور ذاکر قلب سے اس نعمت کا شکر ادا کرے گا تو یہ نعمت بڑھ کر قلب تک پہونچیگی اسی لیئے اس کے بعد دوسرے نمبر پر قلب شاکر کا ذکر کیا۔ اور جب لسان و قلب ذکر و شکر میں مصروف ہوں گے تو کیفیت انس کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہے۔ جس کی برکت سے حق تعالیٰ ایسی مُونسہ عطا فرمائیں گے جو اس کے ایمان اور دین پر اس کی معین و مددگار ہوگی اسی لیئے تیسرے نمبر پر زوجۃ مؤمنۃ تعینہ علی ایمانہ کا ذکر فرمایا۔ ایمان سے مراد دین ہے۔ اعانت کا مطلب یہ ہے کہ وہ شوہر کو نماز، روزہ اور دیگر عبادات کی تذکیر و ترغیب کرے اور ان کے انتظامات رکھے گی، مثلاً مسواک، پانی، سحری، افطاری وغیرہ۔ اور شبہات و محرمات خصوصاً زنا وغیرہ سے اس کی حفاظت رکھے گی۔ کیونکہ وہ شوہر کی خدمت و اطاعت سے اس کو اپنا ایسا گرویدہ بنائے گی کہ وہ اپنی زوجہ کے علاوہ اور کسی کی طرف التفات نہ کریگا۔ جو اس حدیث میں مذکور ہوا۔ مشائخ سلوک و صوفیائے کرام خصوصاً اصحاب چشت اہلِ بہشت کے یہاں۔ یہی مریدین و سالکین کی تربیت کا طریقہ ہے۔ کہ ذکرِ لسانی سے آغاز ہوتا ہے اور انس کے مقام پر تربیت کی انتہاء ہوجاتی ہے۔ علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں قلب شاکر کو لسانِ ذاکر سے مقدم بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ ترتیب مرادین و مجذوبین کی ہے۔

(۳۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَمْرُ ثَلٰثَةٌ اَمْرٌ بَيِّنٌ رُشْدُهٗ فَاتَّبِعْهُ وَاَمْرٌ بَيِّنٌ غَيُّهٗ فَاجْتَنِبْهُ وَاَمْرٌ اخْتُلِفَ فِيْهِ فَكِلْهُ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔

(مشکوٰۃ شریف ص۱۳)

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمل کی تین قسمیں ہیں۔ ایک عمل تو وہ ہے کہ اس کا ہدایت ہونا کھلا ہوا ہے۔ تو تم اس کو کر لو۔ دوسرا عمل ایسا ہے کہ اس کا گمراہی ہونا ظاہر ہے۔ تو تم اس سے بچ جاؤ تیسرا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں اختلاف ہو رہا ہے تو تم اس کو اللہ کے حوالہ کر دو۔

تشریح اَلْاَمْرُ اس کی جمع اُمور ہے۔ اس کے معنی شان اور حال ہے۔ مراد حال اعمال ہے۔ حدیث کا مطلب ظاہر ہے۔ کہ اعمال کے تین ہی حال ہو سکتے ہیں۔ ایک تو ایسا ہے کہ اس کا ہدایت والا عمل ہونا ظاہر ہے۔ جیسے ارکانِ اسلام، اچھے معاملات، عمدہ اخلاق وغیرہ اور ایک قسم ایسی ہے کہ اس کا گمراہی ہونا متعین ہے۔ جیسے اغیار و کفار کی ان کی خصوصی رسموں اور تہواروں میں شعائرِ کفر میں شرکت و مشابہت اور کفریات و معاصی، زنا، قتلِ نفسِ محترم وغیرہ۔ اور ایک تیسری قسم ایسی ہے کہ اس کو کوئی ہدایت کہتا ہے تو کوئی گمراہی بتاتا ہے۔ بہرحال اس کا عبادت ہونا نہ ہونا مشتبہ ہے۔ تو اول کی پیروی اور اس پر عمل ضرور کرو۔ اور ثانی قسم کو بالکل چھوڑ دو۔ اور تیسری قسم کا کیونکہ حکم معلوم نہیں اس لئے اس کو اللہ کے حوالہ کر کے آرام کرو۔ جیسا کہ آیاتِ متشابہات کا بھی یہی حکم ہے۔ کہ راسخین فی العلم اور مفسرین متقدمین ایسے مقام پر کہدیتے ہیں " واللہ اعلم بمرادہٖ "۔

(۳۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَاظُمَهَا بِاٰبَائِهَا فَالنَّاسُ رَجُلَانِ رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيْمٌ عَلَى اللّٰهِ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيِّنٌ عَلَى اللّٰهِ وَالنَّاسُ بَنُوْ اٰدَمَ وَخَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مِنَ التُّرَابِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن خطبہ دیا پس فرمایا کہ اے انسانو! بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے زمانۂ جاہلیت کے غرور و نخوت اور باپ دادوں پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ اب سارے لوگ دو قسم کے ہیں ایک نیکوکار پرہیزگار آدمی جو اللہ کے نزدیک باعزت ہے۔ اور دوسرا بدکار بدنصیب جو اللہ کے نزدیک ذلیل ہے۔ اور سارے انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو خاک سے پیدا فرمایا ہے (لہٰذا ان کو

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (ترمذی ص ۱۵۹/۲۲)

غرور نہ ہونا چاہیئے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا ہے۔ اور تمہارے کنبے قبیلے اس لئے بنا دیئے ہیں تاکہ تم کو ایک دوسرے کی پہچان رہے۔ اور تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت تمہارا سب سے بڑا متقی ہے بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے پوری خبر رکھنے والے ہیں۔

تشریح

حدیث پاک کے مضمون کی تفصیل "لایسخر قوم من قوم" کے تحت (۴۱۲، ۴۱۳) میں گذر چکی ہے۔ البتہ حدیث کے اخیر میں جو سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ مذکور ہے اس کی تھوڑی سی وضاحت درج ذیل ہے۔

اس آیت پاک میں انسانی مساوات کی ایک جامع تعلیم ہے۔ کہ کوئی انسان کسی دوسرے کو اپنے سے کمتر یا رذیل نہ سمجھے۔ اور اپنے نسب و خاندان یا مال و دولت اور وجاہت وغیرہ کی بنا پر فخر و غرور میں مبتلا نہ ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں تفاخر کے قابل نہیں ہیں۔ پھر تفاخر سے آپس میں منافرت و عداوت کی بنیادیں پڑتی ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آپس میں سب بھائی بھائی ہیں۔ اور خاندانوں، قبیلوں یا مال و دولت کے اعتبار سے جو فرق رکھا گیا ہے وہ تفاخر کے لئے نہیں، بلکہ تعارف اور صلہ رحمی و بر و احسان کی سہولتوں کے لئے ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اسوقت نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی کو اذان کا حکم دیا تھا۔ تو جو قریش مکہ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اُن میں سے ایک نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے میرے والد پہلے ہی مر گئے اُن کو یہ روزِ بد دیکھنا نہیں پڑا۔ اور حارث بن ہشام نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی اور آدمی نہیں ملا جو مسجد حرام میں اذان دیتا۔ ابو سفیان بولے کہ میں کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمانوں کا مالک ان کو خبر دیدے گا۔ چنانچہ جبرئیل امین تشریف لائے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ساری گفتگو کی اطلاع دیدی۔ آپ نے اُن لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کیا ایسا ایسا کہا تھا انہوں نے اقرار کر لیا۔ اسی واقعہ پر اس آیت کا نزول ہوا۔ جس نے بتایا کہ فخر و عزت کی چیز درحقیقت ایمان و تقویٰ ہے۔ جس سے تم لوگ خالی ہو۔ اور حضرت بلال اس سے آراستہ ہیں۔ اس لئے وہ تم سب سے افضل و اشرف ہیں۔ اسی موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا تاکہ سب

لوگ آپ کے عمل کو اچھی طرح دیکھ اور سیکھ لیں) طواف سے فارغ ہوکر آپ نے خطبہ دیا، جو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی مذکورہ روایت میں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ دنیا کے لوگوں کے نزدیک عزت، مال و دولت کا نام ہے۔ اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کا۔

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ۔ شُعُوْبٌ شِعْبٌ کی جمع ہے۔ بہت بڑی جماعت کو شعب کہتے ہیں۔ جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہو۔ شعب قبائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور قبیلہ عمائر پر۔ اور عمارہ بطون پر۔ اور بطن افخاذ پر۔ اور فخذ فصائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ تو سب سے بڑا خاندان شعب ہوا۔ اور سب سے چھوٹا فصیلہ ہوا۔ جیسے خزیمہ شعب ہے۔ کنانہ قبیلہ ہے، قریش عمارہ ہے، قصی بطن ہے۔ ہاشم فخذ ہے۔ اور عباس فصیلہ ہے۔ ابو وراق کہتے ہیں کہ لفظ شعب اور شعوب عجمی قوموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ نہیں۔ اور لفظ قبائل عرب کے لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں۔ اور لفظ اسباط بنی اسرائیل کے لئے بولا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واضح فرما دیا کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ سب انسانوں کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کر کے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ مگر پھر مختلف قبیلوں اور قوموں میں تقسیم بھی باری تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ تعارف اور شناخت آسان ہو جائے۔ مثلاً ایک نام کے دو شخص ہیں تو خاندان کے فرق سے ان میں امتیاز ہو جائے گا۔ پھر اس تقسیم سے دور و قریب کے رشتوں کا علم بھی ہو سکتا ہے۔ اور نسبی قرب و بعد کے اعتبار سے ان کے حقوقِ شرعیہ آسانی سے ادا کئے جا سکتے ہیں۔ عصبات کا قرب و بعد معلوم ہوتا ہے۔ جس کی ضرورت تقسیم میراث میں پیش آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت تعارف کے لئے ہے۔ تفاخر کے لئے اس کو استعمال نہ کرو۔

---

(۳۷) عَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ وَّ الْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْا فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا۔

(مسلم ص۱۱۸ ج۱، مشکوٰۃ ص۳۸)

حضرت ابو مالک اشعریؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پاک ہونا آدھا ایمان ہے۔ اور "الحمد للہ" ترازو کو بھر دیگی۔ اور "سبحان اللہ" اور "الحمد للہ" دونوں آسمانوں اور زمینوں کے درمیان کو بھر دیں گے۔ اور نماز نور ہے اور صدقہ دلیل ہے۔ اور صبر روشنی ہے۔ اور قرآن تیرے لئے دلیل ہے یا تیرے خلاف دلیل ہے۔ سارے لوگ صبح کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو بیچتے ہیں تو اپنے نفس کو آزاد کر دیتے یا اس کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

تشریح اس حدیث پاک میں آٹھ امور مذکور ہیں۔

(۱) الطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ۔ الطُّهُوْرُ بالضم وهو الاصح و الاظهر او بالفتح
امام محی الدین نوویؒ، ابن الانباری اور جمہور اہلِ لغت کا قول ہے کہ الطُّهُوْرُ اور الوُضُوْءُ دونوں لفظ مضموم (بضم الطاء والواو) ہیں تو مصدر ہیں۔ اور مفتوح ہیں تو ان سے ما یتطهر بہ یعنی آلۂ طہارت و وضوء (پانی) مراد ہوگا۔ اور خلیل بن احمدؒ، اصمعیؒ، ابوحاتم سجستانی، ازہری اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ بالفتح مصدر اور اسم ہیں۔ زین العرب کہتے ہیں کہ حدیث میں بضم الطاء ہی جمہور رُواۃ سے مروی ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں کہ بالفتح مصدر ہے القبول کے مثل۔ اور اگر اس کو اسم قرار دیا جائے تو وہ بحذف المضاف ہوگا۔ ای استعمال الطهور۔ واللہ اعلم

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ طہارت کے چار مرتبے ہیں۔ (۱) ظاہر کی طہارت نجاستِ حقیقی (پیشاب پاخانہ وغیرہ) سے اور نجاستِ حکمی (حدثِ اصغر و اکبر) سے۔ (۲) اعضائے جسم کی طہارت جرائم اور گناہوں سے (۳) قلب کی طہارت جملہ معاصی و اخلاقِ ذمیمہ و عقائدِ باطلہ سے۔ (۴) باطن (سر) کی طہارت ماسوی اللہ سے۔

شَطْرُ الْاِیْمَانِ۔ اکثر لفظ شطر بمعنی نصف ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ طُہور نصفِ ایمان ہے۔ حالانکہ بہت سے ایمانی اعمال میں سے ایک عمل نماز ہے۔ اس عملِ نماز کا موقوف علیہ طہور ہے۔ تو طہور کا نصفِ ایمان ہونا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس اشکال کے جوابات بہت سے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً (۱) امام محی الدین نوویؒ فرماتے ہیں کہ طہارت کا ثواب نصفِ ایمان کے ثواب کو پہونچ جاتا ہے۔ (ثواب سے بظاہر اصل ثواب مراد نہیں۔ بلکہ اجرِ مضاعف مُراد ہے۔ واللہ اعلم)

لیکن یہ جواب صحیح نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وضوء خود کوئی عبادت نہیں بلکہ شرائطِ صلوٰۃ میں سے ہے۔ مفتاحِ صلوٰۃ ہونے کی وجہ سے بشرطِ نیت عبادت بنتی ہے۔ اصل عبادت نماز ہے۔ اور خود نماز کا ثواب بھی نصفِ ایمان کے اجر و ثواب کی برابر نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ طہارت اور وضوء کا ثواب نصفِ ایمان کی برابر ہو جائے۔ بلکہ تمام اعمال جن میں اسلام کے ارکانِ اربعہ (صلوٰۃ زکوٰۃ، صوم اور حج) بھی ہیں۔ ان کا ثواب مل کر بھی نصف ایمان کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایمان اصل اور موقوف علیہ ہے۔ اور عمل ایمان کی فرع ہے۔ کیونکہ عمل بلا ایمان درست نہیں اور ایمان بغیر اعمال صحیح ہے۔ اصل و فرع اور اُن کے ثواب مُساوی یا نصف کیسے ہو سکتے ہیں؟

(۲) بعض لوگوں نے جواب دیا ہے کہ ایمان سے پہلے جس طرح کفر ضروری ہے جو نجاستِ باطنی ہے اسی طرح وجوبِ وضوء سے پہلے حدث ضروری ہے۔ جو نجاستِ ظاہری و حکمی ہے۔ تو ایمان و وضوء دونوں کا موقوف علیہ نجاست ہوئی۔ اسلئے وضوء کو شطرِ ایمان کہدیا گیا۔ لیکن یہ

جواب مذہب شوافع پر تو چل سکتا ہے۔ کیونکہ اُن کے یہاں وضوء مستقل عبادت ہے جو بغیر نیت درست نہ ہوگی۔ اور نیت کے لئے اہلیت (ایمان) ضروری ہے۔ اسی لئے ان کے نزدیک کافر کا وضوء معتبر نہیں لیکن احناف کے یہاں وضوء میں نیت شرط نہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک کافر کا وضوء معتبر ہوگا۔ یعنی اگر کوئی کافر وضوء کر کے مسلمان ہوگیا تو احناف کے نزدیک اس وضوء سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ شوافع کے نزدیک نہیں پڑھ سکتا۔

(۳) طہارت شطر ایمان اسوجہ سے ہے۔ کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔ کبائر و صغائر۔ ایمان سے کبائر و صغائر سب معاف ہوجاتے ہیں۔ اور طہور سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں۔ ولابدّ من تقیید ھٰذا الوضوء ایضًا بالنیۃ لیصیر عبادۃ مکفرۃ للسّیّات۔ واللہ اعلم۔

(۴) زین العرب وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہاں ایمان سے مراد صلوٰۃ ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کی آیت وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيْمَانَكُمْ میں ایمان سے مراد نماز ہے۔ اور نماز کو ایمان اس لئے فرمایا گیا کہ آثارِ ایمان میں یہ سب سے بڑا اثر اور اہلِ ایمان کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور اعظم فریضہ ہے۔ بہرحال ایمان سے مراد صلوٰۃ ہے۔ اور طہور کو شطر صلوٰۃ اسلئے قرار دیا گیا ہے۔ کہ صحت صلوٰۃ کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ اور کچھ ارکان ہیں۔ طہور شرائط صلوٰۃ میں سب سے زیادہ قوی و اہم شرط ہے۔ تو گویا یہ خود ہی شرائط کا مجموعہ ہے۔ اس طرح طہور نماز کے ارکان و شرائط کے مجموعہ کا شطر ہوا۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ شطر سے مراد نصف نہیں۔ بلکہ مطلق جزء مُراد ہے۔ کقولہٖ تعالیٰ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اس صورت میں اگر ایمان سے مُراد صلوٰۃ ہے۔ تو کوئی اشکال ہی نہیں۔ اور اگر ایمانِ متعارف مراد لیں تو شطر الایمان ہونے کا مطلب جزء کمال الایمان ہوگا۔

(۶) بعض کہتے ہیں کہ ایمان سے مراد حقیقتِ ایمان ہی ہے۔ اور طہور سے مُراد حدث و خبث سے طہارتِ اعضاء ہے۔ تو گویا طہارت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طہارتِ باطن جو ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسری طہارتِ ظاہر جس کو طہور سے تعبیر فرمایا گیا۔ اس طرح طہورِ اعضاء پوری طہارت کا نصف ہوا۔

(۷) بعض محققین کا کہنا ہے کہ طہور سے مُراد باطن کا تزکیہ ہے عقائد زائغہ و اخلاقِ ذمیمہ سے۔ اور وہ ایمانِ کامل کا نصف ہے۔ کیونکہ اس میں رذائل سے قلب کا تخلیہ اور فضائل سے اسکا تحلیہ ہوگا۔ تو طہور نصفِ اول ہے۔

(۸) لیکن نفسِ ایمان میں بھی اولاً تخلیۂ قلب ہے۔ لا الٰہ کے ذریعہ شرک و کفر سے پھر تحلیہ ہے الّا اللہ کے ذریعہ (توحید و ربوبیت باری کے اثبات کے ساتھ) تو طہور (تخلیہ) کا شطر الایمان

ہونا ظاہر ہے۔ اس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ رہی یہ بات کہ محدثین نے اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں ذکر فرمایا ہے۔ کتاب الایمان میں نہیں ذکر کیا۔ تو یہ اُن کی سمجھ کی بات ہے۔ کہ کتاب الایمان کی حدیث کو کتاب الطہارۃ میں ذکر کر دیا۔ ان کے ذکر سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ اور یہ آخری توجیہ مابعد کے بھی زیادہ مناسب ہے کہ اس توجیہ پر حدیث کے سابقہ اور لاحقہ تمام جملوں میں مناسبت بھی قائم رہتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ (الحمد للہ کا تلفظ یا تصور میزان کو بھر دیتا ہے) تملأ صیغہ تانیث ہے۔ کیونکہ مراد کلمۂ الحمد للہ یا جملۂ الحمد للہ ہے۔ اور بعض روایات میں جو بالتذکیر وارد ہوا ہے تو وہ بتأویل لفظ یا بتأویل کلام ہے۔ یا مضاف "ثواب" محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ الحمد للہ کے ثواب کو اگر مجسم کر لیا جائے تو اعمال تولنے کی ترازو بھر جائے گی۔ اعمال تولنے کی ترازو کیسی ہے؟ اور وزن کی کیا صورت ہوگی۔ اعمال اعراض ہیں ان کو کیسے تولا جائے گا۔ اس کی تفصیل مرآۃ الانوار جزء اوّل "والیوم الآخر" کے تحت ص۴۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ۔ شک راوی ہے تملآن فرمایا یا تملأ فرمایا۔ اوّل تو ظاہر ہے۔ کلمتانِ یا جملتانِ کی طرف ضمیر راجع ہے۔ اور ثانی میں ضمیر کا مرجع الجملۃ الشاملۃ لهما ہے یا بتأویل کلّ واحدۃ منهما ہے۔

(۴) وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ یعنی نماز نور ہے قبر میں، ظلمات حشر میں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صلوٰۃ ایسا نور ہے جو فحشاء و منکر کی تاریکیوں سے نجات دیکر راہِ صواب کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قال تعالیٰ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ جیسا کہ ظاہری نور مضرتوں سے بچا کر منافع کی طرف رہبری کرتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نماز ایسا نور ہے کہ نمازی کی قیامت کے دن رہنمائی کرے گا۔ قال تعالیٰ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ الخ

چوتھا قول صوفیہ کا ہے کہ نماز میں قلب ماسوی اللہ سے فارغ و خالی ہو جاتا ہے۔ تو قلب میں انشراح پیدا ہوتا ہے۔ اقسام و انواع کے معارف اس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اور حقائق کے مکاشفات ہوتے ہیں۔ تو ان تمام چیزوں کے ظہور کا ذریعہ نماز ہوئی۔ اس لئے اس کو نور فرمایا گیا۔ اس لئے کہ نور کی تعریف یہ ہے ظاهر بنفسه مظهر لغيره (خود ظاہر ہو اور دوسری اشیاء کو بھی ظاہر کرے)

پانچواں قول یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز مصلّی کے چہرہ کا نور ہے۔ ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ الصّلوٰۃ سے نماز نہیں بلکہ درود شریف مراد ہو۔

(۵) وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ۔ اس میں صدقہ کی تاکید ہے۔ کہ صدقہ انسان کی اپنی ایسی ضرورت ہے۔

جس کی طرف وہ مجبور ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن جب بندہ سے اس کے مال کے مصرف کے سلسلہ میں سوال ہوگا تو اس کا صدقہ ہی اس کے جواب میں دلیلِ نجات اور برہان عظیم الشان ہوگا۔
دوسرا قول یہ ہے کہ متصدق کو ایسا نشان عطا ہوگا جو اس کی فوز و فلاح اور ایمان و ہدایت پر برھان ہوگا۔ اور مصرفِ مال کے بارے میں سوال کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ صدقہ صدقِ ایمان کی دلیل ہے۔ کیونکہ منافق کو صدقہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس سے صدقہ کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوگئی۔ اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم
(۶) وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ بالیاء المنقلبۃ من الواو لکسرۃ ما قبلھا و روی بالھمزۃ قبل الالف۔
صبر سے مراد اس کی اقسامِ ثلثہ ہیں۔ (۱) شہوات و منکرات سے نفس کا روکنا۔ (۲) عبادات و طاعات پر اس کو جمانا۔ (۳) اور مصائب و مشکلات پر ثابت قدم رہنا۔ اس کی برکت سے آدمی اعلیٰ درجہ کی روشنی سے مالا مال ہوگا۔ ورنہ تو معاصی کی ظلمات میں گرفتار ہو جائے گا۔
بعض شراح نے صبر سے مراد روزہ لیا ہے۔ اور قرینہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ صلوٰۃ اور صدقہ کو ذکر کیا گیا ہے۔ اور ضیاء اس کو قبر میں عطا ہوگی۔ کیونکہ جب دنیا کی وسعتوں میں اس نے شہوات سے صبر کیا اور عبادات و بلایا کی مشقتوں پر ثابت قدم رہا تو حق تعالیٰ اس کے بدلہ میں تنگ مقام (قبر) میں اس کو روشنی و کشادگی سے نوازیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ صبر کی بدولت قلب میں ایسی روشنی عطا فرماتے ہیں کہ طاعات و عبادات کی ساری مشقتیں اس پر سہل فرما دیتے ہیں۔ اور جس کا شعار یہ بن جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا قلب ضیاء سے مالا مال ہوگا۔
یہ بھی یاد رکھیے کہ ضیاء نور سے اقویٰ ہوتی ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ نے آیت هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا میں سورج کی روشنی کو جو زیادہ قوی ہے ضیاء فرمایا اور چاند کی روشنی کو جو ضعیف ہے نور فرمایا ہے۔ اور صبر کو ضیاء اس لئے فرمایا گیا کہ صبر صلوٰۃ کے مقابلہ میں وسیع ترین اور ہمہ گیر چیز ہے۔ جو روزہ نماز، ارکانِ اسلام و دیگر طاعات کو عام ہے۔ اور صلوٰۃ صبر کا ایک فرد ہے۔ اور جملہ طاعات و اجتناب عن السیئات اور مصائب و مشکلات میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔
ہاں جن لوگوں نے صبر سے مراد صوم لیا ہے ان پر البتہ اشکال ہوگا کہ روزہ کو ضیاء قرار دینا اور صلوٰۃ کو نور سے تعبیر کرنا بظاہر خلاف قیاس ہے۔ اس شبہ کا...... حل یہ ہے کہ یہاں فضیلت کی حیثیت سے روزہ کو ضیاء قرار نہیں دیا گیا۔ فضیلت تو روزہ کے مقابلہ میں نماز ہی کو حاصل ہے۔ بلکہ روزہ دن کی عبادت ہے، اور سورج کی روشنی بھی ضیاء ہے۔ اس مناسبت سے اس کو ضیاء قرار دیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات کی تو رائے یہ ہے کہ صوم صلوٰۃ سے افضل ہے۔ اور اس

روایت سے بھی وہ استدلال کرتے ہیں کہ نماز کو نور اور روزہ کو ضیاء فرمایا گیا ہے۔ دوسری عقلی وجہ یہ ہے کہ روزہ دار ربِّ صمد کی صمدیت کا مظہر ہے۔ اور صلوٰۃ میں تذلل و تواضع ہے جو صفات عبد میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ صفتِ رب صفتِ عبد سے افضل و اعلیٰ ہوگی۔ اسی لئے روزہ نماز سے افضل و اعلیٰ ہے۔ ولقولہٖ علیہ السّلام الصّومُ لی وانا اجزی بہٖ۔ اور ایسا کوئی ارشاد نماز کے بارے میں نہیں۔ یہ بعض علمائے امت کی رائے ہے لیکن جمہور علمائے امت کے نزدیک تمام فرائض میں نماز ہی سب سے افضل ہے۔

(۷) وَالقُرآنُ الخ قرآن مقدس تمہارے لئے حجت و دلیل ہے۔ اگر اس کے حقوق کی ادائیگی کی گئی۔ ورنہ تو یہ قرآن مقدس تمہارے خلاف حجت ہوگا۔ اگر اس کے حقوق میں کوتاہی کی گئی یا اس کے حقوق سے بالکل اعراض کر لیا گیا اور قرآن کے جملہ حقوق کا خلاصہ چار چیزوں میں ہے۔

(۱) اس کی تصدیق (۲) اس کی صحیح تلاوت (۳) اس پر عمل (۴) اس کی تبلیغ۔

(۸) کُلُّ النّاسِ یَغدُوا الخ غدو (ن) السّیر فی اول النھار ضدّ الرّواح۔ مطلب یہ ہے کہ سارے انسان صبح بیدار ہو کر دنیا میں جدوجہد اور محنت کرتے ہیں فَبَائِعٌ نَفسَہٗ یعنی اپنے نفس کا حظ اور کسب عمل دے کر ہر شخص اس کا عوض اور بدلہ پاتا ہے۔ اگر کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو اس کے ثمن میں اجر و ثواب پاتا ہے (فَمُعتِقُھَا) اور اس کو عذاب نار و قہر خداوندی سے آزاد کر لیتا ہے۔ (اس میں فاء سببیت کے لئے ہے۔ اور یہ مبتدا کی خبر ثانی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فبائع، نفسہٗ سے بدل البعض ہو) اور اگر برا عمل کرتا ہے تو اس کا بدلہ پاتا ہے (اَوْمُوبِقُھَا) اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

یاد رکھیئے کہ بیع و شراء دونوں ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہاں صرف تبادلہ کے معنی میں ہیں۔ یعنی ایک حالت کو ترک کر کے دوسری حالت حاصل کر لینا مراد ہے۔ جیسا کہ بائع اپنے ہاتھ کی چیز دے کر وہ چیز لے لیتا ہے جو مشتری کے پاس ہے ای فمن صرف نفسہٗ واشترا خرتہٗ علیٰ دُنیاہ وَاشتریٰ نفسہٗ بالاٰخرۃ فقد اعتقھا من عذاب الیم۔ ومن اشتر الدّنیا علی الاٰخرۃ واشتراھا بھا فقد اوبق نفسہٗ ای اھلکھا بان جعلھا عرضۃً لعذاب عظیم۔ اور اگر اصل معنی کا لحاظ رکھا جائے تو یہاں بائع سے مراد مشتری ہے۔ کیونکہ اعتاق کا حق اسی کو ہوتا ہے۔ (فافہم) حاصل یہ ہے کہ جو دنیا ترک کر دے گا اور آخرت کو اختیار کرے گا تو وہ اپنے نفس کو دنیا کے بدلہ میں اپنے رب سے خرید لے گا اور اس کو آزاد کر دے گا۔ اور جو آخرت کو ترک کر کے دنیا کو اختیار کرے گا تو وہ اپنے نفس کو خرید کر دوزخ میں ڈال کر ہلاک کر دے گا۔ وقال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللہَ اشتریٰ

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ. وقال تعالیٰ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ. الخ

(۳۸) عَنْ أَبِيْ ذَرٍّؓ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَوْصِنِيْ قَالَ أُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَإِنَّهُ أَزْيَنُ لِأَمْرِكَ كُلِّهِ قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ عَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَإِنَّهُ ذِكْرٌ لَّكَ فِي السَّمَاءِ وَنُوْرٌ لَّكَ فِي الْأَرْضِ قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ عَلَيْكَ بِطُوْلِ الصَّمْتِ فَإِنَّهُ مَطْرَدَةٌ لِّلشَّيْطٰنِ وَعَوْنٌ لَّكَ فِيْ أَمْرِ دِيْنِكَ قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ وَإِيَّاكَ وَكَثْرَةَ الضِّحْكِ فَإِنَّهُ يُمِيْتُ الْقَلْبَ وَيَذْهَبُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ قُلِ الْحَقَّ وَإِنْ كَانَ مُرًّا قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ لَا تَخَفْ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ قُلْتُ زِدْنِيْ قَالَ لِيَحْجُزْكَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُ مِنْ نَّفْسِكَ۔

(مشکوٰۃ شریف ص۴۱۵)

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ مجھ کو وصیت فرمائیے آپؐ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ تمہارے سارے کاموں کے لئے بہترین زینت ہے۔ میں نے عرض کیا مجھ کو اور وصیت فرمائیے آپنے فرمایا کہ تم تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کو لازم پکڑ لو۔ کیونکہ وہ تمہارے لئے آسمان میں ذکر کا باعث ہوگا۔ اور زمین میں تمہارے لئے نور ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو اور زیادہ کیجئے۔ فرمایا زیادہ خاموش رہا کرو اسلئے کہ یہ شیطان کو دفع کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور تمہارے دین میں تمہارا مددگار ہے۔ میں نے عرض کیا مجھ کو اور زیادہ فرمائیے۔ فرمایا زیادہ ہنسنے سے احتیاط رکھو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ اور تمہارے چہرہ کے نور کو زائل کردے گا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو اور وصیت فرمائیے۔ آپنے فرمایا کہ حق بات کہدو خواہ وہ تلخ ہی کیوں نہو۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو اور زیادہ وصیت کیجئے۔ فرمایا کہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت کا اندیشہ نہ کرو۔ میں نے عرض کیا مجھ کو اور زیادہ کیجئے۔ فرمایا کہ تم کو لوگوں (کی عیب جوئی) سے وہ (عیب) روک دے جس کو تم اپنے آپ میں جانتے ہو۔

تشریح

(۱) أُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ اور یہ وصیت دیگر آنے والی وصیتوں کی طرح اوّلین و آخرین سب کے لئے ہے۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ نے آیت وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ میں تقویٰ کی وصیت سب کو فرمائی ہے أَزْيَنُ ای غایة من الزین ونهاية من الحسن (انتہائی زینت اور بہترین حُسن) لِأَمْرِكَ امر سے مراد اُمورِ دینیہ (اعتقادی، قولی اور عملی) اور امورِ دُنیویہ (معاش و معاشرت، اخلاق اور مساعی معاد) سب ہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ زینت کی نسبت تقویٰ کی طرف

اسی طرح کی گئی جس طرح وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ میں لباس کی نسبت تقوٰی کی طرف کی گئی ہے جس طرح آسمان ستاروں کی زینت سے مزین ہے۔ اسی طرح عارفین کے قلوب معارف وتقوٰی کی زینت سے مزین ہیں۔ قال تعالیٰ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۔ تقوٰی کی تفصیلات مرآۃ ج ۲ "مِنْهَا التَّعَاوُنُ بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" کے تحت گذر چکی ہیں۔

(۲) قُلْتُ زِدْنِيْ ای فی الوصیۃ بالعمل الصالح عَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ تلاوت قرآن تقوٰی کی بنیاد اور درجات عالیہ کی ضامن ہے۔ حدیث سابق میں اس کی وضاحت بھی گذر گئی ہے۔ وَذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ یہ بطور تعمیم وتتمیم فرمایا گیا۔ گو تلاوت قرآن بھی اس کا اہم فرد ہے۔ قال علیہ السلام افضل الذکر تلاوۃ القرآن۔ فَاِنَّهٗ ضمیر مذکور کی طرف راجع ہے۔ ای ما ذکر من التلاوۃ والذکر۔

ذِكْرٌ لَّكَ فِي السَّمَاءِ وَنُوْرٌ لَّكَ فِي الْاَرْضِ۔ یعنی تلاوت وذکر دونوں تمہارے لئے آسمانوں میں ذکر وشہرت اور زمین میں نور ہوں گے۔ اور ممکن ہے کہ بطور لف ونشر مرتب ذکر فی السماء کا سبب تلاوت اور نورٌ فی الارض کا سبب ذکر اللہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ تلاوت اور عام ذکر میں بھی اتنا ہی فرق ہے جتنا آسمان وزمین میں ہے۔ کیونکہ افضل الذکر تلاوت قرآن کو قرار دیا گیا ہے۔ گو اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی وارد ہے۔ مگر فضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقہ کے حکم ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔ والکلمۃ الطیبۃ التوحیدیۃ ایضا من کلام اللہ تعالیٰ۔ فافہم۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ فَاِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع اقرب یعنی ذکر اللہ عز وجل کو قرار دیا جائے۔ اور تلاوت کا مرتبہ اس سے خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔ کیونکہ تلاوت ذکر ہونے کے ساتھ باری تعالیٰ کے ساتھ مناجات ومکالمہ بھی ہے۔

(۳) طُوْلُ الصَّمْتِ ای دوامہ مَطْرَدَةٌ لِّلشَّيْطَانِ۔ شیطان سے مراد سارے شیاطین کا سردار ابلیس لعین ہے۔ اور جب طول صمت سے بڑا شیطان دفع ہوجاتا ہے تو اس کے چیلے (چھوٹے شیاطین) تو بدرجۂ اولیٰ دفع ہوجائیں گے۔ چنانچہ بعض نسخوں میں بصیغۂ جمع لِلشَّيَاطِيْنِ بھی ہے۔ وَعَوْنٌ لَّكَ ای مُعِيْنٌ لَّكَ۔

(۴) وَاِيَّاكَ وَكَثْرَةَ الضِّحْكِ یہ چوتھی وصیت ہے۔ اس کی وضاحت اسی الاربعین کی حدیث نمبر (۳) میں گذر چکی ہے۔

(۵) قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ كَانَ مُرًّا (حق بات کہدو اگرچہ وہ کڑوی یعنی گراں ہو) اور حق اپنے خلاف ہو یا کسی دوسرے کے خلاف۔ اسی طرح اس کا کہنا خود اپنے نفس پر گراں ہو یا اہل باطل اور

نفس پرستوں پر بہرصورت حق گوئی سے باز نہ رہو۔

(۶) لَاتَخَفْ فِی اللّٰہِ ای فی حق اللہ وطریق عبادتہٖ۔ لَوْمَةَ لَائِمٍ یعنی کسی کی مذمت وملامت کی پرواہ کیے بغیر اللہ کے مکمل طور پر فرمانبردار بن جاؤ۔ عاشقوں کا شیوہ یہی ہوتا ہے۔ محب ہی ڈرا گیا تو ڈرنا کیا، یہ صرف حق تعالیٰ کے عاشق کی شان ہونی چاہئیے۔ اور دنیوی ونفسانی محبت مجث ہے سہ

جس کو دنیا عشق کہتی ہے نسیم ❖ وہ بلاشک ہے خرابیٔ دماغ

نہ عشق است آنکہ بر مردم بود ❖ این فساد خوردن گندم بود

بہرحال تعلق مع الحق مع الانقطاع عن الخلق ہی کمالِ انسانیت وحقیقتِ ولایت ہے۔ اسی کو قرآنِ پاک میں تبتل سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ "لَاتَخَفْ الخ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دین میں متصلب اور سخت ہو جاؤ۔ جب تم کسی منکر کا انکار کرو یا کسی معروف کا امر کرو تو اس میں تمہارا حال یہ ہو کہ گرم تپائی ہوئی میخ ٹھونک رہے ہو کسی کا کہنا سننا یا اعتراض کرنا تم کو ہرگز مرعوب نہ کر دے"۔ علامہ طیبی کا فرمان سر آنکھوں پر لیکن یہ تو اس سے پہلے جملہ قل الحق وان کان مُرًّا ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بھی یہی معنی لیے جائیں تو یہ سابق کی تائید وتاکید ہو جائے گی اور نیا فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ اس لیے پہلے ہی معنی زیادہ اچھے ہیں۔ لانّ التاسیس خیرٌ من التاکید۔ نسیم احمد غازی غفرلہٗ

(۷) لِیَحْجُزْكَ بکسر اللام یَحْجُزُ بروزن یَنْصُرُ منع کرنا۔ روکنا۔ (چاہیئے کہ تم کو روک دے لوگوں کی عیب جوئی سے اپنے عیوب پر نظر کرنا) کما ورد عن انسؓ طوبیٰ لمن شغله عیبُهٗ عن عیوب النّاس۔ اخرجه الدّیلمی۔ قال میرک شاہ حدیث المتن رواہ احمد والطّبرانی وابن حبّان والحاکم واللفظ لهٗ وقال صحیح الاسناد۔

جامع صغیر میں ہے کہ عبد بن حمیدؒ نے اپنی تفسیر میں اور طبرانی نے کبیر میں ابوذرؓ سے مرفوعاً حدیث بیان کی ہے (اور وہ اس حدیث مذکور سے زائد وصیتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ حدیث مذکور بھی طویل حدیث کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں حدیث ابوذرؓ کے شروع میں ہے۔ فذکر الحدیث بطوله الیٰ ان قال قلت یارسول اللہ اوصنی۔ مگر ہم زائد وصیتوں کی وجہ سے جامع صغیر والی حدیثِ ابوذرؓ کو یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا کہ:

أُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَاِنَّهٗ رَأْسُ الْاَمْرِ كُلِّهٖ عَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ وَذِكْرِ اللّٰهِ فَاِنَّهٗ ذِكْرٌ لَّكَ فِی السَّمَآءِ وَنُوْرٌ لَّكَ فِیْ	(۱) میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اسلیئے کہ وہ تمام امور (دنیوی واُخروی) کا سر ہے۔ (۲) تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ کو اپنے اوپر لازم کر لو۔

الارض علیک بطول الصمت الا من خیر فانہ مطردۃ للشیطان عنک وعون لک علی امر دینک ایاک وکثرۃ الضحک فانہ یمیت القلب ویذھب بنور الوجہ وعلیک بالجھاد فانہ رھبانیۃ امتی احب المساکین وجالسھم انظر الی من تحتک ولا تنظر الی من فوقک فانہ اجدر ان لا تزدری نعمۃ اللہ عندک، صل قرابتک وان قطعوک، قل الحق وان کان مرا، لا تخف فی اللہ لومۃ لائم، لیحجزک عن الناس ما تعلم من نفسک ولا تجد علیھم فیما تاتی، وکفی بالمرء عیبا ان یکون فیہ ثلث خصال ان یعرف من الناس ما یجھل من نفسہ ویستحی لھم مما ھو فیہ ویؤذی جلیسہ یا ابا ذر لا عقل کالتدبیر ولا ورع کالکف ولا حسب کحسن الخلق۔

(مرقاۃ ج ۹ ص ۱۶۸)

کیونکہ وہ آسمان میں تمہاری شہرت اور زمین میں تمہارے لیے نور (کا سبب ہے) (۳) اچھی بات کے سوا اپنے اوپر خاموشی لازم کرلو۔ کیونکہ یہ تم سے شیطان کو دفع کرنے کا ذریعہ اور تمہارے دینی کاموں پر تمہاری مددگار ہوگی (۴) اور زیادہ نہ ہنسا کرو۔ کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مُردہ بنا دیتا ہے۔ اور چہرہ کے نور کو زائل کردیتا ہے (۵) اور جہاد ضرور کرتے رہو کہ میری امت کا ترکِ دنیا یہی عمل ہے (۶) محتاجوں سے محبت رکھو اور اُنکے پاس بیٹھا کرو۔ (۷) دنیوی اعتبار سے ان پر نظر کرو جو تم سے کم درجہ کے لوگ ہیں۔ اپنے اوپر والوں کو نہ دیکھو کہ اس سے تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری پیدا ہوجائے گی۔ (۸) رشتہ ناطہ کو ملائے رکھو اگرچہ رشتہ دار تم سے رشتہ توڑلیں۔ (۹) حق بات کہدو اگرچہ وہ تلخ ہو (۱۰) اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہ کرو (۱۱) تمہارا اپنے عیبوں کو جاننا تم کو دوسروں (کی عیب جوئی) سے روکدے (۱۲) اور جو (بُرا) کام تم خود کرتے ہو اوروں پر اس میں غصہ نہ کرو (۱۳) آدمی کے عیب دار ہونے کے لیئے یہ کافی ہے کہ اس میں تین عادتیں موجود ہوں۔ لوگوں سے وہ پہچاننا چاہے جس سے خود غافل ونابلد ہے۔ اور اوروں کے لیئے اس عمل سے شرم کرے۔ (یا لوگوں کو شرم دِلائے) جس میں خود مبتلا ہے۔ اور اپنے ہمنشین کو ایذا پہنچائے۔ اے ابوذر عقل تدبیر کے مثل نہیں ہوسکتی۔ اور کوئی پرہیزگاری محرمات سے بچنے کے مثل نہیں ہوسکتی۔ اور کوئی شرافت وعزت اچھے اخلاق کے مثل نہیں ہوسکتی۔

(۳۹) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خاف ادلج ومن ادلج بلغ المنزل الا ان سلعۃ اللہ غالیۃ الا ان سلعۃ اللہ الجنۃ۔

(ترمذی ج ۲ ص ۷۸ مشکوٰۃ ص ۴۵۶)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص اندیشہ رکھتا ہے وہ شروع رات میں سفر کرتا ہے۔ اور جو شخص اول شب میں چلے گا وہ منزل کو پہنچ جائے گا۔ یاد رکھو اللہ کا سرسامان گراں ہے خبردار! اللہ کا (گراں) سامان جنت ہے۔

تشریح علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مثل ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سالک آخرت کے لیئے بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ شیطان اپنی تمام فریب کاریوں اور نفس اپنی ناجائز خواہشات اور بے جا تمناؤں کے لشکروں سمیت سالک کی راہ میں اس کو لوٹنے کے لیئے بیٹھے ہیں۔ اس لیئے اگر سالک بیداری و بیدار مغزی سے اپنے سفر میں چلے گا۔ اور اپنے عمل میں اخلاصِ نیت کا پورا اہتمام کرے گا تو شیطان کے حملوں اور نفس کے فریبوں سے مامون و محفوظ رہے گا۔ پھر سفرِ آخرت کی راہیں بڑی دشوار گذار ہیں۔ معمولی مجاہدوں سے وہ راہیں طے نہ ہو پائیں گی۔ قال اللہ تعالیٰ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا ۝ (جو آخرت کو اپنا مقصد بنا کر محنت کریگا بشرطیکہ آخرت کی شان کے مطابق اس کی محنت ہو اور وہ مؤمن ہو تو اس کی محنت کی قدر کی جائے گی۔ یعنی وہ کامیاب ہوگا۔ اور آخرت کی فلاح و فوز اس کو نصیب ہو جائے گی۔)

قاعدہ ہے کہ معمولی مقصد کے لیئے معمولی محنت کافی ہوتی ہے۔ اور کسی غیر معمولی مقصد اور گراں ترین چیز کے لیئے زبردست محنت و کوشش درکار ہوتی ہے۔ تو مطلوب اس مسافر کا جنت ہے۔ اس لیئے فرمایا الا ان الخ کہ متاعِ خداوندی گراں ہے۔ اور جانتے ہو وہ متاعِ خداوندی جس کے تم خریدار ہو گیا ہے؟ وہ جنت ہے۔ لہٰذا اس کی شان کے مطابق اہتمام و سعی درکار ہوگی۔ قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس شرط پر خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) معلوم ہوا کہ جان اور مال دونوں دے کر جنت لی جا سکتی ہے ؎

دل لگی ہنسی نہیں اے دوست ✤ مال و جان کا سوال ہوتا ہے

حدیث پاک سے اشارۃً معلوم ہوا کہ جنت کا سفر راتوں میں آسان ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ صالحین نے اور علمائے حق نے صلاح و علم کی بلندیاں راتوں کو بیدار رہ کر ہی حاصل کی ہیں۔ شاید سفر معراج رات میں کرانے کے اندر یہ راز بھی ہو۔ یُقَالُ مَنْ خَافَ فَوْتَ الْمَطْلُوْبِ سَھِرَ فِیْ طَلَبِ الْمَحْبُوْبِ ؎

بِقَدْرِ الْکَدِّ تُکْتَسَبُ الْمَعَالِیْ ✤ وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَھِرَ اللَّیَالِیْ

(۴۰) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ کَلِمَۃً (وفی روایۃٍ اٰیۃً) لَوْ اَخَذَ النَّاسُ کُلُّھُمْ لَکَفَتْھُمْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیَّۃُ اٰیَۃٍ

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک بات (اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آیت) ایسی جانتا ہوں کہ اگر سارے انسان اسپر عمل کریں تو وہ سب کو کافی ہو جائے

قَالَ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔

(قَالَ المؤلف) هٰذَا تَمَامُ الْاَرْبَعِيْنَ مِنْ اَحَادِيْثِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ صَبَاحَ يَوْمِ الْجُمُعَةِ السَّادِسِ مِنَ الْجُمَادَى الْاُخْرٰى سنہ ۱۳۹۱ھ۔

(سورۃ الطلاق آیت ۲)

صحابہؓ نے عرض کیا وہ کونسی آیت ہے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا وہ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ہے (یعنی جو اللہ سے ڈریگا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیئے (ہر مصیبت سے) نکلنے کی راہ پیدا فرمادیں گے۔

(مؤلف نے فرمایا) یہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس حدیثیں مکمل ہوگئیں۔ اللہ پروردگار عالم کا شکر ہے۔ جمعہ کے دن کی صبح ۶ جمادی الاخری سنہ ۱۳۹۱ھ میں۔

تشریح

مشکوٰۃ میں اس آیت کے بعد وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ بھی ہے۔ حدیث کا مطلب ظاہر ہے۔ کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا حق تعالیٰ اس کو دو انعام عطا فرمائیں گے۔ (۱) ہر مشکل و مصیبت سے نکلنے کا اس کو راستہ عطا فرمائیں گے۔ خواہ وہ دنیا کی مصائب و مشکلات ہوں یا آخرت کی۔ (۲) اور رزق کا مسئلہ بھی آسان ہوجائے گا۔ کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائیں گے کہ اس کا وہم و خیال بھی وہاں نہ پہونچے گا کہ مجھ کو اس مقام سے رزق ملیگا۔ اور رزق سے مراد صرف کھانا نہیں بلکہ تمام ضروریات ہیں۔ پھر ان میں بھی عموم ہے وہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی۔ کیونکہ آیت شریفہ میں کوئی قید نہیں ہے۔ تقویٰ میں پورا دین آجاتا ہے۔ اور ان دونوں انعامات میں دارین کی مکمل فلاح و بہبود۔ تقویٰ کی پوری تفصیل مرآۃ الانوار ج ۲ میں منہا التعاون بالبر والتقویٰ کے تحت گذر چکی ہے۔ آیت مذکورہ کا اخیر حصہ ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ (اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیئے کافی ہیں اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کرکے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں ایک حصہ ذکر کردیا ہے۔ اور مراد قَدْرًا تک پوری آیت ہے۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ سے لَا يَحْتَسِبُ تک تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن امور سے وہ ڈرتا ہے۔ اور امور دنیا و آخرت میں جن چیزوں سے وہ اندیشہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ان سب میں کافی ہیں۔ اور وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ الخ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کے مقاصد میں حق تعالیٰ کفایت و کفالت فرمائیں گے یعنی ان کو وہ پورا کریں گے۔ بَالِغُ اَمْرِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ جو چاہیں گے وہ ہوکر رہے گا۔ اس آیت سے توکل و تفویض کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ اور توکل کی

تفصیلات مرآۃ الانوار ج۲ میں "التوکل" کے تحت گذر چکی ہیں۔

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے لڑکے سالم کو دشمن گرفتار کر کے لے گئے۔ اس کی ماں سخت پریشان ہے۔ میں کیا کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اور تمہارے لڑکے کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت کے ساتھ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا کرو۔ ان دونوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اور وہ کثرت سے یہ کلمہ پڑھنے لگے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جو لوگ لڑکے کو گرفتار کر کے لے گئے تھے وہ کسی دن ذرا اس سے غافل ہوئے تو لڑکا کسی طرح ان کی قید سے نکل بھاگا۔ اور ان کی بکریاں ہنکا کر اپنے ساتھ لیکر اپنے والد کے پاس پہونچ گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان لوگوں کا ایک اونٹ لڑکے کو مل گیا۔ اسپر وہ سوار ہوا اور دوسرے اونٹوں کو ساتھ لگایا اور سب کو لے کر اپنے والد کے پاس پہونچ گیا۔ اس کے والد یہ خبر لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال بھی کیا کہ یہ اونٹ اور بکریاں جو میرا لڑکا ساتھ لے آیا ہے ہمارے لیئے حلال ہیں یا نہیں؟ اس واقعہ پر یہ آیت وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ الخ نازل ہوئی۔ بعض دوسری روایات میں ہے کہ جب عوف بن مالک اشجعیؓ اور ان کی بیوی کو لڑکے کی جدائی نے زیادہ پریشان کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اور اس میں کچھ بُعد نہیں۔ کہ تقویٰ کا بھی حکم دیا ہو اور بکثرت لاحول ولاقوۃ الخ پڑھنے کا حکم بھی دیا ہو۔ (یہ سب روایات روح المعانی میں ابن مردویہ سے من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ منقول ہیں)

یہ آیت اگرچہ طلاق سے تعلق رکھنے والے مرد وعورت سے متعلق ہے۔ مگر شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ مفہوم اس کا عام ہے۔ اور سب کے لیئے شامل ہے۔

مصائب سے نجات اور مقاصد کے حصول کا مجرب نسخہ

حدیث مذکور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف ابن مالک اشجعیؓ کو مصیبت سے نجات اور حصول مقصد کے لیئے بکثرت لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ دینی و دنیوی ہر قسم کی مشکلات و مصائب سے بچنے کے لیئے اور تمام منافع و مقاصد کے حصول کے لیئے اس کلمہ شریفہ کی کثرت بہت مجرب ہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ نے اس کی کثرت کی مقدار یہ بتائی ہے کہ روزانہ پانچسو مرتبہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اور سو سو بار اوّل و آخر درود شریف پڑھکر اپنے مقصد کے لیئے دعا کریں۔ (کیونکہ

اس کلمہ میں تفویض وتوکل اور تقویٰ کی حقیقت موجود ہے۔ اور متوکل ومتقی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کو دنیوی واخروی مصائب ومشکلات سے نجات کا راستہ عطا فرمائیں گے۔ اور اس کی ضروریات کی کفایت وکفالت فرمائیں گے) روح المعانی میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ (وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ الآیۃ) کی بار بار تلاوت فرمائی۔ یہانتک کہ مجھے نیند آنے لگی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا، اے ابوذر! اگر سارے انسان اس آیت کو (اپنے عمل میں) لے لیں تو یہ سب کے لیے (دونوں جہان کے تمام مقاصد میں) کافی ہوجائے۔

وَھٰھُنَا تَمَّ بِفَضْلِ اللّٰہِ الْمُبِیْنِ شَرْحُ الْاَرْبَعِیْنَ مِنْ اَحَادِیْثِ سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اَلْحَقَھَا الْمُؤَلِّفُ اٰخِرَ کِتَابِہٖ مِشْکٰوۃِ الْاٰثَارِ تَتِمَّۃً لَّہٗ. فَکَذٰلِکَ جَعَلْتُ شَرْحَھَا فِیْ اٰخِرِ مِرْاٰۃِ الْاَنْوَارِ شَرْحِ مِشْکٰوۃِ الْاٰثَارِ تَکْمِلَۃً لَّہٗ. فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ وَوَفَّقَنَا لِخِدْمَۃِ کِتَابِہِ الْعَظِیْمِ وَحَدِیْثِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ. اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْہُ مِنَّا کَمَا وَفَّقْتَنَا وَاعْفُ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَزَلَّاتِنَا وَاخْتِمْ لَنَا بِالْحُسْنٰی وَبَلِّغْنَا الْمَقَامَ الْاَسْنٰی مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۝ سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

العبد

نسیم احمد الغازی المظاہری البجنوری خادم حدیث النبوی

بدار العلوم ببلدۃ مرادآباد (الہند)

وَقَعَ الْفَرَاغُ مِنْ تَسْوِیْدِ ھٰذِہِ الْاَوْرَاقِ فِیْ ۲۶ ذِی الْحَجَّۃِ الْمُکَرَّمَۃِ سنہ ۱۴۱۰ھ

الْمُطَابِقُ ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء

بَعْدَ صَلٰوۃِ الْجُمُعَۃِ الْمُبَارَکَۃِ۔

فہرست مضامین مرآۃ الانوار شرح اردو مشکوٰۃ الآثار جزء ثالث

فہرست مضامین اربعون من جوامع الکلم